کاروانِ زندگی

حصہ دوم

[سرگزشتِ حیات (آپ بیتی) کا دوسرا حصّہ، جس میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۳ء کے آخر تک کے اہم واقعاتِ زندگی، مصروفیات و اسفار، ذاتی زندگی نیز ملک و بیرون ملک میں پیش آنے والے اہم حوادث و تغیرات، ذہن و قلب پر ان کے اثرات، اور فکر و تحریر میں ان کے انعکاسات کی تصویر پیش کی گئی ہے، اور ملّت کے ایک دردمند وحقیقت پسند فرد کی حیثیت سے ان واقعات کا بے لاگ جائزہ بھی لیا گیا ہے، اور کتاب وسنت، اقوام وملل کی تاریخ، اور اسباب ونتائج کے باہمی ربط کی روشنی میں ان کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔]

• ایک تاریخی دستاویز • ادبی مُرقّع • دعوتِ فکر وعمل

از: مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

ناشر

مکتبۂ اسلام

۱۷۲/۵۴ محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ (یو۔پی)

www.abulhasanalinadwi.org

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

بار سوم

صفر المظفر ۱۴۲۶ھ ——— اپریل ۲۰۰۵ء

کتابت ——————— ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ——————— کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ

قیمت ——————— -/90روپے

ناشر

مکتبۂ اسلام

۱۷۲/۵۴ محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ (یو۔پی)

www.abulhasanalinadwi.org

فہرست عناوین

"کاروانِ زندگی حصۂ دوم"

پیش لفظ	۹-۱۴
باب اوّل - بعض اہم تصنیفی و تحقیقی کام	۱۵-۴۳
اپنے مستقر پر	۱۵
"الأرکان الأربعة" کی تالیف	۱۶
"نزهة الخواطر" جلد ششم و "جنة المشرق"	۲۱
مخلصین کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا معاملہ	۳۰
"الصراع بین الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية" (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش)	۳۲
"الطريق إلى المدينة" ("کاروانِ مدینہ")	۳۵
"نحو التربية الاسلامية الحرة" (اسلامی ممالک کے لئے آزاد اسلامی نظامِ تعلیم)	۳۸
"حیات عبدالحیؒ"	۴۲
باب دوم - چند اہم واقعات و حوادث	۴۴-۶۳
ایک سنگین حادثہ اور اس سے بال بال بچنا	۴۴
والدہ صاحبہؒ کی وفات	۴۷
ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفےٰ کی کوشش اور اس کی نامنظوری اور دار العلوم میں اسٹرائک	۵۰
حیدر آباد کا ایک سفر	۵۲
ایک یادگار سفرِ حجاز	۵۵

www.abulhasanalinadwi.org

انگلستان کا تیسرا سفر	۵۶
لکھنؤ کے تبلیغی مرکز سے نقلِ سکونت	۶۰
باب سوم ۔ قومیتِ عربیہ اور اشتراکیت کے علمبردار صدر ناصر کی مخالفت	۶۴ ۔ ۸۳
۵ جون ۱۹۶۷ء کا المیہ اور زندگی کا ایک نیا رخ	۶۴
مصر کی نئی قیادت، عربوں میں اس کی مقبولیت اور اس کے اسباب	۶۵
میری مخالفت کے اسباب	۶۸
عالمِ عربی اور اس کے واقعات و حالات سے میری غیر معمولی وابستگی	۷۱
حجاز و کویت کی تقریریں	۷۴
ایک اہم انٹرویو	۷۷
مستقبل عربوں ہی کا ہے	۸۱
باب چہارم ۔ ہندوستان کے ملی و ملکی مسائل سے دلچسپی اور میدانی جدوجہد	۸۴ ۔ ۱۰۸
ایک تضاد اور اس کا حل	۸۴
ایک اہم انٹرویو	۸۷
ریاست میسور کا اہم دورہ	۹۱
وفد کا استقبال اور جوش و خروش	۹۲
سلطان شہید کے مدفن پر	۹۳
خلوت در انجمن	۹۴
حکومتوں کا انقلاب، اور جاہ و اقبال کی بے ثباتی	۹۵
گلبرگہ کی تقریر، دوام و استقبال کی ضمانت اور عوام کا عدم احتساب اقتدار کے لئے مضر	۹۶
ایک اہم مکتوب	۹۸
مجلس مشاورت کا دورِ انتشار و اختلاف	۱۰۵
باب پنجم ۔ تحریک پیامِ انسانیت، اس کے محرکات و مقاصد	۱۰۹ ۔ ۱۲۷
تحریک کا ذہنی و واقعاتی پس منظر	۱۰۹

تحریک کا آغاز وارتقاء	۱۱۶
باب ششم۔ تین سال کے چند اہم واقعات	**۱۲۸-۱۴۳**
پاکستان وہندوستان کی جنگ	۱۲۸
مشرقی پاکستان میں لسانی اور تہذیبی تعصب کا طوفان	۱۳۰
مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام	۱۳۶
آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن دہلی کا افتتاح	۱۳۹
"کلیت پسندی" کا خطرناک رجحان	۱۴۰
باب ہفتم۔ مشرق وسطی کے چھ مسلم ممالک کا دورہ، اور خلیج عربی کے سفر	**۱۴۴-۱۷۰**
دورہ کے لئے ملکوں کا انتخاب	۱۴۴
افغانستان وایران سے دلچسپی	۱۴۵
"دریائے کابل سے دریائے یرموک تک"	۱۴۶
انقلابات سے پہلے	۱۴۸
افغانستان کا ماضی وحال	۱۴۹
ملاقاتیں اور دید وشنید	۱۵۲
سکندر اسلام محمود غزنوی کے دار الحکومت میں	۱۵۲
ایران میں	۱۵۳
ذات نبوی اور سیرت نبوی سے تعلق ثانوی درجہ میں	۱۵۵
دعوت وتبلیغ کی راہ میں سب سے بڑی چٹان	۱۵۷
مشرق ومغرب کے سنگم لبنان میں	۱۵۹
اندیشے اور خطرات	۱۶۰
دو دن دمشق میں	۱۶۰
خواب یا حقیقت؟	۱۶۱
ہارون رشید کے پایۂ تخت بغداد میں	۱۶۲

www.abulhasanalinadwi.org

قرآن کی مشکل کشائی	۱۶۴
شہیدوں اور پاسبانوں کی زمین اردن میں	۱۶۵
زندگی کا پُراثر منظر	۱۶۷
جنگ موتہ کے شہداء کے مزار پر	۱۶۷
خلیج کا ایک سفر	۱۶۸
باب ہشتم:- ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی	۱۷۱ -- ۲۰۰
ندوۃ العلماء کے ایک عالمی اجلاس کا خیال	۱۷۱
تحریک کا آغاز	۱۷۴
چند آزمائشی مرحلے	۱۷۷
حقیقی تیاریاں اور انتظامات	۱۸۳
مہمانوں کی آمد	۱۸۵
اجلاس	۱۸۵
خطبۂ استقبالیہ	۱۸۷
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں	۱۹۲
نماز فجر کے بعد کی دعوتی تقریریں	۱۹۴
ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا انتقال	۱۹۶
باب نہم:- ایمرجنسی کے زمانہ میں شریمتی اندرا گاندھی (وزیر اعظم ہند) سے ملاقات اور ایک تاریخی خط اور بعض اہم واقعات	۲۰۱ -- ۲۳۱
ایمرجنسی کے نفاذ کا پس منظر	۲۰۱
ایمرجنسی کا نفاذ	۲۰۵
مصنف کی اندرا جی سے ملاقات اور کھلا خط	۲۰۹
اندرا جی سے ملاقات اور خط	۲۱۱
ایمرجنسی کا خاتمہ اور اس سے اخذ کردہ چند نتائج	۲۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

۱۹۷۷ء کا جنرل الیکشن، اس کے نتائج اور اندراجی کی ہماری قیام گاہ پر آمد	۲۲۶
جنتا گورنمنٹ اور اس کا خاتمہ	۲۲۸
جنتا پارٹی کے چند رہنماؤں سے میری ایک دلچسپ گفتگو	۲۲۹
باب دہم ۱۰۔ مغرب اقصیٰ (مراکش) اور نئی دنیا (امریکا) کے سفر	**۲۳۲۔۲۵۲**
جدہ سے رباط	۲۳۲
امریکہ کا سفر	۲۳۸
ایم، ایس، اے کی کانفرنس میں	۲۴۰
شمالی امریکہ اور کینیڈا کا دورہ اور اس کی تقریریں	۲۴۱
آنکھ کے آپریشن کے بارے میں تردد اور بالآخر فیصلہ	۲۴۷
کامیاب آپریشن	۲۴۸
شکاگو میں	۲۵۰
مراجعت وطن	۲۵۱
باب یازدہم ۱۱۔ پاکستان کا سفر اور دو اہم حادثے	**۲۵۳ - ۲۷۴**
رابطہ کی ایشیائی کانفرنس اور پاکستان کا سفر	۲۵۳
عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات	۲۵۸
خطابات و مجالس	۲۵۹
اہم ملاقاتیں اور ذیلی سفر	۲۶۶
ایک سخت خاندانی حادثہ اور امتحان	۲۷۱
دوسرا حادثہ	۲۷۳
باب دوازدہم ۱۲۔ سعودی سربراہ مملکت اور ذمہ داروں کے نام ایک اہم تحریری یادداشت، حرم شریف کا ناشدنی واقعہ، قطر کی سیرت کانفرنس، فیصل ایوارڈ	**۲۷۵ - ۲۹۹**
ایک اہم تحریری یادداشت	۲۷۵
ایک سوئے اتفاق	۲۸۳
حرم کا ناشدنی واقعہ	۲۸۴
قطر کی سیرت کانفرنس	۲۸۷

www.abulhasanalinadwi.org

عرب و عجم پر بعثتِ محمدی کے احسانات	۲۸۹
فیصل ایوارڈ	۲۹۳
ایاز قدر خود را بشناس	۲۹۷

باب سیزدہم ۱۳ ۔ دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس، مراد آباد کا المیہ، پیام انسانیت کنونشن لکھنؤ ۔ ۳۰۰ - ۳۲۷

دار العلوم دیوبند کا اجلاس صد سالہ	۳۰۰
اجلاس صد سالہ کے بعد	۳۱۲
مراد آباد کا المیہ	۳۱۵
مسلم مجلس مشاورت کے عاملہ کا اجلاس اور مراد آباد کا دورہ	۳۱۹
پیام انسانیت کنونشن لکھنؤ	۳۲۳

باب چہاردہم ۱۴ ۔ مذاکرۂ ادبیات اسلامی، ایک علمی اعزاز، خطبات کشمیر، خاندانی حادثہ، دار المصنفین اور الجزائر کے سیمینار ۳۲۸ - ۳۵۷

مذاکرۂ ادبیات اسلامی ندوۃ العلماء	۳۲۸
حدیث پر ایک اہم مقالہ	۳۳۳
ایک علمی اعزاز	۳۳۵
اہم خاندانی حادثہ	۳۴۵
دار المصنفین کا "اسلام و مستشرقین" پر سیمینار	۳۴۸
الجزائر کا سیمینار	۳۵۲

باب پنجدہم ۱۵ ۔ سری لنکا کا سفر، حیدر آباد کے خطبات، بیروت کے المیہ و جہادِ افغانستان کے بارے میں بیان، آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کا افتتاح، اور مقالہ "اسلام و مغرب" ۳۵۸ - ۳۸۹

سری لنکا کا سفر	۳۵۸
بیروت اور افغانستان کے بارے میں قلبی احساسات و جذبات کا اظہار	۳۶۴
خطبات حیدر آباد	۳۶۸
آکسفورڈ یونیورسٹی کا اسلامک سنٹر اور مقالہ "اسلام اور مغرب"	۳۷۴
امارات و کویت کا سفر	۳۸۱
اشاریہ ۔ (مرتبہ از محمد غیاث الدین ندوی)	۳۹۱

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم

"کاروانِ زندگی" کی دوسری جلد ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔
پہلی جلد ۱۹۶۵ء تک کے حالات پر مشتمل تھی، یہ جلد ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۳ء تک کے اہم حالات وواقعات زندگی، اسفار اور دوروں، اہم تصنیفات اور خطبات کے خلاصوں اور ان کے پس منظر پر مشتمل ہے، جن میں ضمناً ہندوستان اور عالم اسلام کے ان حالات اور واقعات کا ذکر آگیا ہے، جو ان تحریروں یا تقریروں کے محرک و باعث بنے اور جن کے علم کے بغیر اس روح اور جذبہ کا سمجھنا جو ان میں کارفرما ہے، اور ان کا محرک بنا ہے، مشکل ہے، اس طرح ایک محدود دائرہ کے اندر (جو ایک فرد کی سرگزشت کے حدود اربعہ میں آسکتا ہے) مصنف کے ملک ہندوستان، دنیائے اسلام بالخصوص ممالک عربیہ میں اس عرصہ میں پیش آنے والے بہت سے ایسے اہم واقعات وتغیرات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے، جو ان ملکوں کی سیاسی وتمدنی تاریخ لکھنے والوں مؤرخوں، یا ان پر تبصرہ کرنے والے صحافیوں کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے،

www.abulhasanalinadwi.org

اور اس میں ان آنے والے مؤرخین یا دینی و معاشرتی مبصّرین کو جو عُرفی و رسمی تاریخوں اور مطبوعہ تحریری سرمایہ پر انحصار نہیں کرتے، بلکہ اس عہد کے حسّاس انسانوں کے جن پر یہ حوادث اثر انداز ہوتے تھے، دل کی دھڑکنیں سننا چاہتے، اور ان کے چہرہ کے آثار چڑھاؤ کو دیکھنا چاہتے ہیں، مفید و رہنما اشارات ملیں گے، جن سے وہ کسی قدر اس عہد کی زندہ اور سچی روداد مرتّب کر سکتے ہیں۔

ناظرین کو (پہلی جلد کی طرح) اس جلد میں بھی شاید یہ بات کھٹکے کہ اس میں "حالات" سے زیادہ "خیالات" پیش کئے گئے ہیں، تحریروں اور تقریروں کے کثیر التعداد اور بعض اوقات طویل اقتباسات دیئے گئے ہیں، جن کو قارئین اصل کتابوں یا تقریروں کے مجموعہ میں پڑھ سکتے ہیں، مصنف نے ایسا قصداً کیا ہے کہ اس کو اپنے حالات سے زیادہ اپنے خیالات عزیز ہیں، اور وہ ان میں زیادہ افادیت سمجھتا ہے، اس کو اس کا پورا احساس ہے کہ اس کے حالاتِ زندگی میں کوئی نُدرت و رفعت نہیں، لیکن اس کے خیالات، احساسات و جذبات، زندگی اور ماحول کا مطالعہ، عالم اسلام اور انسانی مِلل و اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کا تجزیہ، موجودہ مصائب و مشکلات اور ان کے حقیقی اسباب تک رسائی، ہندوستان اور معاصر دنیا کے لئے صحیح راہِ عمل کا تعیّن، اس کے مطالعۂ قرآن اور مطالعۂ سیرت کا فیضان، اور اس شمع ہدایت کے ساتھ تاریخ انسانی کے بے لاگ جائزہ کا نتیجہ اور سب سے بڑھ کر توفیق الٰہی کا کرشمہ ہے۔ بقول اقبال۔ ؏

فقیر راہ کو بخشے گئے اَسرارِ سلطانی

www.abulhasanalinadwi.org

قاصر الہمت، ضعیف البنیان، خطاکار انسان۔۔۔ (جو آب وگِل کا مجموعہ اور بعض اوقات "چوب خشک" نظر آتا ہے) اور ان حقائق میں جو رحمتِ الٰہی اس کی آلودۂ معصیت زبان یا قلم پر جاری کردیتی ہے، جو تفاوت وتضاد ہے اس کو بڑی خوبی سے عارف رومیؒ نے ایک شعر میں بیان کردیا ہے ؎

خشک چوب وخشک نائے وخشک پوست

از کجا می آید ایں آواز دوست؟

مصنف کو (متعدد جلیل القدر تاریخی شخصیتوں اور مصنفین کبار کا سوانح نگار وتذکرہ نویس ہونے کی بناء پر) اس کا بھی تجربہ ہے کہ ایک مصنف بیسیوں کتابوں اور کبھی سیکڑوں تصنیفات کا مصنف ہوتا ہے، لیکن تقدیر الٰہی سے بعض اوقات اس مصنف کی عزیز دعوت اور بنیادی خیالات کسی ایک تصنیف کے ذریعہ محفوظ رہ جاتے ہیں، اور آئندہ نسلوں کو صرف اسی کتاب کے ذریعہ اس مصنف یا داعی کے خیالات وافکار، اس کی ذہنی ساخت اور اس کے طریقِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے، جو کسی حکمت الٰہی کی بناء پر اس کی کثیر التعداد تصنیفات میں سے باقی اور محفوظ رہ جاتی ہے، طوالت کے خیال سے اس کی مثالیں دینے سے احتراز کیا جاتا ہے، ورنہ ماضی بعید وماضی قریب کے اور خود زمانۂ حال کے متعدد اہلِ قلم اور اصحابِ فکر کی ایسی کتابوں کے نام لئے جاسکتے ہیں کہ صرف ان کے ذریعہ ان کی محنت وکاوش اور ان کا فکر ودعوت زندہ اور محفوظ ہے، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اکثر قارئین کثیر التعداد اور مختلف الالسنہ کتابیں حاصل کرنے اور ان کے پڑھنے کا وقت اور طاقت نہیں رکھتے، ان کے لئے بھی

www.abulhasanalinadwi.org

ایک ایسی کتاب موزوں ہے جس میں ان تصنیفات کا "عطرِ مجموعہ" اور منتشر و متفرق ضروری افکار و مضامین آگئے ہوں، اس احساس و تجربہ نے بھی "کاروانِ زندگی" میں ایسے عزیز ہم سفروں کو شامل کرنے کی دعوت دی، جو اپنا کام پورا کر چکے اور اپنی منزل پر پہونچ گئے، کہ ہم سفروں اور ہم صفیروں کا بڑا احق ہوتا ہے، اور بقول اقبال ؎

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

ان دونوں جلدوں کی ترتیب سے مصنّف ان احباب کے آئے دن کے سوالات و استفسارات کے جوابات دینے سے بھی فارغ ہوگیا، جو مصنّف پر تحقیقی مقالے (THESIS) لکھنے اور ڈاکٹریٹ کرنے میں مشغول ہیں۔[1]

مصنّف نے اس جلد کو ۱۹۸۳ء کے دسمبر پر ختم کر دیا کہ ۱۹۸۴ء ابھی رواں دواں ہے، اس سنہ کے آغاز میں مصنف نے تین اہم سفر تین اہم ممالک کے کئے، ایک بنگلہ دیش کا جو مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں ہوا، اور یہ بنگلہ دیش کا پہلا سفر تھا، اس لئے اس میں مصروفیت بھی بہت رہی، اور تقریریں بھی بہت اہم ہوئیں اس کا مجموعہ "تحفۂ مشرق" کے نام سے شائع ہو رہا ہے، دوسرا سفر عمّان، شرق اردن کا جو ۲۴ اپریل ۱۹۸۴ء - ۲ مئی ۱۹۸۴ء میں وہاں کی علمی مجلس "مؤسسة اهل البيت"

---

[1] مصنف کے علم میں ایسے چار فضلاء نے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اور ایک نے قاہرہ میں یہ موضوع اختیار کیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

(شعبۂ تمدن اسلامی) کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے اس کے سرپرست عالی مرتبت شہزادہ حسن بن طلال ولی عہد مملکت ہاشمیہ کے اصرار اور تقاضے پر ہوا، چونکہ قیام عمان کے دوران اسراء و معراج کی تاریخ بھی آگئی، اس لئے مصنف کو ۲۔۳ تقریریں اس موضوع پر بڑے اہم اور کثیر الازدحام جلسوں میں کرنی پڑیں، جن میں اس نے اسراء و معراج کے وسیع مضمرات اور اس سلسلہ میں امت کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔

اس سلسلہ کا سب سے اہم سفر صنعاء کا تھا جو ۱۳۔۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کے درمیان پیش آیا، یہ اس معدن ایمانی اور سرزمین یمانی کا پہلا سفر تھا جس میں مصنف کی طبیعت (اس سرزمین کی ان ایمانی خصوصیات کی بناء پر جن کی زبان نبوت نے شہادت دی ہے[1]، نیز اپنے تعلیمی، ثقافتی و ادبی روابط کی بناء پر[2]) بہت کھلی اور مضامین کا ایسا ورود ہوا جس کا تجربہ خال ہی خال ہوا ہے، اور اس کو بعض ایسے مؤقر و ذمہ دار مجمعوں کے سامنے تقریر کرنے کی نوبت آئی، جو اس سے پہلے کسی ملک کے سفر اور دورہ میں نہیں آئی تھی، ان دونوں ملکوں کے خطبات و خطابات کا مجموعہ "نفحات الإیمان بین صنعاء و عمان" کے نام سے حال میں شائع ہوا ہے، چونکہ ان تینوں سفروں کے خطبات کا مجموعہ جس میں سفروں کی مختصر روداد بھی ہے، شائع ہو چکا ہے، اس لئے

---

[1] حدیث صحیح "الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ" کی طرف اشارہ ہے جو صحاح میں آئی ہے۔

[2] مصنف کے عربی زبان و ادب کے اصل استاد شیخ خلیل بن محمد بن شیخ حسین یمانی تھے، اس کی سند حدیث بھی یمانی شیوخ حدیث کے واسطہ سے ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس جلد میں ان سفروں کی روداد اور ان کی تقریروں کے خلاصے شامل نہیں کئے جا رہے ہیں کہ تھکا ہوا قلم کچھ مہلت چاہتا ہے، اور شاید (اگر خدا کو منظور ہوا) اس حصہ کی تکمیل کسی عزیز یا رفیق کے مقدر میں ہو۔

ابوالحسن علی ندوی

۹ ربے نظیر بلڈنگ۔ بائی کلہ بمبئی ۸

۲۸ شوال ۱۴۰۴ھ
۲۸ جولائی ۱۹۸۴ء

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اوّل

بعض اہم تصنیفی و تحقیقی کام

اپنے مستقر پر

حیات مستعار کا کمزور اور بوسیدہ دھاگہ "کاروانِ زندگی" کے ص۵۱۵ پر اس حالت میں چھوڑا تھا کہ ۱۹۶۶ء کا سال شروع ہو چکا ہے، اور میں سیتا پور اسپتال سے فرصت کرکے اپنے وطن رائے بریلی آگیا ہوں، اس جگہ اس دھاگہ میں عمر کے باون۵۲ سال کی گرہ پڑ گئی تھی، اب اس دھاگہ کو جو ستر سال کی عمر میں اور کمزور پڑ گیا ہے (مارچ ۱۹۶۶ء سے) وہیں سے پکڑتا ہوں جہاں سے چھوڑا تھا "وَلِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ"۔

مناسب یہ معلوم ہوا کہ پہلے ان اہم تصنیفی و تحقیقی کاموں کا ذکر ایک سلسلہ میں کر دیا جائے جو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک انجام پائے، اس کے بعد ان واقعات و حوادث کا تذکرہ کیا جائے جو اس عرصہ میں پیش آئے، پھر اس مدت کی ان اہم مشغولیتوں، تحریکوں اور مہموں کا ذکر کیا جائے، جنھوں نے پوری توجہ اپنے اوپر مرکوز کر لی تھی، اور ان کو میں نے وقت کا اہم تقاضہ اور دین و ملت کی خدمت و حفاظت کا کام سمجھ کر انجام دیا تھا۔

جلد اول کے آخری دو صفحات پر جن تصنیفی کاموں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ان کو اس باب میں قدرے تفصیل سے لکھا جاتا ہے کہ وہ دعوتی و علمی اہمیت کے حامل ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

الأركان الأربعة کی تالیف

سیتاپور کے قیام کے دن ایک طرح موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے، تصنیف وتالیف کا مشغلہ تو الگ، میں اپنے عزیز رفیقوں سے پوچھتا تھا کہ کیا وہ دن پھر آئیں گے کہ میں معمول کے مطابق دن گذاروں گا؟ آزادی سے چلوں پھروں گا، اور دوستوں اور عزیزوں کی مجلس میں شرکت کروں گا؟ لیکن اس امید وبیم کی حالت میں بھی شدت سے اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ میں یہاں سے چھٹی پاتے ہی اسلام کے عملی ارکان اربعہ پر مکمل کتاب تیار کرنے کی کوشش کروں، یہ خیال قلب وذہن پر ایسا مستولی ہوا کہ اس کو اسپتال کا بیمار وسوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار کی تکلیف بھی ہٹا نہ سکی۔

اس خیال کا بڑا محرک یہ احساس اور علم تھا کہ اسلام کے ان عظیم بنیادی عملی ارکان (نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) کی روح، ان کی حکمتوں اور حقیقتوں، مصالح اور فوائد اور ان کے مقاصد کے سمجھنے اور بیان کرنے میں ہمارے مصنفین واہل قلم کے یہاں عرصہ سے ایک عجیب قسم کا انتشار اور بے اعتدالی نظر آرہی ہے، ان کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ عصر حاضر کے فلسفوں، اقتصادی وسیاسی مکاتب خیال اور ان کی محدود اصطلاحات وتعبیرات کا پابند وخوشہ چیں بنایا جارہا ہے، اس کی وجہ سے اس کا قوی اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ اس مخصوص طرز فکر سے متاثر ہونے والے قارئین کہیں خدانخواستہ دین کے ان بنیادی ارکان کی حقیقت اور اس کی اصلی طاقت سے محروم نہ ہوجائیں، اور ان مقاصد سے ہی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں جن کے لئے ان ارکان کی تشریع عمل میں آئی ہے، جدید مادی تعبیر اور عصری تشریح کے دائرۂ اثر میں آکر ایمان واحتساب کا مفہوم ہی ہمارے ذہنوں اور دلوں سے نکل جائے، اور مادی

www.abulhasanalinadwi.org

طرزِ فکر، عبادت اور اخلاص کی روح پر غالب آجائے، یہ بات امت کے لئے ایک بڑا خطرہ اور ایک عمیق معنوی تحریف کا پیش خیمہ ہے۔

آنکھ کی تکلیف، صحت کی کمزوری اور احتیاط کے طبّی تقاضوں کے باوجود اس اہم اور نازک کام کی تکمیل کی ہمت کچھ اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ اپنے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی تحریک اور تقاضہ پر حج کے مقاصد و اسرار پر (جو اس حیثیت سے ارکان اربعہ میں سب سے مظلوم رکن ہے کہ اس کو ایک "بین الاقوامی اسلامی مؤتمر" کا مرادف عرصہ سے قرار دیا جا رہا ہے اور راقم نے منیٰ و عرفات تک میں اس کا اسی طرح سے تعارف کیا جانا اپنے کانوں سے سنا ہے) مصنف حج پر ایک سلسلۂ مضامین لکھ چکا تھا، جو تین قسطوں میں تین سال حج کے موقعہ پر "المسلمون" میں شائع ہوئے تھے، اور سعودی ریڈیو اسٹیشن سے بھی کئی بار نشر کئے گئے، اور تعلیم یافتہ نوجوانوں اور علمی حلقوں میں عام طور پر پسند کئے گئے، اس میں ایک ایسا نیا اسلوب تحریر نظر آتا ہے جو موجودہ عربی طرزِ نگارش سے الگ ہے، یہ کاتب کی کسی قابلیت اور زورِ قلم کا نتیجہ نہیں ہے، خود اس کے موضوع کے مزاج و روح کی کارفرمائی ہے، اور اس عاشقانہ و والہانہ نسبت کا اثر ہے، جو اس رکن کے مؤسّس و بانی ابراہیم خلیل اللہؑ کا امتیاز تھا، بقول شاعر ؎

ایں ہمہ مستی و مدہوشی نہ حدِّ بادہ بود
با حریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

حج کے علاوہ مجھے دو سال رمضان سے متعلق بھی "المسلمون" ہی کی فرمائش پر روزہ اور اس کے مقاصد پر دو مقالے لکھنے کا موقعہ ملا تھا، اور وہ بھی "المسلمون" میں شائع ہوئے تھے، اس طرح اس وسیع اور نازک کام کو اس خیال نے ہلکا بنا دیا کہ اس سلسلہ کا آدھا کام تو ہو گیا ہے، اب صرف نماز اور زکوٰۃ پر لکھنا ہے، ۱۹، ۲۰ فروری ۱۹۶۶ء کو اسپتال سے واپسی ہوئی تھی کچھ دن

www.abulhasanalinadwi.org

ضروری آرام اور ایک دو سفر کے بعد ۸ر اپریل ۱۹۶۶ء (۱۶ر ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ) سے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کر دیا، گرمیاں شروع ہو چکی تھیں، اور آنکھ کی کیفیت کے لحاظ سے گرمی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، میں نے حضرت شاہ علم اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی بابرکت مسجد (واقع دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی) میں جانب مغرب عقبی حصہ میں بیٹھ کر لکھوانے کا کام شروع کر دیا، عزیزی مولوی نثار الحق ندوی لکھتے تھے، میں بولتا تھا، کتاب کو اصلاً عربی ہی میں لکھنا تھا، اپنے طرزِ تصنیف کے مطابق پہلے میں نے مواد جمع کیا، مثلاً نماز کے لئے پہلے ایک بار پورے قرآن مجید پر نظر ڈالی، متعلق آیات نوٹ کرائیں، حدیث کے لئے "جمع الفوائد و مجمع الزوائد" کے ان ابواب پر نظر ڈالی جو ان ارکان کے فضائل، مقاصد و فوائد کے متعلق تھیں، اور ان کو نوٹ کیا، پھر خصوصیت کے ساتھ امام غزالیؒ، حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تالیفات احیاء العلوم زاد المعاد اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اس پر جو کچھ لکھا ہے اور جو خاص نکتے ان کی تحریروں میں آئے ہیں ان کو قلم بند کیا، پھر ان کو سامنے رکھ کر لکھوانا شروع کیا، گرمی کی شدت شروع ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا، ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا، یہ عرصہ سے میری زندگی میں ہر اہم تصنیف کا خاصّہ بن گیا ہے، اور اس کے خلاف کرنا عام حالات میں اب ممکن نہیں رہا ہے، یہ ایک طرح کا "تصنیفی اعتکاف" ہوتا ہے، جس سے نکلنا اسی وقت ہوتا ہے، جب کتاب کی تائے تمت ہلالِ عید بن کر نمودار ہوتی ہے، حج اور روزہ پر اگرچہ بنیادی مضمون پہلے سے تیار تھے، پھر بھی کتاب کے وسیع خاکہ اور معیار کے مطابق ان میں خاصہ اضافہ کرنا پڑا، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مدد اور رہنمائی شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے ملی۔

۱۳ر فروری ۱۹۶۷ء (۲ر ذی قعدہ ۱۳۸۶ھ) کو کتاب کی تکمیل ہوئی، کتاب میں ان ارکان کے

www.abulhasanalinadwi.org

مقاصد، اسرار و اثرات بیان کرنے کے ساتھ اس کا التزام بھی کیا گیا کہ دوسرے مذاہب میں یہ عبادات کن شکلوں میں پائی جاتی ہیں، اور ان میں اور اسلام کے ان ارکان میں ہیئت، ساخت اور اثرات میں کیا فرق ہے؟ اس تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDY) کے لئے جو شاید پہلی مرتبہ (کم سے کم عربی میں) پیش کیا گیا تھا، دوسرے مذاہب کی کتابوں اور انگریزی کے سیکڑوں ہزاروں صفحات پر نظر ڈالنے کی ضرورت تھی جس میں (نگاہ کی اس کمزوری و معذوری کی حالت میں) محترمی شاہد علی صاحب ایم، اے مرحوم سابق استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء سے قیمتی مدد ملی، اس سلسلہ میں رکن حج کا بڑا حصہ بہیت مئو کی بستی میں پورا ہوا جو کاکوری، ملیح آباد جانے والی سڑک پر لکھنؤ سے پانچ میل پر واقع ہے، اور جہاں میں ۱۹۶۷ء کے جنرل الیکشن کے ہنگامہ سے بچنے کے لئے ہفتہ دو ہفتے کے لئے "پناہ گزیں" یا (UNDERGROUND) ہو گیا تھا۔

کتاب مکمل ہوتے ہی اس کو اپنے سب سے بڑے عربی ناشر مکتبہ دار القلم۔ کویت کو بھیج دیا گیا، جہاں سے ۱۹۶۷ء میں (۱۳۸۶ھ) اس کا پہلا ایڈیشن نکلا، اور ایک ہی سال کے عرصہ میں وہ ختم ہو کر ۱۹۶۸ء (۱۳۸۸ھ) میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، عربی ایڈیشن ہی پر مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دار المصنفین و مدیر "معارف" کے قلم سے اس پر غیر معمولی تبصرہ نکلا، انھوں نے لکھا کہ اس میں بڑا شبہہ ہے کہ اس کے اردو ترجمہ میں اصل کتاب کی طاقت اور روح آسکے گی، سوائے اس کے کہ مصنف خود ہی اس کو لکھوا دیں، لیکن برادر زادہ عزیز محمد میاں مرحوم نے (جن کو میری تحریروں، مذاق و اسلوب سے اتنی مناسبت تھی کہ ان کو اپنا مُنشی ہی کہا جا سکتا ہے) بڑی کامیابی سے یہ فرض انجام دیا اور بہت جلدی اس کا ترجمہ مکمل کر دیا، جو "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے ۱۹۶۹ء (۱۳۸۹ھ) میں شائع ہو گیا، اس پر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدیر "برہان" اور مولانا سید احمد عروج قادری مدیر "زندگی" نے بڑے اچھے تبصرے کئے،

www.abulhasanalinadwi.org

جلد ہی اس کا انگریزی ترجمہ (FOUR PILLARS OF ISLAM) کے نام سے ڈاکٹر محمد آصف صاحب کے ادیبانہ قلم سے اور ترکی ترجمہ قونیہ کے اسلام نشریات کی طرف سے شائع ہوا، انگریزی اور ترکی کے اس وقت تک متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، حال میں جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض کی طرف سے اس کے ترکی ترجمہ کی طباعت واشاعت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔

بعض اہل علم کو اس کتاب میں ایک بڑی کمی اور خلا محسوس ہوا، وہ یہ کہ عملی ارکان اربعہ (صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم وحج) سے پہلے اسلام کے بنیادی عقائد ایمان باللہ اور عقیدۂ توحید، ایمان بالرسالۃ اور ایمان بالآخرۃ پر کچھ نہیں لکھا گیا ہے، کم سے کم عقیدۂ توحید پر ایک مستقل باب ہونا چاہئے تھا، ۱۹۷۴ء میں جب پہلی مرتبہ حج کے موقعہ پر رابطہ کی اس عمارت میں جو منی میں واقع ہے، جامعہ ازہر کے جلیل القدر شیخ الاستاذ الاکبر شیخ عبدالحلیم محمود سے پہلی ملاقات ہوئی جو "الأركان الأربعة" کا مطالعہ مصر میں کرچکے تھے، تو انھوں نے یہی سوال کیا کہ آپ نے عقائد کی بحث کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا؟ میں نے کہا کہ اس موضوع پر میرا مستقل لکھنے کا خیال ہے، اس کے لئے ایک باب نہیں ایک مستقل کتاب چاہئے، انھوں نے فرمایا کہ آپ اس کتاب کی تکمیل کرلیں تو مطلع کریں، وہ کتاب انشاء اللہ ازہر کی طرف سے چھپے گی، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، واقعہ بھی یہی تھا کہ میں اس موضوع پر "الأصول الثلاثة" کے نام سے مستقل کتاب لکھنا چاہتا تھا اور میں نے اس پر مواد جمع کرنا شروع کردیا تھا، لیکن اس سہولت کی بناء پر (کہ اس کا تقریباً نصف کام ہوچکا تھا) میں نے اس کتاب سے ابتداء کی، مجھے اندازہ تھا کہ عقائد کے باب میں اس سے زیادہ دقت نظر، مطالعہ کی وسعت اور اجنبی مآخذ (یہودیت، عیسائیت، اور ہندو دھرم) کی مستند کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت ہوگی، جو زیادہ تر انگریزی میں ہیں، میری نگاہ ۱۹۷۷ء تک (جب امریکہ میں بفضلہ تعالیٰ کامیاب آپریشن ہوا) اس قابل نہیں ہوسکی تھی کہ

www.abulhasanalinadwi.org

میں براہ راست مطالعہ کر سکوں، تصنیفی و تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کا اندازہ ہے کہ خود مصنف جب تک براہِ راست مطالعہ نہ کر سکے اپنے کام کی چیزیں مہیا نہیں کر سکتا، بعد میں جب میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا اور اندازہ ہوا کہ جلد مستقل اور مفصل کتاب لکھنے کی نوبت نہیں آئے گی تو میں نے اہلِ سنّت کے بنیادی عقائد کو کتاب و سنت کی روشنی اور ان کے مستند ترجمانوں کی تالیفات کی مدد سے اپنی کتاب "العقیدۃ والعبادۃ والسلوک" میں پیش کرنے کی کوشش کی، جو عربی میں ۱۹۸۲ء میں اور اس کا اردو ترجمہ "دستورِ حیات" کے نام سے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا کہ "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ"۔

"نزہۃ الخواطر" جلد ہشتم "وجنۃ المشرق"

"نزہۃ الخواطر" کی سات جلدیں[1] شائع ہو چکی تھیں، آٹھویں جلد اس لئے روک لی گئی تھی کہ اس میں متعدد تراجم (تذکرے) نامکمل تھے، مصنف کا ارادہ خود ان کی تکمیل کا تھا، کتاب کی تالیف کے وقت تک ان شخصیتوں نے جن کے اس کتاب میں تذکرے ہیں، شہرت وارتقاء کی جو منزلیں طے کی تھیں، ان کی زندگی کے جو اہم واقعات تھے، اور انھوں نے اس وقت تک جو تصنیفات کی تھیں، ان کا تذکرہ آچکا تھا، اور مصنف کا ارادہ تھا کہ اس میں حسب ضرورت اضافہ کر کے ان کی تکمیل کر دیں کہ ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو اچانک ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا، اور وہ تراجم نامکمل رہ گئے، اسی طرح جن حضرات نے مصنف کے بعد وفات پائی قدرتاً ان کی تاریخ وفات ان کے قلم سے کتاب میں نہیں آسکتی تھی،

[1] ساتویں جلد جو تیرھویں صدی کی شخصیتوں پر مشتمل ہے، ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس حصہ میں ۵۵۹ تذکرے ہیں، لیکن وہ تذکرے جن میں مؤلف نے بیاض چھوڑ دیا ہے، اور بعض میں آدھے آدھے اور پورے صفحے خالی ہیں، یا جن کی وفات مصنف کی وفات کے بعد ہوئی، ان کی تعداد ۳۵۰ تھی، ان میں سے بہت سی ایسی اہم شخصیتیں تھیں جن کا ذہنی و علمی ارتقاء یا علمی و عملی سفر مصنف کے زمانہ میں شروع ہی ہوا تھا، اوران کے مرغ شہرت نے بال و پر ہی نکالے تھے، مصنف نے اپنی فراخ دلی، علمی قدردانی اور فراست و جوہر شناسی سے ان کو کتاب میں شامل کرلیا تھا لیکن ان کے تذکرے میں وہ استیعاب نہیں تھا، جو بعد کا مؤرخ ہی کرسکتا تھا، مثلاً مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ، شیخ خلیل بن محمد بن حسین یمانیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا سید طلحہ حسنیؒ، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ، مولانا عبدالشکور فاروقی کاکورویؒ، ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ (فرزند مصنف) مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا محمد سورتیؒ۔

ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں ان تراجم کو مکمل کرکے کتاب کو طباعت کے قابل بنادوں، یہ کتاب چونکہ کثیر التعداد معاصر شخصیتوں کے حالات اور اس چودہویں صدی ہجری کے تراجم پر مشتمل تھی، جو ہماری صدی ہے، اس لئے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی، اور وہ قارئین کے لئے ایک خاص کشش رکھتی تھی، بصارت کی موجودہ کیفیت میں میرے لئے اس کام کی تکمیل بظاہر تکلیف مالایطاق معلوم ہوتی تھی، ساتویں جلد چھپے ہوئے دس سال ہو رہے تھے، اور اہل ذوق و تحقیق کے حلقہ میں آٹھویں جلد کی طلب اور اس کی ضرورت کا احساس تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

میں اس وجہ سے بھی اس کی ہمت نہیں کر رہا تھا کہ اپنی ساری عربی تحریر و انشاء کی مشق اور تجربہ کے ساتھ اور اس کے باوجود کہ اس وقت تک میں ایک درجن سے زائد عربی کتابوں کا مصنّف بن چکا تھا اور انھوں نے عالم عربی میں مقبولیت و وقعت حاصل کر لی تھی، مجھے والد مرحوم کے قلم سے قلم ملانا سخت دشوار معلوم ہوتا تھا کہ ان کی تحریر میں ایسا ایجاز، سلاست وحلاوت اور ایک دقیق النظر مصنّف و ناقد کا احساس ذمہ داری اور مؤرخانہ فرض شناسی پائی جاتی ہے کہ میں ان کے طرز پر دو سطریں لکھنا بھی مشکل سمجھتا تھا، ان کی تحریر اقلّ و دلّ کا بہترین نمونہ تھی، میں ان تراجم کی تکمیل کے سلسلہ میں چند سطریں لکھنے کے مقابلہ میں کسی کے متعلق پورا مضمون لکھ دینا آسان سمجھتا تھا کہ اس میں قلم آزاد ہوتا ہے، پھر ان ناقص معلومات کو جمع کرنا اور سنین وفات کو معلوم کرنا خود ایک ہفت خواں سر کرنا تھا، ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ براہ راست مطالعہ کرنے سے قاصر تھا، لیکن ڈاکٹر عبدالمعید خاں صاحب کا اصرار اور اس اہم کتاب کی تکمیل کے خیال نے جو ہندوستان کے اسلامی عہد (قرن اول سے لے کر جب اس ملک میں اسلام کے قدم آئے چودھویں صدی ہجری تک کی ممتاز اسلامی شخصیتوں کے مستند حالات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ تھی، اور جس کی مثال اپنے زمانی و مکانی رقبہ کی وسعت اور احتواء و جامعیت میں کسی دوسرے ملک میں بھی نہیں ملتی[1]) اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا، میں نے پہلے بعض رسائل و اخبارات میں ان اشخاص کی فہرست شائع کی جن کی

---

[1] ترکی سے لے کر انڈونیشیا تک تمام اسلامی ملکوں کے تراجم و تذکروں کی کتابیں یا کسی صدی کے ساتھ مخصوص ہیں، یا کسی علاقہ کے ساتھ، یا کسی طبقہ اور فن کے ساتھ "نزہۃ الخواطر" پر ہندوستان کو بجا طور پر فخر ہونا چاہیے کہ وہ ایک طرف پہلی صدی سے مصنف کی صدی تک اور دوسری طرف درۂ خیبر سے ہندوستان کے آخری مشرقی کنارہ تک تذکروں کا احاطہ کرتی ہے، تیسری طرف وہ اہل علم و اہل کمال کے ہر طبقہ کو محیط ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

تاریخ وفات مطلوب تھی، اسی مضمون کو سائکلواسٹائل کرکے اہل علم و واقفین کے پاس بھیجا، لیکن اس میں بہت کم کامیابی ہوئی، کبھی کبھی بعض دوستوں کو تکلیف دی کہ وہ اپنے شہر کے مقبرہ میں جاکر لوح مزار پڑھ کر تاریخ وفات نوٹ کرلیں، حیدرآباد کے بعض دوستوں نے یہ تکلیف گوارہ کی اور لوح مزار سے یا خانگی بیاضوں سے تاریخ نوٹ کرکے بھیجی۔[1]

اب میں نے بنام خدا کام شروع کیا، کسی شخصیت کے فضائل و اوصاف لکھنے میں جس کے لئے مصنف نے بیاض چھوڑ دیا تھا، بار بار دیکھنا پڑتا تھا کہ میری عبارت و توصیف میں افراط و تفریط تو نہیں آگئی، مصنف اگر خود لکھتے تو وہ کن الفاظ کا انتخاب کرتے، اور کن حدود سے تجاوز نہ کرتے، میں دیکھتا تھا کہ میرے الفاظ کا پارہ (درجۂ حرارت و برودت) کتاب کے عام تعریفی یا تعارفی الفاظ کے پارہ سے بڑھ یا گھٹ تو نہیں گیا اور اصل و اضافہ کے ٹمپریچر میں تفاوت تو پیدا

---

[1] اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے جس سے اس کام میں خدا کی مدد کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان اشخاص میں جن کی تاریخ وفات کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکی تھی "تحفۃ الہند" کے مخلص مصنف مولانا عبیداللہ پائلی بھی تھے، مجھے کہیں سے ان کی تاریخ وفات دستیاب نہیں ہوئی، اسی زمانہ میں ایک دن میرے لکھنے پڑھنے کے کمرہ میں رائے بریلی میں اچانک ایک صاحب وارد ہوئے، میں نے غور سے دیکھا تو وہ جموں کے مولوی عبدالرحمٰن صاحب ایم، پی تھے، انھوں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ میں نے کہا "نزہۃ الخواطر" کی آٹھویں جلد کو مکمل کررہا ہوں، پھر میں نے کہا کہ بعض سنین وفات کوشش کرنے سے بھی نہیں معلوم ہوسکے، انھوں نے کہا کہ مثلاً؟ میں نے کہا کہ ایک مولانا عبیداللہ صاحب پٹیالوی ہی ہیں کہ جن کی کتاب تحفۃ الہند پڑھ کر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، جن میں ایک مولانا عبیداللہ صاحب سندھی بھی ہیں، کہنے لگے کہ عجیب بات ہے کہ میں نے اس سفر میں ایک جگہ "شحنۂ ہند" (مرادآباد) کا ایک پرانا فائل بکتے ہوئے دیکھا، مجھے اس کی کچھ ضرورت نہ تھی لیکن میں نے خرید لیا، اس میں ایک جگہ ان کے انتقال کی پوری تفصیل اور تاریخ لکھی ہے، یہ ان صاحب کا مکتوب ہے جنھوں نے انتقال کے وقت مولانا کو اپنے سینہ سے لگا رکھا تھا، انھوں نے عنایت فرماکر مجھے وہ فائل دیا اور میں نے ان کی تاریخ وفات اور ان کے انتقال کے وقت کی تفصیل اور کیفیت کتاب میں درج کرلی۔ (ملاحظہ ہو ترجمہ مولانا عبیداللہ پائلی جلد ۵ ص ۳۰۲-۳۰۳)

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں ہوگیا، مجھے خود اپنی عبارت میں بار بار قطع و برید کرنی پڑتی، اس میں سب سے زیادہ مصنف ہی کے اسلوب و پیمانہ سے مدد ملی جس کو کتاب کے بار بار مطالعہ و استفادہ سے ذہن نے اخذ کرلیا تھا، یہ اضافہ اور تکملہ تیار ہوگیا، میں نے اپنے اضافہ اور اپنی تحریر کو ادباً قوسین میں درج کیا تاکہ ان کی ذمہ داری مجھ پر رہے، اور میں نے کتاب کا مکمل مسودہ ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیج دیا، جو ۱۹۷۰ء میں طبع ہوا، اور اس طرح کتاب مکمل ہوگئی، مجھے اس کے بارے میں جب اطمینان ہوا، جب میرے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب حسنی ایم اے مقیم کراچی نے (جو خود عربی کے ادیب اور ایک اچھے مبصر اور ناقد تھے، اور مصنف کے صحبت یافتہ اور ان کے اسلوب کے رمز شناس) کتاب کو پڑھ کر اس کا اعتراف کیا کہ کتاب کی تکمیل کرنے والا اپنی پیوندکاری میں بہت حد تک کامیاب ہوا ہے۔

کتاب کی آخری جلد میں جس کی تالیف کا سلسلہ غالباً مصنف کی آخری زندگی تک چلتا رہا، ہندوستان کے بہت سے علماء اور ممتاز شخصیتوں کا تذکرہ چھوٹ گیا ہے، جنھوں نے یا تو مصنّف کی زندگی تک ایسا امتیاز یا شہرت حاصل نہیں کی تھی کہ ان کو اس کتاب میں لیا جاتا، یا مصنّف کا ارادہ تھا کہ ان کو کتاب میں جگہ دیں، مگر موت نے مہلت نہ دی، بعض احباب و اہلِ ذوق کا تقاضا تھا کہ اس آٹھویں جلد کے تکملہ میں لگے ہاتھوں ان کو بھی شامل کر لیا جائے، لیکن غور کیا تو ان کی فہرست بہت طویل تھی، یوں بھی یہ جلد طباعت کے وقت ۵۵۷ صفحے پر آئی ہے، ان کے بارے میں معلومات و مواد جمع کرنے میں بڑا وقت صرف ہوتا، پھر نظر کی معذوری، کاموں اور سفروں کی کثرت نے اس ارادہ سے باز رکھا، یہ کام اب بھی باقی ہے، اللہ ہی کو علم ہے کہ اس کی توفیق کس کو اور کب ہوتی ہے۔

"الأركان الأربعة" سے فراغت کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تصنیف "جنۃ المشرق ومطلع النور المشرق"

www.abulhasanalinadwi.org

جو ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد حکمرانی کی ایک طرح کی تاریخی ڈائرکٹری اور ہندوستان کے اسلامی عہد کا مفصل جائزہ ہے، جس میں ہندوستان کا جغرافیہ، اس کے حاصلات (پیداوار) حکومت کرنے والے مسلمان خاندانوں کی تفصیل، ان کے زمانہ کا نظم ونسق اور ان کے سلسلہ کی اصلاحات، ملک کی تقسیم، طریق انصاف وعدالت، شاہی دولے، ڈاک کا نظام، ان کے زمانہ کے رفاہی کام، سڑکیں، باغات، شفاخانے، اپاہج خانے، تحصیل وصول کے طریقے، تعمیری کارنامے، سکّے، ایجادات واوّلیات، توقیت وتقویم کا طریقہ، ہر عہد میں ملک کی آمدنی خزانہ شاہی، اور فوجی طاقت کا جائزہ، اور طریق جنگ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بلا مبالغہ ہزارہا صفحات اور سالہا سال کی محنت کا نچوڑ اس میں آگیا ہے، اس شکل میں غیر مطبوعہ رکھی ہوئی ہے کہ اس کے مسودہ کو جا بجا دیمک نے نقصان پہونچایا، کہیں ایک لفظ کرم خوردہ ہے کہیں ایک جملہ، جس کی تکمیل کے لئے بڑی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کی ضرورت ہے یہ کتاب جن حوادث سے دوچار ہوئی اس کی داستان عربی اور اردو کے ایڈیشن کے مقدمہ میں بیان کردی گئی ہے[۱]، اس کتاب کے مسودہ میں خالی جگہوں کو پُر کرنا پہاڑ تراش کر جوئے شیر لانے کے مرادف تھا، ادھر اپنی حالت یہ تھی کہ اپنی نظر سے باریک لکھا ہوا ایک صفحہ بھی پڑھنا مشکل تھا، خوب یاد ہے کہ تکمیل کے بعد میں اس کتاب کا مقدمہ لکھوا رہا تھا، لکھنا یہ چاہتا تھا کہ مختلف عہدوں میں مسلمانوں نے ان ملکوں کی جہاں ان کی بود وباش تھی یا جہاں دعوتِ اسلام وخدمت انسانیت ان کو لے گئی تھی، کیا خدمت کی، ان کو کس طرح اپنی محنت وذہانت سے چار چاند لگائے، ان کی گم شدہ تاریخ کس طرح مرتب ومحفوظ کی، اور ان کو کس طرح تاریکی سے نکال کر تاریخ ومعلومات کی روشنی میں لائے، اور اس طرح سچی

---

[۱] ملاحظہ ہو "ہندوستان اسلامی عہد میں" مقدمہ ص ۲۲-۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

حب الوطنی کا ثبوت دیا، مضمون گرفت میں نہیں آرہا تھا، اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کیا جائے کہ اچانک مضمون ذہن میں آگیا، ابھی چند سطریں لکھوائی تھیں عزیزی مولوی نذر الحفیظ ندوی لکھ رہے تھے کہ زخمی آنکھ میں تشنج ہوا، اور ایسا درد کہ میں دوا ڈلوا کر لیٹنے پر مجبور ہوا، میں نے لکھوانا بند کر دیا، مگر دماغ نے کام کرنا بند نہیں کیا، ذہن میں مقدمہ کا مضمون مچل رہا تھا اور ضد کر رہا تھا کہ اس کو اسی وقت حوالۂ قرطاس کیا جائے، لیکن لکھوانے کا وقت گذر گیا تھا، اور دوسرے دن کا انتظار کرنا ضروری تھا، مجھے وہ تکلیف ابھی تک یاد ہے کہ ذہن کی چکی چل گئی تھی مگر اس سے کام لینے کا موقع نہ تھا، اس کی قیمت اعصاب کو ادا کرنی پڑی، میں نے کھیتوں میں ٹہل کر دماغ کو سکون پہونچانے کی کوشش کی جوں توں کر کے دن کٹا، رات گذری، اگلے دن اس مضمون کو مکمل کیا۔[1]

کتاب جو ایک ہندوستانی عالم کا ایسا کارنامہ تھا، جس کی نظیر ہندوستان کی کسی زبان (انگریزی، اردو، ہندی یا علاقائی زبانوں میں) میں نہیں ملتی، اور بیرون ہند میں بھی اس طرز و معیار کی کتاب صرف علامہ مقریزی کی کتاب خطط مصر[2] ہے، چھپوانے کا کوئی انتظام نہ تھا، میں ۱۹۵۱ء میں جب مصر گیا تھا، تو کتاب کا عربی نسخہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، اور ڈاکٹر احمد امین صاحب کو اس امید میں دکھایا تھا، کہ وہ اس کو اپنی مجلس لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر کی طرف سے شائع کر دیں گے، انھوں نے پہلے اس کے ان حصوں کے اضافہ کی فرمائش کی جو تقسیم ہند کے بعد ضروری ہو گئے ہیں، میں وہ کتاب

---

[1] یہ مضمون "الھند فی العھد الاسلامی" کے ص۱ سے شروع ہو کر ص۲۳ پر ختم ہوتا ہے۔

[2] مصنف کا پورا نام علامہ تقی الدین احمد بن علی بن عبد القادر ہے، ان کی وفات ۸۴۵ھ میں ہوئی کتاب کا پورا نام "کتاب المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار" ہے کتاب دو بڑی جلدوں میں ہے، اور مصر میں چھپی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے ساتھ لے آیا، تقسیم ہند کے بعد کی تبدیلیوں کے کچھ حصہ کو بھائی صاحب نے بڑی خوبی سے مکمل کر دیا تھا، صوبوں کی نئی تقسیم، نئی مردم شماری، علاقائی زبانوں سے متعلق معلومات اور مسلمانوں کے تناسب آبادی وغیرہ کو انھوں نے اپنے قلم سے لکھ کر پورا کر دیا تھا، اور اس کے بہت سے خلا جو بے بصر و علم دشمن دیمک نے لفظوں اور جملوں کو چاٹ کر کتاب میں پیدا کر دیئے تھے، اپنی محنت و مطالعہ سے پُر کیا تھا، پھر بھی بعض تکمیلی کاموں کی ضرورت تھی۔

اسی عرصہ میں اس کتاب کے مسودہ پر دیمک کا دوبارہ حملہ ہوا اور پھر اس کو ایک نئی محنت کی ضرورت پڑ گئی، میں بھائی صاحب سے سن چکا تھا کہ والد صاحبؒ کو اپنی اس کتاب پر اس طرح کا ناز تھا جو مصنّف کو اپنی اس کتاب پر ہوتا ہے، جس پر اس نے سب سے زیادہ محنت کی ہوتی ہے، یہ خیال رہ رہ کر پہلو میں چٹکی لیتا، اور دل کو گدگداتا تھا کہ ایک پڑھے لکھے فرزند کی بڑی ناخلفی ہے کہ وہ اپنے نامور باکمال باپ کے اس کام کی تکمیل اور اس کو منظر عام پر لانے کی امکانی جدوجہد نہ کرے، جذبۂ صادق اور احساس فرض اکثر طبعی اور طبّی موانع پر غالب آیا ہے، اور اقبالؔ کے اس شعر پر کام کرنے والوں نے عمل کیا ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

خالی جگہوں کو پُر کرنے اور کرم خوردہ جملوں کی تکمیل کے لئے بعض اوقات محکمۂ آثار قدیمہ اور دفاتر کے ریکارڈس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور دوستوں نے اس سلسلہ میں تعاون کیا۔[1]

---

[1] مثلاً حیدرآباد کی بعض نہروں اور تالابوں کے متعلق وہاں کے احباب مولوی عبدالقادر صاحب اور عزیزی سید غلام محمد انجینیر وغیرہ نے مدد کی مثلاً حسین ساگر، میر عالم ساگر، عمدہ ساگر وغیرہ بعض جگہ امرائے دولت آصفیہ کے خطابات اور القاب کو دیمک چاٹ گئی تھی، ان کو بھی وہاں کی تاریخی دستاویزوں کی مدد سے مکمل کیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسی زمانہ میں اپنے عزیز دوست محمد پاشا شراالی مرحوم نے اپنے وطن بھٹکل کی دعوت دی، عزیزی نذر الحفیظ بھی ساتھ تھے، ان کے مکان پر جو شہر سے الگ تھلگ اس کی نواحی بستی شراالی میں واقع تھا، اسی کام میں مشغول رہا، الحمدللہ کچھ عرصہ کے بعد کام مکمل ہوگیا۔

اب اس کی طباعت کی فکر ہوئی، ہندوستان میں اس وقت تک کوئی ایسا دارالاشاعت یا اکیڈمی نہ تھی جو ہندوستان کے اس علمی کارنامہ کو جو "اکاڈمی" نہیں "ایک آدمی" نے انجام دیا تھا، شائع کرکے ہندوستان کا نام اونچا اور ایک ہندوستانی فاضل کے کارنامہ کو اجاگر کرتی، اس موقعہ پر دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی طرف ذہن گیا، جس کے اس وقت ناظم اور سکریٹری ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب تھے، جو خود ایک محقق و فاضل شخصیت تھے، اور اس سے پہلے وہ انھیں مصنف کی شہرۂ آفاق کتاب "نزہۃ الخواطر" کی آخری جلدیں طبع کراچکے تھے، اور انھیں کے تقاضہ اور اصرار سے (جیسا کہ اوپر گذرا) میں آٹھویں جلد کی تکمیل کرچکا تھا۔

حسن اتفاق سے اسی وقت مجھے رائچور کے ایک جلسۂ سیرت میں شرکت کی دعوت ملی، میں نے آنکھ کی تکلیف کے باوجود اسی لالچ میں اس دعوت کو منظور کرلیا کہ حیدرآباد میں ڈاکٹر صاحب سے ملتا ہوا جاؤں گا، اور کتاب کی طباعت و اشاعت پر ان سے گفتگو کروں گا، برادر عزیز سید حسن عسکری طارق (حال ٹیلی فون انجینیر سعودی عرب متعینہ مدینہ طیبہ) اس سفر میں ساتھ ہوگئے، میں نے ڈاکٹر صاحب کو کتاب کا مسودہ دکھایا اور اس سلسلہ میں ان کی مدد چاہی، انھوں نے اپنے تحقیقی ذوق اور علمی قدردانی کی بناء پر اس کو بہت پسند کیا، اور کہا کہ ضابطہ کی کارروائی میں تو بہت دیر لگے گی، حکومت ہند سے اجازت مانگنی پڑے گی اور اس کو آئندہ سال کے پروگرام میں رکھنا ہوگا، مگر میں اس کے لئے ایک ذیلی کمیٹی بنا دیتا ہوں جس کے ایک رکن آپ بھی ہوں گے اور اس کا کام شروع کرا دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو بہترین جزا عطا فرمائے،

www.abulhasanalinadwi.org

انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ کتاب کا کوئی ایسا نام تجویز کیا جائے، جو اپنے موضوع پر واضح طریقہ پر دلالت کرے، ہم لوگوں کے مشورے سے "الھند فی العھد الاسلامی" تجویز ہوا اور ڈاکٹر صاحب کی مساعی جمیلہ سے ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) میں کتاب شائع ہو گئی، کتاب ۴۶۹ صفحات میں آئی ہے، جلد ہی اس کا ترجمہ اردو میں مولوی شمس تبریز خاں رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے قلم سے "ہندوستان اسلامی عہد میں" کے نام سے شائع ہو گیا، اس ترجمہ میں کتاب کے وہ حصے حذف کر دیئے گئے جو عام تاریخوں میں ملتے ہیں، مثلاً جغرافیائی اصطلاحات کی تشریح، حکمراں خاندانوں کی تفصیل وغیرہ، صرف خُطَط و آثار اور تاریخی معلومات کا حصہ باقی رہا، تھوڑے عرصہ کے بعد ہمارے قابل احترام دوست سید محی الدین صاحب نے (INDIA DURING MUSLIM RULE) کے نام سے اس کو انگریزی میں منتقل کر دیا۔

مخلصین کے ساتھ اللہ کا معاملہ

قبل اس کے کہ یہ تذکرہ ختم کیا جائے، قارئین کی عبرت کے لئے اور ایک تاریخی حقیقت کے طور پر لکھا جاتا ہے، کہ اس کا بار بار تجربہ اور مشاہدہ ہوا کہ مخلص کی محنت اکثر ضائع نہیں ہوتی، مخلص کا سفینہ بارہا گرداب میں پڑنے کے باوجود کہ ساحل کے تماشائی ہر لمحہ ڈرتے ہیں کہ اب ڈوبا اب ڈوبا کنارہ لگ جاتا ہے، اور غیر مخلص کا سفینہ ساحل پر پہونچتے پہونچتے بھی ڈوب جاتا ہے، بارہا دیکھا ہے کہ ایک شخص کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر ہے، اور اس کا پورا عہد اس کا کلمہ پڑھتا ہے، پھر اس کی زندگی ہی میں یا اس کی زندگی کے بعد اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے، اور کوئی ناقد ایسا پیدا ہو جاتا ہے، جو گویا اس کی تنقید یا تشریح (پوسٹ مارٹم) کے لئے مامور ہے، اور اچانک اس کی شہرت و قبولیت کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے مقابل ایک شخص گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر کام کرتا ہے، اور اس کی زندگی تک اس کے کام کا کوئی تعارف نہیں ہوتا، اچانک ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں کہ اس کے بہائے ہوئے پسینہ کا ایک ایک قطرہ اس کے لئے آب حیات بن جاتا ہے، اور اس کے نقوش قلم کی حفاظت و اشاعت کے لئے قدرت کی طرف سے ایسے سامان ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

والد صاحب مرحوم کا یہی معاملہ تھا،[1] کہ ان کی وفات کا واقعہ اچانک پیش آیا، اس وقت گھر میں مردوں میں ایک کم سن بچہ (راقم سطور) کے سوا کوئی فرد موجود نہ تھا، جس سے وہ کچھ کہہ سن سکتے کہ ان کے مسودات کہاں ہیں؟ اور کس کتاب میں کس چیز کی ضرورت ہے؟ ان کی زندگی میں ان کے اردو کے چند رسائل ہی شائع ہو سکے تھے،[2] ان کی عربی تصنیفات کا سارا دفتر مسودات کی شکل میں ان کے مطالعہ کے کمرہ میں رکھا ہوا تھا، ان کے فرزند اکبر برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور مدراس میں تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر ان عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا[3] غیب سے جس طرح سامان کیا، وہ حیرت خیز بھی ہے، عبرت انگیز بھی، اور خاموشی سے کام کرنے والوں کے لئے حوصلہ افزا بھی ہے، اور بشارت آمیز بھی کہ وہ "اِنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی" کی تفسیر و مصداق ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حیات عبدالحئی"۔ [2] ان کے نام یہ ہیں "یاد ایام" (تاریخ گجرات) "تعلیم الاسلام" "نور الایمان" "اصلاح" "طبیب العائلہ" ("گل رعنا" بھی ان کی وفات کے بعد چھپی)۔

[3] ان کی تمام اہم عربی کتابیں الحمدللہ طبع و شائع ہو چکی ہیں، جن کے نام یہ ہیں "نزہۃ الخواطر" (۱-۸) مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد (کتاب کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں) "الثقافۃ الإسلامیۃ فی الھند" مطبوعہ "المجمع العلمی العربی" دمشق، حال میں اس کا دوسرا ایڈیشن تکملہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، "الھند فی العھد الاسلامی" دائرۃ المعارف حیدرآباد، "تہذیب الاخلاق" احادیث کا ایک مجموعہ مطبوعہ "المکتب الاسلامی" بیروت، و دولۃ الامارات قطر، حال میں فخر الدین اکیڈمی لکھنؤ نے "نزہۃ الخواطر" کے اردو ترجمہ کے لئے ایک رقم منظور کی ہے، اور الحمدللہ اس کی متعدد جلدوں کا ترجمہ ہو گیا ہے، اور کام جاری ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية

(مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش)

اسی زمانہ میں میری دوسری اہم تصنیف جس کو "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کی تکمیلی کڑی سمجھنا چاہیئے "الصراع بین الفکرۃ الإسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ" (۱۹۶۶ء میں دار القلم کویت) اضافوں اور تنقیح کے ساتھ طبع ہو کر پہونچی، اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار الفکر بیروت سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا، اس کتاب میں مصنّف نے اسلامیت و مغربیت کی مسلم ممالک میں کشمکش کی روئیداد اور اس کشمکش کے نتائج اور اس معرکہ میں مسلم ممالک کے طرز عمل اور موقف کا وسیع جائزہ لیا تھا، جو خود اس کے الفاظ میں "مسلم ممالک کا سب سے بڑا اور حقیقی مسئلہ تھا، اور اسی سوال کے جواب پر (کہ مغربی تہذیب کے بارے میں یہ ممالک کیا رویہ اختیار کرتے ہیں، اور اپنے معاشرہ کو موجودہ زندگی سے ہم آہنگ بنانے اور زمانہ کے قاہر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کون سی راہ اختیار کرتے ہیں، اور اس میں کس حد تک ذہانت وجرءت کا ثبوت دیتے ہیں) اس بات کا انحصار ہے کہ دنیا کے نقشہ میں ان مسلم اقوام کی نوعیت کیا قرار پاتی ہے، اور ان ملکوں میں اسلام کا کیا مستقبل ہے؟"

مصنف کے نزدیک یہی ایک حقیقی معرکہ اور فیصلہ کن جنگ ہے، جو اس وقت تمام اسلامی ممالک میں جو مغربی تہذیب سے روشناس ہو چکے ہیں، پورے جوش و حرارت کے ساتھ جاری ہے، اور اپنے شباب پر ہے، اس کے سوا اور دوسرے معرکے جن کی تصویر آرائی میں زور بیان صرف کیا جاتا ہے، یا فرضی ہیں یا ذیلی اور ثانوی، یہی معرکہ ان حکومتوں اور قوموں کی باہم نبرد آزمائی اور

www.abulhasanalinadwi.org

معرکہ آرائی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ ایک طرف تجدُّد پسند یا بقول خود "ترقی پسند" حکومتیں ہوتی ہیں، جو مغربی تہذیب پر اور مغربی افکار و اقدار پر ایمان لاچکی ہیں، اور ان کی پورے خلوص کے ساتھ وکیل اور علمبردار بن چکی ہیں، اور دوسری طرف وہ سادہ دل قومیں اور عوام ہیں، جن کی اسلام کے ساتھ وابستگی ختم نہیں ہوئی ہے، اور جن میں قرآن و ایمان کی زبان اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ اور عشقِ رسول ؐ کے تذکرے کے سوا کوئی زبان اور کوئی طریقہ حرارت اور جوش نہیں پیدا کرسکتا، ان میں سے اکثر مسلم حکومتوں کی جنگ بیرونی دشمن کے بجائے خود اپنے ملک کے عوام اور قوموں سے ہے، جن کو وہ اپنے اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور ملک کی مزعومہ ترقیات کے راستہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں، ان حکومتوں کے وسائل اور توانائیاں اس جذبہ (ایمانی) کو سرد کرنے اور ان کے خیال کے مطابق اس قدیم ملبہ کو (جو ان کے خیال میں از کار رفتہ ہی نہیں ملک کی زیب و زینت اور مغرب کے معیار ترقی پر پہونچنے کے راستہ میں "کوڑا کرکٹ" کی حیثیت رکھتا ہے) ہٹانے اور دور کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، اور یہ بدقسمت ممالک بے ضرورت ایک اندرونی جنگ (CIVIL WAR) اور قوت و وقت کی اضاعت، باہمی بے اعتمادی، اور خوف کی فضا سے دوچار ہیں۔[1]

مصنف نے اس سلسلہ میں ایک ایک ملک کے رویہ اور اس میں اس معرکہ کی منزلوں کا جائزہ

---

[1] شاذ و نادر اس کے برعکس بھی صورت پیش آتی ہے، وہ یہ کہ جن ممالک میں کبھی کوئی اسلام پسند قیادت ابھر آتی ہے یا حکومت اسلامی آئین کو نافذ کرنا چاہتی ہے تو وہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی (جو مغربی نظامِ تعلیم کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے) سب سے پہلے مخالفت کرتا ہے، اور ان کوششوں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا ہے، یہ بھی ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت ہے کہ مغربی نظامِ تعلیم اسلامی اصول و اقدار اور اسلامی ذہن و سیرت سے مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہے، اور وہ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

لیا ہے، اور بتایا ہے کہ بات اب کہاں تک پہونچ چکی ہے، اس کے نزدیک مغربیت کے بارے میں جو وقت کا اصل چیلنج اور عالم اسلام کے لئے ایک استفہامیہ نشان ہے مسلم ممالک کے تین ہی رویے ہو سکتے ہیں، خالص منفی اور سلبی رویہ (یعنی گویا مغرب سے لینے کی کوئی چیز نہیں اور اس کی ترقیات سے مکمل کنارہ کشی اور بے تعلقی ضروری ہے[1]) خالص مثبت وایجابی رویہ (مغربی تہذیب کو کلیۃً قبول کر لینا اور اس کو اپنے ملک میں جوں کا توں نافذ کر دینا[2]) مغربی تہذیب کے بارے میں مستقل ومجتہدانہ کردار، مغرب سے استفادہ کے صحیح میدانوں کا انتخاب اور ان کے حدود کا تعین۔

مصنف کے نزدیک پہلا رویہ ناقابل عمل اور ناکام ہے، اور جس نے اس کو ابتدا میں اختیار کیا اس کو جلد وہ راستہ چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنانے کا کام شروع کر دیا، دوسرا رویہ کسی اسلامی ملک اور قوم کے لئے غیر شایان شان اور نامناسب اور اسلامی تعلیمات وتہذیب سے بغاوت کے مرادف اور معنوی خودکشی ہے، تیسرا رویہ جس کے لئے ذہانت اور قوت ارادی ..... اور صحیح قیادت کی ضرورت ہے، اور ایک مرد کامل مطلوب ہے تنہا اسلامی ملک کو زیب دیتا ہے، اور اسی میں اس وقت عالم اسلام کی حفاظت، نئے دور کی قیادت، اور مسلمانوں کی قوت کا راز پنہاں ہے، اس کتاب میں مصنف نے مغربیت کے عالمگیر رجحان کے اسباب اور ان کا علاج بھی بیان کیا ہے۔

مصنف کی کتابوں میں یہ کتاب وقت کی ایک اہم تصنیف، عالم اسلام کے ذہین طبقہ کے لئے دعوت فکر اور موضوع مطالعہ ہے، اس کے تین ایڈیشن عربی میں اور اس کا اردو ترجمہ

---

[1] یہ رویہ کچھ عرصہ تک سعودی عرب، افغانستان، اور یمن کا (مغربی علوم اور اس کے عطیات سے امکانی حد تک فائدہ اٹھانے سے گریز) کا رہا ہے لیکن اس کے بعد پھر اس تیزی سے اس کو قبول کیا گیا کہ اس مقاطعہ کی مدت کی تلافی ہو گئی۔ [2] اس کے لئے ترکی کی مثال دی جا سکتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

(مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش) کے نام سے، اور انگریزی میں ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی کے قلم سے (WESTERN CIVILISATION ISLAM & MUSLIMS) کے نام سے شائع ہوا۔[1]

الطريق إلى المدينة (کاروانِ مدینہ)

ممالک عربیہ کے بار بار سفروں اور طویل قیام اور وہاں سے شائع ہونے والے لٹریچر کو دیکھ کر اور عربوں سے مل کر مجھے بہ شدت اس بات کا احساس ہوا کہ ممالک عربیہ کے تعلیم یافتہ طبقہ کا اس ذات گرامی سے (جو ان کی ہر طرح کی سعادت کا سرچشمہ اور سررشتہ ہے، اور جس سے ان کو دین و دنیا کی دولت اور عزت ملی) برابر مضمحل اور کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، اور جہاں موجود بھی ہے، وہاں زیادہ تر ضابطہ کا اور قانونی ہو کر رہ گیا ہے، جس میں عشق کی شوریدگی اور زندگی کی پائیدگی نہیں، عرب قوم پرستی کی تحریک نے اس کو اور زیادہ نقصان پہونچایا، اور مغربی علوم اور مادی فلسفوں کی غنیم فوجیں عجم کو چھوڑ کر اب خود عرب میں اور دور دراز اسلامی ملکوں سے قطع نظر اب اندرون حرم میں داخل ہو گئی ہیں۔

افسوس ہے کہ موجودہ ادباء میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو عربی نثر میں اس جذبہ کو اس طرح بیدار کریں، جو کبھی بوصیری[2] صاحب قصیدۂ بردہ، سیدی عبدالرحیم البرعی[3] نے اپنی زندۂ جاوید

---

[1] حال میں مسلم ممالک اور ان کی قیادتوں کی نئی تبدیلیوں، موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کتاب میں نئے مواد کا اضافہ کیا گیا ہے جن میں مصنف کے عزیز رفقائے کار محمد میاں مرحوم، مولوی محمد رابع و مولوی محمد واضح سلمہما کا تعاون شامل ہے۔ [2] پورا نام محمد بن سعید بن حماد بوصیری تھا، یہ مصر کے رہنے والے تھے ۶۹۶ھ میں وفات پائی، ان کے قصیدۂ بردہ نے وہ مقبولیت و شہرت حاصل کی جو کم قصائد نعتیہ نے حاصل کی ہوگی۔ [3] پورا نام عبدالرحیم بن احمد بن علی البرعی تھا، برع (یمن) کے رہنے والے تھے ۸۰۳ھ میں وفات پائی، ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ بڑا مشہور و مقبول رہ چکا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

نعتوں سے شاعری کے ذریعہ بیدار کیا تھا، اس ضرورت کو پورا اور محبت کی چنگاری کو فروزاں کرنے کے لئے جو ابھی عربوں کے خاکستر میں موجود ہے، یہ صورت سمجھ میں آئی کہ اقلیم محبت اور ولایت عشق کی طرف سے (دل آویز عربی مضامین اور موثر تقریروں کی شکل میں) ایک نئی سپاہ تیار کی جائے، جو عرب نوجوانوں، اہلِ قلم اور اہلِ فکر کے دلوں کو گرمائے، اور ان کو ایک عجمی کے ذکرِ رسول ؐ سے غیرت آئے، لکھنے والا اقبال کے الفاظ میں کہہ سکے ؎

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

اور عرب قارئین قرآن کے الفاظ میں کہہ سکیں "بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا"۔

میں نے جب اپنے سیرت کے مضامین اور ان تقریروں کو دیکھا جو خود عربی میں سیرت کے مختلف پہلوؤں، ذات رسول ؐ کی عظمت و محبوبیت، اور اس کے احسانات و عطیات پر عالمِ عربی میں مختلف موقعوں پر کی گئی تھیں، نیز وہ چند اردو مضامین و تقریریں جو آسانی کے ساتھ عربی میں منتقل کی جا سکتی ہیں تو اندازہ ہوا کہ آسانی سے یہ "ارمغان حجاز" تیار اور پیش کیا جا سکتا ہے، اس مجموعہ کا غالباً سب سے زیادہ طاقتور مضمون "وفود الأمة بين يدى نبيها" (امت کے وفود آقا کے حضور میں) اصلاً سعودی ریڈیو سے نشر ہونے کے لئے جدّہ میں لکھا گیا تھا، بعد میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا اور ریڈیو سے کئی بار نشر ہوا۔

جب یہ مجموعہ تیار ہو گیا تو میں نے شیخ علی الطنطاوی سے (جن کو میں اس وقت عربی کا سب سے قادر الکلام اور مؤثر ادیب سمجھتا ہوں) فرمائش کی کہ وہ اس کے اوپر مقدمہ لکھ دیں، انھوں نے کسی قدر تردد کے بعد اس پر ایسا مقدمہ لکھا جس نے کتاب کی طاقت اور

www.abulhasanalinadwi.org

قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا، انھوں نے کتاب پڑھ کر یہاں تک لکھا کہ :-

"میرا اپنے بارے میں اعتماد متزلزل ہو گیا تھا لیکن برادرم ابوالحسن! جب میں نے آپ کی کتاب "الطریق إلی المدینة" پڑھی تو میں نے محسوس کیا کہ شوق میرے اندر پھر انگڑائی لینے لگا، اور میرے سینہ میں پھر وہی تپش ہے، اس طرح پھر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا دل جوہر محبت سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے لیکن افکار زمانہ اور وقت نے اس جوہر کو گرد آلود کر دیا تھا، آپ کی کتاب نے اس گرد کو ایک بار پھر صاف کر دیا۔"

آگے لکھتے ہیں :-

"(عربی) ادب کی طرف سے بھی میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا، چونکہ (عرب) ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آیا جس کی لَے میں شریف رضی[1] کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے، جب میں نے آپ کی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا، یہ نغمہ مجھے آپ کی اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن! آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کر دیا۔"

یہ مجموعہ "الطریق إلی المدینة" کے نام سے ۱۹۶۵ء کے اخیر یا ۱۹۶۶ء کے شروع میں خود مدینہ طیبہ کے مکتبہ علمیہ سے جس کے مالک ایک بخاری عالم شیخ محمد النمنکانی تھے، شائع ہوا، پھر اس کے کئی ایڈیشن دار القلم دمشق اور بیروت سے شائع ہوئے، کتاب کے عربی مضامین کا ترجمہ حسب معمول زیادہ تر برادر زادۂ عزیز محمد میاں نے کیا، اور جو مضامین اور تقریریں

---

[1] عہد عباسی کا نامور ہاشمی شاعر جس کو بعض اہلِ ذوق اور صاحب نظر چند بلند ترین عرب شعراء میں شمار کرتے ہیں، ان کے نعتیہ کلام کا ایک مستقل مجموعہ "الحجازیات" کے نام سے موسوم ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اصلاً اردو میں تھیں وہ جوں کی توں شامل کرلی گئیں[1]، مصنف اس کتاب کو اپنی محبوب ترین کتابوں میں سمجھتا ہے اور اس کو اپنے لئے شفاعت کا وسیلہ گردانتا ہے، مصر کے ایک ریڈیو ٹیلی ویژن کے مکالمہ میں جو ایک مرتبہ مدینہ طیبہ کے ایک ہوٹل کے بالاخانہ میں ایسی جگہ ہوا تھا کہ گنبدِ خضراء سامنے تھا، میں نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کو اپنی تصنیفات میں سب سے زیادہ کس کتاب سے محبت ہے، کہا تھا کہ "الطریق إلی المدینة"۔

"نحو التربية الإسلامية الحرة" (اسلامی ممالک کے لئے آزاد اسلامی نظامِ تعلیم)

مسلم بالخصوص عرب ممالک میں تعلیم کا مسئلہ ۱۹۵۰ء سے (جب میرا پہلا مضمون "کیف توجّه المعارف فی البلاد الاسلامیة" حجاز کے واحد اخبار "البلاد السعودیة" میں نکلا تھا جس کا ذکر کتاب کے حصۂ اول میں آچکا ہے) میرا خصوصی موضوع اور دلچسپی کا میدان رہا ہے، میں شروع سے اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ ممالک اسلامیہ بالخصوص ممالک عربیہ کی موجودہ صورت حال عقائد کا تزلزل، ذہنی انتشار، اخلاقی انارکی، اور اسلام کی قائدانہ صلاحیت کے بارے میں بے اعتمادی اور اس کے مستقبل سے مایوسی اس نظامِ تعلیم کا نتیجہ یا عطیہ ہے جو مغرب سے بغیر کسی بنیادی تبدیلی اور مجتہدانہ فکر و نظر کے درآمد کیا گیا ہے، میرا شروع سے خیال رہا ہے کہ نظامِ تعلیم وہ لباس ہے جس کو اس ملت اور نسل کے قد و قامت، سائز، اس کے ماضی اور حال اور اس آب ہوا کے مطابق تیار ہونا چاہئے جس میں یہ ملت اور نسل پیدا کی گئی ہے، اور اسی میں اس کو جینا اور مرنا ہے، نیز اس میں صرف اس کے "قامت" ہی کا لحاظ ضروری نہیں "قیمت" کا بھی

---

[1] اردو ایڈیشن "کاروانِ مدینہ" کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، حال میں اس کا انگریزی ترجمہ (PATHWAY TO MEDINA) کے نام سے ڈاکٹر محمد آصف قدوائی کے ادبیانہ قلم سے مجلس کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

لحاظ ضروری ہے، اور جہاں تک ملت اسلامیہ کا تعلق ہے، اس کی "قیمت" (وزن وافادیت) اس کے "قامت" (تعداد اور سیاسی حیثیت) سے زیادہ اہم اور قابل لحاظ ہے، یہ نظام تعلیم حال کو ماضی سے اور پھر ان دونوں کو مستقبل سے مربوط کرنے کا مؤثر اور پائیدار ذریعہ ہے، اور اس کا اصل مقصد ان عقائد اور حقائق پر اس نسل کے عقیدے اور رابطہ کو نہ صرف مضبوط کرنا ہے، بلکہ ان کے لئے علمی بنیادیں اور دلائل فراہم کرنا اور ان کو صالح اور افضل ثابت کرنا ہے، جن سے اس ملت کا قوام اٹھایا گیا ہے، اور اس کو ان کا علمبردار بنایا گیا ہے، یا اس کو وہ بہرحال عزیز ہیں، اور جو نظام تعلیم اس مقصد کی نہ صرف یہ کہ تکمیل نہیں کرتا بلکہ اس کو نقصان پہونچاتا ہے (اور اس سے بھی زیادہ سنگین صورت یہ ہے کہ ان کے خلاف باغی بناتا ہے) وہ نظام تعلیم اس ملت و نسل کا سب سے بڑا دشمن، اس کی متاع عزیز کا رہزن، اور سیاسی فتوحات اور غلبے سے بھی زیادہ اس ملت کے حق میں سمِ قاتل ہے۔

میں اس موضوع پر مختلف اوقات میں تحریری و تقریری طور پر اظہار خیال کرتا رہا، میرے نزدیک ممالک اسلامیہ میں سیاسی و فوجی انقلابات، حکومتوں اور عوام کے درمیان وسیع خلیج اور ان میں عدم استقرار کا بڑا سبب یہی ہے کہ ملت کے عقائد، جذبات، احساسات اور ضروریات اور ہیں، اور ان حکومتوں کا باہر سے درآمد کیا ہوا نظام تعلیم نہ صرف یہ کہ ان عقائد و جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ ان کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہے، اور پھر اس ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے، اس طرح مسلم ممالک کی کیفیت اس سواری کی طرح ہو گئی ہے جس میں دو مخالف سمتوں میں گھوڑے جوت دیئے گئے ہیں، یا انجن فِٹ کر دیئے گئے ہیں۔

میں نے اپنے ان خیالات کا اظہار بڑی صفائی اور طاقت کے ساتھ اپنے اس خطبہ میں کیا جو میں نے سعودی وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن عبد اللہ آل الشیخ کی دعوت پر ۲۲ شعبان ۱۳۸۸ھ

www.abulhasanalinadwi.org

(۱۳ نومبر ۱۹۶۸ء) کو ریاض یونیورسٹی کے وسیع ہال میں دیا تھا، اور جس میں میں نے مغربی ماہرین تعلیم کے اقوال سے ثابت کیا تھا کہ نظام تعلیم اس تیار کردہ سامان، لباس اور سہولتوں کی طرح نہیں ہے، جو کسی ملک سے درآمد کی جاتی ہیں، اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو وہ قوم اپنے پورے قدیم ورثہ اور اپنی ملی تشخصات سے محروم ہو جاتی ہے، یا سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے، پھر میں نے عربوں کے احساسات اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے بتایا کہ اسرائیل میں دینی تعلیم اور اپنی ملی تشخصات کی حفاظت کا کس قدر اہتمام ہے، اور وہ اس بارے میں کتنا غیور اور ذکی الحس واقع ہوا ہے، میں نے "اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم" کے ایک مضمون سے (جو ایک تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں آیا تھا) ایک اقتباس پڑھ کر سنایا کہ اسرائیل میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہودی عقائد کو غذا پہونچانا اور اس کے نشوونما اور ارتقاء کے لئے کوشش کرنا اور نئی نسل کو عمر بھر اس کا وفادار رہنا سکھانا ہے، پھر میں نے ثابت کیا کہ کثیر التعداد جامعات کا قیام اور اعلیٰ تعلیم مرض کی ہرگز دوا نہیں ہے، وہ کبھی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کو اخلاقی پستی اور نفس پرستی سے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ قوموں کو قوم پرستی، نسل پرستی اور عالمگیر جنگوں سے روک نہیں سکی، پھر میں نے اخیر میں صفائی کے ساتھ کہا کہ یاد رکھنا چاہئے کہ جزیرۃ العرب کی یہ سرزمین اور یہ تمدن و ترقی اور اس سرزمین پر قائم ہونے والی حکومتیں بعثت محمدیؐ کا صدقہ اور اس کی دین ہے، اور اس سرزمین پر اسلام کو ابدی طور پر مالکانہ اور قائدانہ حقوق و اختیارات حاصل ہیں، اور یہ اپنے پورے طول و عرض کے ساتھ اس کا حرم اور اس کا قلعہ ہے، اس لئے یہاں کسی کو باہر سے درآمد کئے ہوئے فلسفوں کی تبلیغ یا ترسیخ کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اور نہ ان بنیادوں پر تیشہ چلانے کی جو صحابہ کرامؓ و داعیان و مجاہدین اسلام نے تعمیر کیں، جس "دانشور" "معلم" "مفکر" اور مصنف کو اس سے اتفاق نہ ہو وہ اس سرزمین کو خیرباد کہے،

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے لئے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے پوری دنیا پڑی ہے، یہاں اس کو اس تخریبی اور انتشار انگیز عمل کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کہ بقول اقبال ؎

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

اس تقریر کے موقعہ پر یونیورسٹی کا ہال اندر اور باہر بھرا ہوا تھا، خود عالی مرتبت وزیر تعلیم، وائس چانسلر صاحب پروفیسر صاحبان، اساتذہ و معلّمین اور طلبا اتنی بڑی تعداد میں موجود تھے، جو کم موقعوں پر ہوا کرتے ہیں، یہاں تک کہ محترم شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ نے اپنے ایک مضمون میں جو "ریاض کے پانچ دن[1]" کے عنوان سے ایک اہم سعودی اخبار میں چھپا تھا، اس پر اظہار مسرت و تعجب کیا تھا کہ یہ پروگرام غیر معمولی طریقہ پر کامیاب رہے۔

اس سلسلہ کا دوسرا اہم مضمون وہ تھا جو میں نے کویت میں ہونے والے ممالک عربیہ کے وزرائے تعلیم کی ایک کمیٹی کے لئے لکھا تھا، جو اس زمانہ کے قریب کویت میں ہو رہی تھی، اور ایک دوست نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اپنے خیالات اور تجربات لکھ کر اس کو بھیجوں۔

اس سلسلہ کا تیسرا اہم مضمون وہ تھا جو میں نے ندوۃ العلماء کے تعلیمی جشن میں اکتوبر، نومبر ۱۹۷۵ء کی ایک نشست میں پڑھا تھا، اور جس میں ممالک اسلامیہ اور بلاد عربیہ کے نہ ختم ہونے والی ذہنی کشمکش، حکومتوں اور عوام کی نبرد آزمائی اور فوجی و سیاسی انقلابات کی یہی توجیہ کی تھی کہ ان ممالک کا نظام تعلیم ملتِ اسلامیہ اور فطرتِ اسلامی سے نہ صرف یہ کہ مطابقت نہیں رکھتا بلکہ برسرپیکار ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ نہ ان ملتوں سے پورا فائدہ اٹھایا

---

[1] میرا قیام ریاض میں پانچ دن رہا تھا اور اس میں تقریباً روزانہ دو تقریریں ہوتی تھیں، اور ہر ایک میں سامعین اور حاضرین کی بڑی تعداد، اسی سلسلۂ محاضرات میں ریاض کے کلیۃ المعلمین (TRAINING COLLEGE) کی تقریر بھی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

جارہا ہے، نہ حکومتوں اور سیاسی پارٹیوں کو استقرار حاصل ہوتا ہے۔[1]

ان مضامین کا مجموعہ "نحو التربية الإسلامية الحرة فى الحكومات والبلاد الإسلامية" کے نام سے بیروت و قاہرہ سے شائع ہوا اور اس کے متعدد ایڈیشن نکلے، اس وقت ہمارے سامنے ۱۹۷۶ء کا تیسرا ایڈیشن ہے جو المختار الإسلامی قاہرہ نے شائع کیا ہے۔

"حیات عبدالحیؒ"

۱۹۶۶ء میں سیتاپور کے اسپتال سے آنے کے بعد سے ۱۹۷۰ء تک میں زیادہ تر عربی ہی میں لکھتا رہا (اور صحیح معنی میں لکھواتا رہا) اور اس وقفہ میں میری وہ تصنیفات مرتب و مکمل ہوئیں جن کا تعارف اوپر گزر چکا ہے، ۴-۵ سال کے اس وقفہ میں صرف ایک ہی اردو کتاب کی تالیف عمل میں آئی، اور وہ "حیات عبدالحیؒ" ہے، اس کے مقدمہ میں اس کی تصنیف کے محرکات و دواعی اور اس کے مقاصد و فوائد تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، اور یہ کہ کسی کم سواد لیکن کثیر التصانیف فرزند کا اپنے باکمال اور نامور باپ کی سوانح و حالات مرتب کرنا علمی و تصنیفی تاریخ میں کوئی نیا کام اور تاریخ و تصنیف کے قانون و عرف میں کوئی "بدعت" نہیں، خاص طور پر جب یہ اقدام اس شخصیت سے متعلق ہو جو اپنے عہد کے خود عظیم ترین مؤرخوں اور سوانح نگاروں میں ہو، اور

---

[1] مغربی نظام نصاب تعلیم کو مشرقی اور خاص طور پر مسلم ممالک میں جوں کا توں رائج کرنے کی بڑی دلچسپ اور چشم کشا مثال ایک مغربی ماہر تعلیم (DAN ADAMS) کی ایک کتاب میں نظر آئی، جس کا ماحصل یہ ہے کہ "ایک بندر نے جو درخت پر بیٹھا ہوا تھا، دیکھا کہ ایک غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے، وہ ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ نیچے آیا، اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا، پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے" EDUCATIONAL PATTERNS IN CONTAIN TEMPORARY SOCIETIES یہ پورا مقالہ "رود اد چمن" میں "اسلامی ملکوں میں نظام تعلیم کی اہمیت" کے عنوان سے (ص ۱۸۰ سے ص ۱۸۱) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جو ہزاروں انسانوں کے حالات وکمالات کی اشاعت وحفاظت کا ذریعہ بنا ہو۔

میں نے مناسب سمجھا کہ یہ کتاب کسی ایسے ادارہ کی طرف سے شائع ہو جس سے میرا ذاتی تعلق نہ ہو اور میں اس کے ذمہ داروں میں نہ سمجھا جاتا ہوں تاکہ مجھ پر تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اس کے ذریعہ اپنے خاندان اور بزرگوں کی تشہیر کا الزام نہ عائد ہو کہ زمانہ بڑی بدگمانی کا ہے، اتفاق سے ترکیسر گجرات میں محترمی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا ساتھ ہو گیا اور ایک ہی جگہ قیام، میں نے ان سے ذکر کیا، انھوں نے بڑے شوق واصرار سے ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے اس کے اشاعت کی ذمہ داری لی، اور اس پر اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا، میں نے یہ کتاب ان کے حوالہ کردی اور وہ نومبر ۱۹۷۰ء میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہو گئی۔

بابِ دوم

چند اہم واقعات و حوادث

ایک سنگین حادثہ اور اس سے بال بال بچنا

میں رابطہ کے اجلاس کی شرکت کے لئے جو شعبان ۱۳۸۷ھ (نومبر ۱۹۶۷ء) میں ہو رہا تھا، گیا ہوا تھا، عزیزی محمد میاں مرحوم پہلی مرتبہ میرے ساتھ گئے تھے، ہم لوگ اجلاس سے کئی روز پیشتر اکتوبر میں پہونچ گئے تھے، اور مکہ معظمہ کے ہوٹل شبرا میں مقیم تھے، وہاں ہمارے قدیم دوست اور مشہور عراقی مجاہد و داعی شیخ محمد محمود الصواف نے جو سعودی وزارت تعلیم کے مستشار بھی تھے، مجھ سے ذکر کیا کہ وزیر تعلیم معالی الشیخ حسن عبداللہ آل الشیخ تم سے غائبانہ تعلق رکھتے ہیں، اور تمہاری کتابیں اور "البعث الإسلامی" بڑے شوق سے پڑھتے ہیں، وہ آج کل طائف میں ہیں، ابھی رابطہ کے جلسے شروع نہیں ہوئے، مناسب ہے کہ تم ان سے ملاقات کرلو، ۱۳ ر رجب ۱۳۸۷ھ، ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ہم دونوں ان کی معیت میں رابطہ ہی کی گاڑی پر طائف گئے، اور ان سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی، اور بڑی اچھی مجلس رہی، انھوں نے اپنے تعلق اور مناسبت کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا، اور "البعث" کی تعریف، ملاقات سے فارغ ہو کر ہم لوگ قیام گاہ پر آگئے، دوپہر کا کھانا شیخ محمد محمود الصواف کے تعلق کے عراقی احباب کے ساتھ کھایا، عصر کے وقت طائف سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے،

www.abulhasanalinadwi.org

موٹر میں میں اور محمد میاں تنہا تھے، ہم لوگ احرام باندھ کر چلے تھے، بن لادن کی مسجد میں نماز پڑھی اور عمرہ کی نیت کی، عصر و مغرب کے درمیان چلنا ہوا تھا۔

طائف کے حدود سے ہم لوگ گزر چکے تھے، اور عرفات کے حدود ابھی شروع نہیں ہوئے تھے کہ ہم کو محسوس ہوا کہ گاڑی کھڈ میں جارہی ہے (یاد رہے کہ طائف اور مکہ کے درمیان سڑک کے کنارہ کئی جگہ گہرے کھڈ آتے ہیں) اس وقت صاف معلوم ہوا کہ ہم لوگ وادی موت کی طرف جارہے ہیں، اور اگر کسی بڑے پتھر نے راستہ میں موٹر کو روک نہیں لیا تو موت یقینی ہے، "اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ" یہی محسوس ہوتا رہا کہ موٹر پلٹیاں کھارہی ہے، ایک جگہ اچانک موٹر رکی، محمد میاں نے کہا کہ چچا میاں فوراً اتر جائیے، دیکھا تو وہ باہر کھڑے ہیں، اور مجھے اترنے کی دعوت دے رہے ہیں، ان کو خیال تھا کہ موٹر پھر اسٹارٹ ہوجائیگی، اور ہم لوگ نکل نہیں سکیں گے، میں کھڑکی سے باہر نکلنے لگا تو ڈرائیور نے جو سیٹ کے نیچے پڑا ہوا تھا، میری طرف مخاطب ہوکر کہا "یا شیخ هل أنت حيٌّ؟" (مولانا کیا آپ زندہ ہیں؟) میں نے کہا، ہاں! الحمد للہ! میں کھڑکی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ موٹر بالکل الٹی پڑی ہے، چھت نیچے اور چاروں پہیے اوپر، میں الحمد للہ باوضو تھا، اور ہاتھ میں تسبیح تھی، نہ احرام کھلا تھا نہ تسبیح ہاتھ سے چھٹی تھی، حیرت ہوئی کہ موٹر کے الٹنے کے بعد ہم لوگ سیٹ سے کیسے نہیں گرے، اور کھڑکی سے کیسے نکل سکے؟ یہ سب ایک ایسے ڈرامائی انداز میں ہوا گویا ہم نے خواب دیکھا تھا، سڑک پر گذرنے والی موٹریں یہ منظر دیکھ کر ٹھہر جاتیں، اور ان کے مسافر پوچھتے هل انتم أحياء؟ (کیا تم زندہ ہو؟) قریب ہی پولیس کی ایک چوکی تھی، ہم لوگ وہاں گئے، طائف ہی کے وضو سے مغرب کی نماز پڑھی اور وہیں سے رابطہ کے دفتر کو ٹیلی فون کیا کہ دوسری گاڑی بھیج دی جائے، دوسری گاڑی ملنے پر ہم لوگ مکہ معظمہ آئے، پہلے پولیس کی چوکی پر رپورٹ لکھوائی کہ

www.abulhasanalinadwi.org

حادثہ میں ڈرائیور کی کوئی غلطی نہ تھی (تاکہ وہ ماخوذ نہ ہو) اندازہ ہوتا ہے کہ ڈرائیور کی موٹر چلاتے وقت آنکھ لگ گئی، حجازی ڈرائیور عموماً رات کو جاگتے ہیں، اور چائے پی پی کر غنودگی کو دور کرتے ہیں، شاید ڈرائیور کو وقت پر چائے نہیں ملی تھی، بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس حادثہ میں موت سے بال بال بچا لیا" وَلٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ"[1] (لیکن اللہ تعالیٰ نے بچا لیا)

مکہ معظمہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تھوڑی دیر پہلے پہونچے ہیں، (وہ اس وقت رابطہ کے رکن ہو گئے تھے) اور پاس کے کمرہ میں ہیں، کھڑکی سے نکلتے وقت میری پسلی پر تھوڑا سا اثر تھا، جس کی وجہ سے مجھے چلنے میں تکلف ہوتا تھا، مولانا سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ اس کا بڑا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ آپ حرم شریف میں ہمارے جنازہ کی نماز میں شرکت کرتے، اللہ نے بال بال بچا لیا، رات ہی کو محترمی ڈاکٹر وحید الزماں صاحب حیدرآبادی نے الزاہر کے اسپتال میں لے جا کر جہاں وہ کام کرتے تھے، طبی معائنہ کرایا اور اکسرے لیا، معلوم ہوا کہ کوئی قابل فکر بات نہیں ہے، اور فریکچر نہیں ہوا، مکہ معظمہ کے جن دوستوں اور بزرگوں نے اس حادثہ کو سنا وہ عیادت کو آئے ان میں مفتی سید امین الحسینی صاحب بھی تھے، جن کو اس کی تفصیل معلوم ہو چکی تھی، انھوں نے کہا کہ آپ تو حضرت یونسؑ کی طرح شکم ماہی سے صحیح سلامت نکلے، جن لوگوں نے موٹر کو اس ہئیت میں دیکھا وہ تعجب کرتے تھے کہ اس کے مسافر کیسے زندہ رہے، حضرت شیخ الحدیث نے اس حادثہ کی اطلاع احباب کو دی، اور دعا کی ہدایت کی، اخبار "دعوت" میں بھی یہ اطلاع شائع ہوئی، حجاز سے واپسی پر بھی بہت عرصہ تک جسم کے اس حصہ میں چوٹ کا اثر رہا،

---

[1] الانفال۔ ۴۳

www.abulhasanalinadwi.org

شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب[1] نے ایران سے آئی ہوئی مومیائی استعمال کے لئے دی، حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب نے بھی مالش کے لئے تیل بھیجا، کچھ عرصہ کے بعد یہ اثر جاتا رہا، الحمد للہ محمد میاں بالکل محفوظ ہے، اور ان کو کسی قسم کی چوٹ نہیں آئی۔

والدہ صاحبہؒ کی وفات

اگست ۱۹۶۸ء میں میری زندگی کا وہ واقعہ پیش آیا جس کو دیر سویر پیش آنا تھا کہ بقول شاعر ؎

بہ گیتی گر کسے پایندہ بودے

ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

والدہ صاحبہؒ کی عمر ۹۳ سے متجاوز ہو رہی تھی، اور واقعہ فاجعہ کا پیش آنا ہر وقت توقع اور قیاس کے مطابق تھا، لیکن محبت اور تعلق خاطر منطق اور ریاضیات کے تابع نہیں ہوتا، اولاد کے لئے یہ واقعہ جب بھی پیش آئے، دل و دماغ کو ہلا دینے والا صدمہ ہے، اور اولاد جس عمر میں بھی ہو اس کو ماں باپ کے سائے کے اٹھ جانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

---

[1] یادش بخیر شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب مرحوم لکھنؤ کے نامی طبیب، علوم دینیہ کے فاضل لکھنؤ کی تہذیب و زبان کا نمونہ (خصوصاً ضلع جگت اور مناسبت لفظی) اور قدیم لکھنؤ کے زبان دانوں کی یادگار، اردو، عربی، انگریزی کی گفتگو پر قادر، لکھنؤ کے قدیم کشمیری خاندان کے نامور فرد تھے، جس کے افراد اودھ کی سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہ چکے تھے، ان کے والد خواجہ قطب الدین احمد صاحب کا قائم کیا ہوا "نامی پریس" لکھنؤ میں مشہور و معروف ہے، حکیم صاحب میرے خاص کرم فرماؤں اور محبین و مخلصین میں تھے، ۲۹ اپریل ۱۹۸۱ء میں انتقال کیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ و غفر لہٗ۔

www.abulhasanalinadwi.org

جیسے وہ کم سن بچے ہیں، اور یتیمی کا داغ لگا ہے۔

۲۳ اگست ۱۹۶۸ء کو وہ بیماری کے ایک ہلکے حملہ سے سنبھلی تھیں کہ میں نے عرض کیا کہ دہلی اور بھوپال کے ایک سفر کی ضرورت ہے لیکن سب سے مقدم آپ کی خوشی اور رضامندی ہے، میں نے معذرت کا خط بھی دہلی لکھ دیا تھا لیکن ان کی طبیعت میں افاقہ دیکھ کر پھر سفر کا خیال پیدا ہوا، یہ ان کے لئے سب سے بڑا مجاہدہ تھا لیکن انھوں نے اپنے کو سنبھال کر جواب دیا کہ "اللہ نے تم کو جس کام کے لئے پیدا کیا اس کے لئے جاؤ" مگر کب تک آجاؤ گے؟ میں نے کہا کہ اگلے جمعہ کو ضرور ورنہ سنیچر میں تو فرق نہیں ہوگا، فرمایا اچھا جاؤ، چلتے وقت معمول کے مطابق رخصت کیا اور الفاظ قرآنی اور ادعیۂ ماثورہ پڑھیں۔

۲۸ اگست کی صبح کو عزیزی محمد ثانی مرحوم کا تار بھوپال میں ملا کہ "نانی صاحبہ کی طبیعت اچھی نہیں ہے آپ جلد واپس آجایئے" جس پریشانی کے عالم میں وہاں سے واپسی ہوئی، خدا وہ پریشانی پھر نہ دکھائے، سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ میں ان کی زندگی میں پہونچ جاؤں، بھائی صاحب کی تدفین میں نہ شریک ہونے کا داغ عمر بھر رہے گا، اللہ نے فضل فرمایا کہ میں پنجشنبہ ۲۹ اگست کی صبح کو رائے بریلی پہونچا، معلوم ہوا کہ میری روانگی کے ایک روز بعد ہی رات کو جب تہجد کے لئے اٹھیں اور پیشاب کے لئے چوکی پر بٹھایا گیا تو اندھیرے اور نیند میں اندازہ نہیں ہوا، ہاتھ چھوڑ دیا گیا تو وہ گر گئیں، شانہ اور کلائی کی ہڈی پر ضرب آئی، تار سے ان کو میری روانگی کی اطلاع ہو چکی تھی، اور اس سے ان کو بڑی خوشی ہوئی تھی، میں جب پہونچا تو فرمایا کہ آدھی قوت آگئی، سلام کیا، قریب بلایا اور فرمایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ "میرے جسم کے روئیں روئیں سے اللہ کی حمد و ثنا نکل رہی ہے، اور عجیب سرور و ذوق ہے" میں نے کہا یہ خواب تعبیر کا محتاج نہیں، بہت مبارک ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سنیچر کی رات بے چینی سے گذری، ظہر کی نماز ہوش و حواس کے ساتھ پڑھی اور انگلی پر ذکر شروع کر دیا، اس کے بعد ہی سفر آخرت کی منزل شروع ہو گئی، اپنی تینؔ مرحوم بہنوں کا نام لے کر کہا کہ وہ لکھنؤ آ گئی ہیں، (اس کے بعد ان کو اتنی ہی دیر لگی جتنا لکھنؤ سے رائے بریلی آنے والے مسافر کو لگتی ہے) اس کے بعد ہی نزاع کی کیفیت شروع ہو گئی، سانس سے اسم ذات اللہ اللہ کی آواز آنے لگی، جب یہ آواز موقوف ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہم سب لوگوں کو چھوڑ کر اپنے اس خالق و مالک کے پاس پہونچ گئیں جس کا ساری عمر نام لیتی اور اس کے درِ رحمت پر دستک دیتی رہیں، انتقال کے بعد والی رات عجیب رحمت و برکت کی رات معلوم ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سکینت کا شامیانہ سروں پر تنا ہوا ہے کوئی وحشت اور بے رونقی نہیں تھی، میں سحر کے وقت ذکر و دعا کے ساتھ انھیں کے اشعار پڑھتا رہا، جو حسب ذیل ہیں ؎

تیرا شیوہ کرم ہے اور مری عادت گدائی کی
نہ ٹوٹے آس اے مولیٰ تیرے در کے فقیروں کی

ادھر بھی ابر رحمت آئے اور جم جم کے یوں برسے
کہ ہو سرسبز کھیتی ہم غریبوں بد نصیبوں کی

خزاں میں بھی شجر سرسبز ہو کر پھول پھل لائیں
ہو شہرت باغباں کی باغ کی غنچوں کی پھولوں کی

اگلے روز اتوار، ۷ جمادی الآخرۃ ۱۳۸۸ھ (یکم ستمبر ۱۹۶۸ء) کو صلحاء، علماء، طلبہ، اور تبلیغی جماعت کے ایک بڑے مجمع نے نماز جنازہ پڑھی، اور وہ اپنے باکمال شوہر و رفیقِ زندگی سے پورے ۴۷ سال کی مفارقت کے بعد جا ملیں، اور حضرت شاہ علم اللہؒ کی زوجہ محترمہ کی پائینتی اسی حظیرہ میں جس کو خاندان میں "روضہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ہمیشہ کے لئے آسودۂ خاک ہو گئیں[1]، سراپا شفقت ماں کی جدائی ہر لڑکے کے لئے صدمۂ جانکاہ ہے لیکن میرے لئے ایک بڑا خسارہ بھی تھا کہ والد صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی زندگی کا بڑا مشغلہ اور وظیفہ

---

[1] مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کا مستقل رسالہ "ذکر خیر" یا ماہنامہ "رضوان" کا خاص نمبر بابت نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء

www.abulhasanalinadwi.org

میرے لئے دعا کرنا تھا، فرماتی تھیں کہ میں تمہارے لئے روز استخارہ کی نماز پڑھتی ہوں کہ تمہاری خدا کی طرف سے صحیح رہنمائی ہو، اور تم سے کوئی غلط کام نہ ہو، اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائے اور انھوں نے نثر و نظم میں جو دعائیں کیں[1]، ان کو قبول فرمائے اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔

ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفے کی کوشش اور اس کی نامنظوری اور دارالعلوم میں اسٹرائک

آنکھ کے پے در پے آپریشنوں کے بعد سے میری صحت میں بڑا انحطاط آگیا تھا، جو عام طور پر آنکھ کے آپریشن کے بعد ہو جایا کرتا ہے، ادھر ضعف بصارت نے اور بھی لکھنے پڑھنے کے کام اور جزئیات سے واقف اور ان پر حاوی ہونے کو مشکل بنا دیا تھا، دوسری طرف دارالعلوم وسعت و ترقی کے راستہ پر گامزن تھا، اور اسی کے ساتھ منتظمین اور خاص طور پر ناظم کی ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی تھیں، میرا یہ احساس تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا کہ صحت و بصارت کی اس کیفیت، تصنیفی مشغولیت اور سفروں کی کثرت کے ساتھ ندوۃ العلماء کی نظامت احساسِ ذمہ داری اور فرض شناسی کے خلاف ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۶۹ء کو ندوۃ العلماء کا جلسۂ انتظامی ہونے والا تھا، میں نے اپنی سبکدوشی کا فیصلہ کر لیا، اور اپنی رپورٹ میں پورے الحاح کے ساتھ بار نظامت سے سبکدوش کئے جانے کی خواہش کا مخلصانہ اظہار کیا، اور عرض کیا کہ اس وقت دارالعلوم کو ترقی ہی دینے کے لئے نہیں اس کے موجودہ نظام کو قائم رکھنے کے لئے بھی زیادہ انہماک، مستعدی، بیدار مغزی اور زندہ دلی کی

---

[1] دعائیہ اشعار اور مناجاتوں کا جامع مجموعہ "باب رحمت" ہے جو ۱۹۲۵ء ہی میں بھائی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ "نامی پریس لکھنؤ" سے شائع ہو گیا تھا، بعد میں میں نے اس کا انتخاب "کلید باب رحمت" کے نام سے کیا جو مکتبۂ اسلام کی طرف سے ان کی زندگی میں شائع ہو گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

ضرورت ہے، جو میری اپنی صحت و حالات کی موجودہ کیفیت کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا، اس لئے فضلائے ندوہ ہی میں سے اب کسی موزوں شخصیت کا اس کام کے لئے انتخاب کرنا چاہئے، مگر میرے اصرار و الحاح کے باوجود مجلس نے اس سے اتفاق نہیں کیا، برادر محترم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے (جن کا میں سب سے زیادہ لحاظ کرتا تھا) مجھے شاہ علم اللہ صاحب کی مسجد میں بٹھا کر کہا کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کے بجائے میں جماعت میں سب سے بڑا ہوں اور ان کا جانشین ہوں، میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اس ذمہ داری کو قائم رکھو اور عہدۂ نظامت سے استعفا نہ دو، اور اس تعلق کو باقی رکھو، میری کمزوری یا ضرورت سے بڑھی ہوئی مروت یا قحط الرجال کہ میں نے ان کے احترام میں اس مشورہ کو قبول کر لیا اور یہ حیثیت ابھی تک باقی ہے۔

اس واقعہ کو آٹھ مہینے گذرے تھے کہ مئی ۱۹۷۰ء میں دار العلوم میں اسٹرائک کا واقعہ پیش آیا، اس واقعہ کی اطلاع مجھے دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ملی جہاں اس وقت آیا ہوا تھا، اتفاق سے جب یہ خبر پہونچی تو مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مرحوم اس وقت وہیں تشریف رکھتے تھے، جو چند گھنٹے پہلے میرے مختصر کتاب خانہ کی بعض کتابیں دیکھنے آئے تھے، میں موٹر سے ان کی ہمرکابی میں لکھنؤ واپس ہوا، جس پر وہ آئے تھے۔

میرے دور نظامت میں اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا، اسٹرائک نے جلد سنگین شکل اختیار کر لی، معاملہ اور آگے بڑھ سکتا تھا، مگر عزیزی سید اسد حسین ایڈوکیٹ[1] کی مدد اور بروقت پولیس کے آجانے سے جلد قابو میں آگیا، طلباء کے مطالبات جن میں سے بنیادی مطالبہ (گرمی کی وجہ سے) امتحان کے التواء اور دار العلوم میں چھٹی کر دینے کا تھا جبکہ امتحان کے بعد جس کی

---

[1] وہ محترمی سید اصغر حسین صاحب نگرامی ایڈوکیٹ رکن انتظامی ندوۃ العلماء کے چھوٹے صاحبزادے تھے، بڑے متعدد ملی کاموں میں حصہ لینے والے، اسلامیہ کالج لکھنؤ کے سابق منیجر اور شہر کے وکیل، افسوس ہے کہ ۱۴ شعبان ۱۴۰۴ھ (۱۶ مئی ۱۹۸۴ء) کو ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

تاریخیں قریب تھیں، چھٹی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور یونیورسٹی وغیرہ اداروں میں اگلی چھٹی شروع نہیں ہوئی تھی، اس نے میرے دل و دماغ اور اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، میں نے حضرت شیخ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ والدہ صاحبہ کی وفات کا صدمہ زیادہ ہوا یا اس ناشدنی واقعہ کا" ہنگامہ فرو ہونے اور ضروری انتظامی کارروائی ہونے کے بعد جلسۂ انتظامی بلایا گیا، جس میں میں نے واقعہ کی نوعیت، اس کے اسباب اور اس کی روشنی میں غور طلب مسائل اور آئندہ کے اقدامات پر واقعہ کے پورے سیاق و سباق میں روشنی ڈالی اور اس انقلاب حال کی طرف اشارہ کیا جو مقاصد کی تبدیلی کی وجہ سے اب مدارس عربیہ میں رونما ہو گیا ہے، اس اسٹرائک کے سلسلہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین اور مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی سابق مہتمم دارالعلوم نے بڑی اخلاقی امداد کی، عزیزی مولوی محمد رابع ندوی نے بڑی مستعدی اور بیدار مغزی سے ان طلباء کے ساتھ معاملہ کرنے میں انتظامیہ کی مدد کی جو (اختلاف درجات کے ساتھ) اس ہنگامہ میں شریک تھے، مولانا عمران خاں صاحب میرے اس تاثر کو دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے، اور میری تسکین و تقویت کا سامان کیا۔

حیدرآباد کا ایک سفر

حیدرآباد میں جامعہ نظامیہ کے نام سے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صاحب مرحوم استاد میر عثمان علی خاں نظام دکن کا قائم کیا ہوا مشہور و معروف دارالعلوم ہے، پولیس ایکشن کے بعد وہ ایچ، ای، ایچ، دی نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ فنڈ، حیدرآباد کے ماتحت آگیا، جس کے صدر عالی مرتبت نواب مفخم جاہ بہادر تھے، اس ٹرسٹ نے جامعہ نظامیہ کے امور و مسائل پر غور کرنے، اس کو زیادہ مفید و مؤثر بنانے اور اس کو ترقی دینے کے لئے مناسب تجاویز و سفارشات

www.abulhasanalinadwi.org

پیش کرنے کے سلسلہ میں جنوری ۱۹۶۸ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کے ارکان میں محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری قاسمی استاد جامعہ باقیات الصالحات ویلور، مولانا عبدالحمید صاحب شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ، افضل العلماء مولوی محمد حسین صاحب ایم۔اے پرنسپل اسلامیہ کالج کرنول تھے، کمیٹی کی صدارت کے لئے میرا انتخاب کیا گیا، میں عزیزان محمد حمزہ حسنی سلمہ اور علی آدم ندوی افریقی کی معیت میں جنوری ۱۹۶۸ء کی آخری تاریخوں میں عازم حیدرآباد ہوا، یکم فروری ۱۹۶۸ء سے کمیٹی نے اپنی مجالس کا سلسلہ شروع کیا، جو تقریباً ایک ہفتہ جاری رہا، میں نے تمام معلومات، کاغذات، بیانات اور مشورہ کی روشنی میں نصاب ونظام اور طریق کار سے متعلق ایک مفصل رپورٹ پیش کی، جو پروفیسر محمد نصیب خاں صاحب مرحوم صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ کے بنگلہ پر لکھوائی، جس میں صرف ضروری اور فوری اصلاحات وترمیمات کا مشورہ دیا، تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ حد تک قابل قبول اور قابل عمل ہو، ایک روز نواب مفخم جاہ بہادر نے اپنی رہائش گاہ پر ارکان کمیٹی کی دعوت بھی کی، جس میں کمیٹی کے سکریٹری محترمی سید صابر علی صاحب اور مرکزی وزیر الحاج محمد یونس سلیم صاحب بھی شریک تھے۔

ارکان کمیٹی نے باہمی اعتماد اور تعاون کی اچھی فضا میں یہ خدمت انجام دی تھی، جو فاضل عالی مرتبت مولانا ابوالوفاء افغانی صاحب حیدرآبادی کے لئے بھی اطمینان بخش ثابت ہوئی، جو قدیم درس کے پرجوش وکیل، اور ہر جدید چیز کے اختیار کرنے کے مشورہ سے متوحش تھے، اور جو اس کمیٹی کی تشکیل پر اپنے اندیشوں کا اظہار کر چکے تھے، ان کو جب تفصیلات معلوم ہوئیں اور رپورٹ کو محتاط اور متوازن پایا تو اپنی پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار فرمایا، لیکن افسوس ہے کہ اس سب کے باوجود غالباً جامعہ ہی کے بعض اساتذہ اور قدیم حلقہ کے

www.abulhasanalinadwi.org

متشددین کی مخالفت کی وجہ سے ان سفارشات پر بالکل عمل نہیں ہو سکا، اور ... وقت اور مال کا جو اس پر صرف ہوا کوئی مفید مصرف نہیں نکل سکا، افسوس ہے کہ یہ تجربہ بہت سے قدیم اداروں میں ہو چکا ہے اور اکثر اس موقعہ پر لسان العصر میر اکبر حسین اکبر الہ آبادی کا شعر یاد آتا ہے ؎

یہاں یہ ضد ہے کہ لنڈھی چھو نہیں سکتے
وہاں یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحئ مے لا

اس سفر کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ واپسی میں میں نے رفیق محترم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کو تار دے دیا تھا کہ فلاں تاریخ کو میں بھوپال سے گذروں گا رات وہاں رہ کر صبح گوالیار کے لئے روانہ ہو جاؤں گا، لیکن تقدیری بات کہ گاڑی حیدرآباد سے بہت لیٹ چلی اور لیٹ ہوتی چلی گئی اور بجائے بھوپال رات کے ۸ بجے پہونچنے کے وہ نصف شب میں ۲ یا ۳ بجے پہونچی، مجھے خیال تھا کہ مولانا عمران خاں صاحب نے ٹیلی فون سے دریافت کر لیا ہوگا اور جب معلوم ہوا ہوگا کہ گاڑی غیر معمولی طور پر لیٹ ہے تو اسٹیشن آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہوگا، جب بھوپال کا اسٹیشن آیا تو میں احتیاطاً اٹھ کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ ان کا کوئی قاصد پیغام لے کر تو نہیں آیا، میری نظر مولانا کے صاحبزادہ رضوان سلمہ پر پڑی میں نے گھبرا کر پوچھا کہ مولانا تو نہیں آئے؟ انھوں نے کہا کہ مولانا تو کیا حضرت صاحب (حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی پیر نہنے میاں صاحب) بھی تشریف رکھتے ہیں، میں نے کہا کہ حضرت پیر صاحب؟ کہنے لگے کہ ہاں! جب گاڑی لیٹ ہوئی تو لوگوں نے بہت کہا کہ آپ تشریف لے جائیں، لیکن انکار کر دیا، اور فرمایا کہ جس کو جانا ہو چلا جائے میں تو رہوں گا، اتفاق سے ژالہ باری یا کسی اور وجہ سے ان دنوں سردی بھی تیز ہو گئی تھی،

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت اسی طرح پلیٹ فارم پر رہے، اتنے میں میں نے دیکھا کہ حضرت تشریف لا رہے ہیں، کھڑکی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے، دو خادم سہارا دیئے ہوئے تھے، میں شرم و ندامت سے پانی پانی ہو گیا، میں نے کہا کہ حضرت نے کیوں اتنی تکلیف فرمائی؟ فرمایا کہ میری رات تو ایسی مبارک گزری کہ کم راتیں ایسی گزری ہوں گی، (او کما قال) اتنے میں اور مجمع بھی آگیا، مجھے حکم دیا کہ میں اپنی سیٹ سے نہ اتروں، فرمایا کہ آپ سفر کر کے آرہے ہیں، اور خود بدولت کھڑے رہے، الحمد للہ کہ گاڑی چلی اور میں ان بزرگوں کے اخلاق عالیہ، تواضع و ایثار، خورد نوازی کو یاد کر کے ورطۂ حیرت میں ڈوبا رہا، اور آج بھی جب خیال آتا ہے تو حیران رہ جاتا ہوں۔

ایک یادگار سفرِ حجاز

یوں تو الحمد للہ رابطہ اور جامعہ اسلامیہ کے بہانہ سے تقریباً ہر سال ایک دو بار حجاز حاضری ہوتی تھی[1] لیکن ۸ صفر ۱۳۸۹ھ (۲۶ اپریل ۱۹۶۹ء) کا سفر حجاز جو جامعہ اسلامیہ کی کمیٹی (المجلس الاستشاری) میں شرکت کے لئے کیا گیا تھا، اس حیثیت سے یادگار ہے کہ وہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی ہم رکابی میں کیا گیا، گویا بقول استاد مؤمن۔ ؎

مؤمن چلا ہے کعبہ کو ایک پارسا کے ساتھ

---

[1] سوائے ۱۹۶۶ء کے کہ اس میں میرا پاسپورٹ حکومت ہند نے رکھ لیا تھا اور اس کی وجہ سے میں اس سال مقدیشو (صومالیہ) میں ہونے والی موتمر اسلامی میں شریک نہیں ہو سکا تھا جس کی مجلس انتظامی کا رکن تھا، حکومت ہند نے میرے بجائے اپنے ایک معتمد نمائندہ کو بھیجا تھا جس کے متعلق مؤتمر کے سکریٹری نے کہا کہ یہ ناخواندہ مہمان ہیں، ہم نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بلایا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس سفر میں عزیزان گرامی مولوی قاضی معین اللہ ندوی اور مولوی سعید الرحمٰن ندوی مدیر رسالہ "البعث الاسلامی" بھی ساتھ تھے، ۸ صفر کو دہلی سے ہوائی جہاز سے بمبئی کے لئے اور وہاں چند دن قیام کرکے براہ کراچی جدہ کے لئے روانگی ہوئی، میں نے حضرت شیخ کے مدینہ اور صاحب مدینہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے تعلق کا کچھ اندازہ اس سفر سے کیا، راستہ میں جب حسب معمول ہوائی جہاز کی طرف سے کھانے کی کوئی چیز پیش کی گئی، اور میں نے حضرت شیخ کی طرف جن کے پہلو میں میں بیٹھا ہوا تھا بڑھایا، تو انھوں نے فرمایا کہ مولوی صاحب میرا روزہ ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ نے مدینہ طیبہ کی اس حاضری کے شکرانہ میں دو مہینے کے روزہ کی نیت کر رکھی ہے، اس کا سلسلہ مدینہ طیبہ کے قیام میں جاری رہا، شیخ اقدام مبارکہ میں جہاں ان کے بیٹھنے کا معمول تھا، کھجور اور زمزم سے افطار کر لیتے، پھر عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد نور تشریف لے جاتے، میں آگے کی سیٹ پر ساتھ ہی بیٹھتا، رات کے کھانے سے فارغ ہوکر اپنی قیام گاہ (بستان نور ولی باب التمار) میں آتا۔

مدینہ طیبہ سے حضرت شیخ کی معیت ہی میں جامعہ کی گاڑی پر جو مدینہ طیبہ میں مجھے دی گئی تھی مکہ معظمہ آئے، راستہ میں اور وہاں کے قیام میں حضرت شیخ کی شفقت، میری راحت اور آنکھ کی تکلیف کی وجہ سے خصوصی اہتمام کے ایسے نمونے دیکھے جو پدرانہ اور سرپرستانہ شفقت کو یاد دلاتے تھے۔

انگلستان کا تیسرا سفر

مدینہ طیبہ کے قیام میں جبکہ مجلس استشاری کے جلسے ہو رہے تھے مفتی سید امین الحسینی صاحب نے جو مجلس کے رکن تھے، ایک دن مجھ سے کہا کہ میں تم سے الگ کچھ بات کرنا چاہتا ہوں،

www.abulhasanalinadwi.org

میں نے عرض کیا کہ میں فندق التیسیر[1] میں آجاؤں گا، انھوں نے فرمایا کہ نہیں، میں خود تمہاری قیام گاہ پر آنا چاہتا ہوں، میں نے وقت بتا دیا، مفتی صاحب اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ (جو سیاسی حالات کی بنا پر ان کے ساتھ رہا کرتا تھا) بستان میں تشریف لائے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ تمہاری بصارت کی یہ کیفیت دیکھ کر ہم سب کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، تمہیں ایک مرتبہ لندن کا سفر کرنا چاہئے اور وہاں کے ماہر سرجنوں کو دکھانا چاہئے کہ کیا گذشتہ آپریشن کا جو ناکام رہا کچھ تدارک ہو سکتا ہے، میں نے کہا انشاء اللہ اس کا خیال رکھوں گا اور کسی سفر سے فائدہ اٹھاؤں گا، فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ ہم تم بنی اعمام[2] ہیں، تمہیں مجھ سے کوئی تکلف نہیں کرنا چاہئے، یہ کہہ کر ڈالر کی شکل میں ایک رقم نکالی، فرمایا کہ اس وقت تو اس کو لے لو، مزید جو خرچ ہوگا وہ میرے ذمہ ہے، اور یہ میں اپنی ذاتی رقم میں سے پیش کر رہا ہوں، کسی قومی یا ملّی فنڈ سے نہیں، میں نے معذرت کی، مگر انھوں نے اصرار کیا، میں نے کہا کہ اس کو آپ فی الحال اپنے پاس رہنے دیجئے، میں غور اور مشورہ کر کے عرض کروں گا، فرمایا، نہیں میں اس کو واپس نہیں لے جاؤں گا، اس کو یہیں رکھ لو، میں نے مجبور ہو کر اس کو اپنے پاس ڈال لیا۔

پہلی فرصت میں میں نے حضرت شیخ سے جو مدینہ طیبہ ہی میں موجود تھے، اس کا ذکر کیا، اور ان کی رائے دریافت کی، فرمایا کہ اس میں تمہارے اشراف نفس کو تو کوئی دخل نہ تھا، اس لئے اس کو قبول ہی کر لو، یہ رقم پورے سفر اور وہاں آکر آپریشن کی ضرورت پیش آتی تو اس کے لئے کافی نہ تھی، تقدیری بات کہ انھیں دنوں میں ڈاکٹر سعید رمضان کا دعوت نامہ پہونچا کہ جون کی فلاں تاریخوں میں اسلامک سنٹر جنیوا کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہے، آپ ضرور آئیں،

---

[1] مسجد نبوی سے قریب جانب شمال و مشرق مدینہ طیبہ کا ایک بڑا ہوٹل جس میں جامعہ کے اور حکومت کے اہم مہمان ٹھہرا کرتے تھے۔ [2] اپنے حسینی اور میرے حسنی ہونے کی طرف اشارہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

ٹکٹ کا انتظام بلعمش[1] صاحب کریں گے، میں نے سمجھا کہ استخارہ راست آیا، حضرت شیخ بھی بہت خوش ہوئے اور میں نے انگلستان کے سفر کا عزم کر لیا، مولوی معین اللہ صاحب کو اپنے رفیق سفر کے طور پر لیا اور ۶ / جون ۱۹۶۹ء کو جدہ سے جنیوا کے لئے روانہ ہوا، میرے عزم سفر کو سن کر عزیز گرامی مولوی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی (جن کے یہاں لندن میں میرے پہلے سفر انگلستان (۱۹۶۱ء) کے موقعہ پر قیام رہا تھا) نیز مجی اشفاق شیخ ٹیلی فون انجینیر جدہ اور داماد حاجی ارشد صاحب مرحوم نے بھی معیت کا ارادہ کر لیا اور ساتھ ہو گئے، اور اس طرح سفر ہر طرح سے دلچسپ اور خوشگوار بن گیا۔

جنیوا چند دن ٹھہر کر وسط جون میں ہم لوگ لندن پہونچے، وہاں عزیزی مسرور احمد لکھنوی کے یہاں قیام کیا، جو کئی سال سے لندن میں مقیم تھے، اور انھوں نے وہاں مسلم ویلفیر سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔

یہ لکھنا رہ گیا کہ انھیں دنوں میں ڈاکٹر محمد عبدالجلیل صاحب فریدی مرحوم کا لندن میں قیام تھا، مجھے مکہ معظمہ میں معلوم ہوا کہ وہ عنقریب ہندوستان واپس جانے والے ہیں، میں نے ان کو تار دیا کہ آپ میرا انتظار کریں، میں آرہا ہوں، انھوں نے از راہ محبت و اخلاص اس کو قبول کیا، اور واپسی ملتوی کر دی، لندن پہونچ کر ڈاکٹر مظہر علی خاں مرحوم کے ذریعہ جو مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، لندن کے دو ماہر سرجنوں MR. H.B. STALLARD اور MR. JOHN WINTANLEY سے وقت مقرر ہوا، ڈاکٹر فریدی صاحب مرحوم نے ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے نوٹ تیار کیا جس میں مرض کی پوری تاریخ تھی، اور ساتھ گئے، انھوں نے آنکھ کا معائنہ کرنے کے بعد کسی آپریشن کے ذریعہ نظر کے واپس

---

[1] جدہ کے ایک حضرمی تاجر جو ڈاکٹر سعید رمضان کے دوست اور نمائندہ تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہونے کی امید ظاہر نہیں کی، دائیں آنکھ کا آپریشن ممکن تھا، لیکن ابھی وہ تیار نہ تھی، البتہ انھوں نے ایک ایسی دوا تجویز کی جس کے ڈالنے سے آپریشن شدہ آنکھ کا ٹینشن بند ہوجاتا ہے اور فوری سکون ملتا ہے، اس سفر کا طبی طور پر یہی فائدہ ہوا۔

اس سفر میں انگلستان کا ایسا طویل دورہ کیا گیا، جو اس سے پہلے اور اس کے بعد نہیں ہوسکا، جن مقامات پر جانا ہوا اور ان کے نام اس وقت یاد ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

برمنگھم، مانچسٹر، بلیک برن، شیفیلڈ، ڈیوزبری، لیڈس ہر جگہ مسلمانوں کو خطاب کرنے کی نوبت آئی، اور دعوتی تقریریں ہوئیں، جن میں انگلستان کے مقیم مسلمانوں کو اپنا دعوتی فرض انجام دینے، اپنی افادیت ثابت کرنے، اور اپنی خصوصیات اور جدید نسل کے دین و مذہب کو محفوظ رکھنے کے لئے مشورے دیئے گئے[1]، اور اس طرح یہ سفر اور قیام طبی سے زیادہ دعوتی، اور شخصی سے زیادہ جماعتی بن گیا، یونیورسٹیوں میں سے برمنگھم یونیورسٹی، اور لیڈس یونیورسٹی کے ہال میں مسلمان طلباء اور اساتذہ، اور تعلیم یافتہ مسلمانوں سے خطاب بھی ہوا۔

بعض عرب طلباء کے اصرار سے جو کتابوں کے ذریعہ واقف اور متاثر تھے، گلاسگو کا بھی ایک سفر کرنا پڑا، وہاں جمعہ کے دن عربی اردو میں خطابات ہوئے، ان عرب طلباء ہی کے ساتھ جو اکثر اخوانی تھے، ان کے معمول کے مطابق گلاسگو کی جامع مسجد میں شب گذاری بھی کی، یہ گلاسگو اور ایڈنبرا کا میرا دوسرا سفر تھا، پہلے سفر کا تذکرہ کتاب کے حصہ اول میں آچکا ہے۔

لندن کے قیام میں ایک روز اچانک ماہر القادری صاحب تشریف لے آئے،

---

[1] ان تقریروں کا بڑا حصہ مولوی یعقوب منشی صاحب نے (جو کاوی گجرات کے رہنے والے اور تبلیغی جماعت کے سرگرم کارکن ہیں اور عرصہ سے ڈیوزبری میں مقیم ہیں) منضبط کر کے بھیجا، مگر ابھی تک ان کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

وہ افریقہ کے ایک سفر سے واپس ہوئے تھے، میری موجودگی کا حال معلوم ہوا تو خود تکلیف فرمائی، برطانیہ کے پاکستانی ہندوستانی احباب نے ان کے اعزاز میں پے کاڈی ہوٹل میں ایک ادبی محفل ترتیب دی تھی، میرے نام بھی دعوت نامہ آیا، ماہر صاحب کے تعلق کی بناء پر میں تکلیف کے باوجود چلا گیا، میں نے بھی کچھ ان کے کلام اور پیغام کے متعلق عرض کیا۔[1]

ماہر صاحب نے مجھے لیک ڈسٹرکٹ (LAKE DISTRICT) دیکھنے کی بہت ترغیب دی، اور اس کی بڑی تعریف کی، ان کے غیر معمولی تاثر اور تعریف کی بناء پر میں نے بھی اس کے سیر کا ارادہ کر لیا، اور لیڈس (LEEDS) سے جہاں کی یونیورسٹی میں میرا پروگرام تھا، رفقاء کی معیت میں اس کو دیکھنے کے لئے گیا، سفر طویل تھا، اور وقت کم، اور آنکھ کی تکلیف مستزاد، لیکن جگہ دیکھنے کے قابل تھی۔

لکھنؤ کے تبلیغی مرکز سے نقل سکونت

۱۳؍ جولائی ۱۹۶۹ء کو لندن سے ہندوستان واپسی ہوئی لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں جو ہمارے قدیم مکان سے جس میں بچپن اور جوانی گذری اور جس میں بھائی صاحب (ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب) اور عزیزوں کی سکونت تھی، تقریباً ۱۵۔۱۶ سال رہنے کے بعد ۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء میں نقل سکونت کر کے لکھنؤ کے قیام میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں قیام اختیار کیا، تاکہ دار العلوم سے ہمہ وقتی اور قریبی رابطہ رہے، مرکز کے اس طویل قیام میں جس میں متعدد اہم تصنیفات مرتب و مکمل ہوئیں اور جس کے دوران متعدد اہم بیرونی سفر بھی ہوئے، شہر کے تبلیغی جماعت کے افراد، دینی ذوق رکھنے والے عمائد شہر

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۲۰۷۔۲۰۸

www.abulhasanalinadwi.org

اور قدیم احباب ورفقاء سے شب وروز سابقہ رہا، جو کم سے کم اتوار کے درس قرآن میں اور جمعرات کے تبلیغی اجتماع میں اہتمام سے آتے، اس قیام کا ایک فائدہ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی رفاقت اور یکجائی تھی، جو اس مرکز سے ملحق مکان میں اہل وعیال کے ساتھ سکونت پذیر تھے، ہم دونوں کے یکجا قیام کی وجہ سے شہر میں آنے والے ممتاز علماء خصوصاً تبلیغی جماعت یا دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم واہلِ صلاح کثرت سے تشریف لاتے اور بعض اوقات یہیں قیام کرتے۔

مرکز کے قیام کے دوران سب سے زیادہ رفاقت ومعیت سید مسعود علی صاحب آزاد فتحپوری مرحوم[1]

[1] سید مسعود علی آزاد، حکیم سید محمود علی صاحب فتحپوری کے فرزند ایک بڑے شاعر اور جگر صاحب کے معتمد خاص تھے، (جب سے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائےپوری کو مسجد تشریف لے جانے سے معذوری ہوئی) خانقاہ اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائےپوری کے وہی امام صلوٰۃ تھے۔

حضرت کی آخری نماز جنازہ جو حضرت کے وطن ڈھڈیاں میں ہوئی، انھیں نے پڑھائی، رائےپور کا معمول ختم خواجگان انھیں کی نگرانی ورہنمائی میں ہوتا تھا، حضرت کے آخری سفر حج میں بھی وہ ہم رکاب تھے، اور انھوں نے بڑی خدمت کی، حضرت انھیں کی خواہش وفرمائش پر ایک دن کے لئے ان کے وطن تحصیل فتحپور (ضلع بارہ بنکی) بھی تشریف لے گئے۔

آزاد صاحب بڑے خوش گو شاعر تھے اور اس رشتہ سے جگر صاحب سے خاص قرب اور انس حاصل تھا، جگر صاحب اپنے سفر حج میں بھی ان کو ساتھ لے گئے، تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد متصلاً لکھنؤ کی سفید بارہ دری میں مشاعرہ ہوا جس میں صوبہ کی مجلس قانون ساز کے صدر، بابو پرشوتم داس ٹنڈن موجود تھے، اور جگر صاحب نے بھی وہاں غزل پڑھی، آزاد صاحب نے بھی اس میں غزل پڑھی جس پر ان کو بڑی داد ملی، خوف وہراس اور اندیشہ ویاس کی اس فضاء میں ان کی جرأت قلندرانہ تھی، غزل کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ٹنڈن جی کی طرف دیکھ کر انھوں نے حسب ذیل شعر پڑھے ؎

تری خود سری نہیں آشنا ابھی گردشوں کے نظام سے ۔ غم روزگار بدل نہ دے تری صبح کو تری شام سے

خدارا نوازش بے بسی میری بیکسیوں کی طرف نہ جا ۔ کہ ہنوز نسبتِ خاص ہے مجھے ایک بلند مقام سے

میری تنگ نائے حیات میں یہ کشاکشِ غمِ زندگی ۔ وہی نام وجہِ خلش بھی ہے، ہے سکون بھی اسی نام سے

۲۴ مئی ۱۹۷۴ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ غفر اللہ لہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

کی رہی، اور اس طویل صحبت میں ان کی شرافتِ نفس، عزیزانہ محبت اور مکارم اخلاق کا خوب تجربہ ہوا، آزاد صاحب کے بعد سب سے زیادہ واسطہ مسجد کے خادم و منتظم مولوی محمد سلیم صاحب مرحوم اور وہاں کے مستقل مقیم الحاج بھائی عبدالسلام خاں صاحب سے رہا، جو میری راحت اور ایک طرح سے خدمت کا بڑا اہتمام کرتے تھے، مرکز کے مقیمین میں سے عزیزی اشرف علی لکھنوی نے بھی بڑی راحت پہونچائی۔

اسی قیام کے زمانہ میں ڈاکٹر زین العابدین قدوائی صاحب[1] سے تعارف و تعلق پیدا ہوا، جو مرکز سے چند قدم کے فاصلہ پر کچہری روڈ پر رہتے تھے، اور پانچوں وقت نماز اسی مرکز کی مسجد میں پڑھتے تھے، اسی زمانہ میں ان کے لائق فرزند ڈاکٹر محمد آصف قدوائی (ایم اے پی، ایچ، ڈی) سے واقفیت پیدا ہوئی، جو مسلمانوں میں انگریزی کے ممتاز ترین صاحب قلم اور کامیاب ترین مترجم ہیں، وہ تقریباً ۱۵۔۲۰ برس سے ٹانگوں کی معذوری کی وجہ سے کامل طور پر صاحبِ فراش تھے، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے زمانۂ قیام میں جنھوں نے تین مرتبہ (۱۹۵۱۔۵۲۔۵۳ء میں) لکھنؤ تشریف آوری کے موقعہ پر اسی تبلیغی مرکز میں قیام فرمایا، اور اکثر ٹہلنے کے بعد آصف صاحب کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے، ان کی صلاحیتوں اور کمالات کا علم ہوا، یہ ایک بڑا مبارک اور مفید انکشاف، بلکہ ایک خزانہ کی

---

[1] یادش بخیر ڈاکٹر زین العابدین قدوائی اودھ کے مشہور مردم خیز قدوائی خاندان کے ممتاز فرد اور بھیارہ ضلع بارہ بنکی کے بڑے زمینداروں میں تھے، اودھ کی تہذیب اور روایات کا ایک نمونہ، شاعری بھی کرتے تھے، اور "بیکس" تخلص تھا، حضرت رائے پوریؒ کے زمانۂ قیام میں ان سے بیعت اور منسلک ہوئے، اور آخر تک اس تعلق کو قائم رکھا، ۵ اپریل ۱۹۶۳ء کو وفات ہوئی، اور لکھنؤ کے مشہور قبرستان عیش باغ میں تدفین ہوئی رحمہ اللہ تعالیٰ، ڈاکٹر صاحب کا مجموعۂ کلام "صدائے بازگشت" کے نام سے ۱۹۵۹ء میں لاہور سے شائع ہوا، جس پر مولانا اقبال سہیل کے قلم سے مقدمہ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

دریافت تھی، جس سے میں نے اور مولانا منظور صاحب نعمانی نے بعد میں بڑا فائدہ اٹھایا، آصف صاحب نے سالہا سال "ندائے ملت" کی ادارت کی (جس کا ذکر پہلے حصہ میں آچکا ہے) اور میری اور مولانا منظور صاحب کی اہم ترین کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور اہلِ نظر اور اہلِ فن نے ان کی دل کھول کر داد دی، اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح اب تک جاری ہے، ڈاکٹر زین العابدین صاحب اور ان کے باکمال فرزند ڈاکٹر آصف قدوائی کے علاوہ حاجی شفیق الرحمن صاحب ایڈووکیٹ سے بھی خاص ربط پیدا ہوا، جو شہر کے ایک کامیاب اور تجربہ کار وکیل تھے، اور کچہری روڈ پر ڈاکٹر قدوائی صاحب سے متصل مکان میں رہتے تھے۔

ان حضرات کے علاوہ مرکز کے معاونین اور کرم فرما بزرگوں میں ایک اور ہستی کا ذکر ضروری ہے، جو اپنی دینداری، اخلاص اور للّٰہیت میں خاص امتیاز رکھتی تھی، وہ اس محلہ کے مخیر بزرگ صحیح معنی میں اسم با مسمّٰی حاجی خیرات علی معروف بہ حافظ خیراتی تھے، ان کا تعلق گنج مرادآباد کی خانقاہ سے تھا، مرکز کے مقابل کچہری روڈ ہی پر ان کا مکان تھا، جو انھوں نے آخر میں ندوہ کے لئے وقف کر دیا تھا، اور جس پر اب کئی منزل کی شاندار عمارت ہے، جس کا کرایہ ندوۃ العلماء کو ملتا ہے، وہ بھی کثرت سے مرکز آیا جایا کرتے تھے، اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے، اور ہم لوگوں سے بڑی محبت فرمایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرمائے، اور ان کے درجات بلند کرے، اور جو حیات ہیں ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائے، ۱۹۶۹ء میں مولانا محمد منظور صاحب بھی مرکز سے منتقل ہو گئے، اور انھوں نے نظیر آباد میں ایک مکان خرید لیا، اور خود اور "الفرقان" کے دفتر اور مکتبہ کو وہاں منتقل کر دیا، اور اس طرح ہم دونوں یکے بعد دیگرے مرکز سے منتقل ہو گئے، لیکن ہم لوگوں کا کسی نہ کسی طرح رابطہ مرکز اور اس کے اجتماعات سے قائم رہا۔

www.abulhasanalinadwi.org

بابِ سوم

قومیت عربیہ اور اشتراکیت کے علمبردار صدر ناصر کی مخالفت

۵ جون ۱۹۶۷ء کا المیہ اور زندگی کا ایک نیا رُخ

۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل کے مقابلہ میں مصر کی شکست، بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ، دریائے اردن کے مغربی کنارہ کی پوری عرب پٹی (الضفّة الغربية) (جس میں قدس الخلیل، نابلس وغیرہ شامل ہیں) اور سینا مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے، عرب محاذ کے "ڈھول کے پول" کے کھل جانے اور قومیت عربیہ کے پھولے ہوئے بلند پرواز غبارہ کی ہوا نکل جانے کا اور اسی کے ساتھ طویل و عریض عالم اسلام کی بے بسی اور رسوائی کا وہ تاریخی واقعہ پیش آیا، جو اقوام و ملل کی تاریخ میں بعض مرتبہ صدیوں کے وقفہ سے پیش آتا ہے اور جہاں تک ملت اسلامی کا تعلق ہے اس کی تاریخ میں دو ہی چار مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔

اس واقعہ نے میری تمام توجہ اور لکھنے بولنے اور اظہار خیال کی توانائی اور فرصت کو اس واقعہ کے اصل ذمہ دار صدر ناصر کی تنقید و مخالفت پر اس طرح مرکوز کر دیا اور اس کو میرے اعصاب پر اس طرح مستولی اور تقریر و تحریر کا اس طرح موضوع بنا دیا کہ جو لوگ میرے اور میرے مربیوں اور سرپرستوں (والد ماجد اور برادر معظم) کے مزاج و مذاق سے واقف تھے وہ متعجب و حیران تھے وہ جو جانتے تھے کہ ہماری خاندانی شاخ کا اصل مزاج

www.abulhasanalinadwi.org

تصنیفی، علمی و فکری ہے، اور اس شاخ کی کمزوری یا خوبی ہے کہ اس کو انتہا پسندی، جذباتیت اور جوش سے بہت کم مناسبت ہے، اور کسی کے خلاف مہم چلانا یا تحریک کی قیادت کرنا، موروثی مزاج اور نسلی خصائص سے مناسبت نہیں رکھتا، اس موقعہ پر نہ صرف مجھ سے بلکہ جو مجھ سے جتنے زیادہ قریب، عزیز و رفیق تھے[1]، ان سے صدر ناصر، ان کی قیادت اور تحریک اور اس وقت کے مصر پر (جو ان کا ہم نوا اور آلۃ الصوت بن گیا تھا) ایسی صاف تنقید اور اس واقعہ پر ایسے کرب، اذیت اور قلب و ضمیر کے ایسے احتجاج اور اضطراب کا اظہار ہوا، جس کی لوگ توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن واقعہ یہ تھا ؎

دل عبث لب بہ شکوہ وا نہ کند

شیشہ تا نہ شکند صدا نہ کند

اس تاثر اور اس حادثہ کو اتنی اہمیت دینے اور صدر ناصر کے بارے میں (جن سے کبھی ذاتی واسطہ نہیں پڑا تھا) اس موقف کے اختیار کرنے کا سبب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ اس واقعہ کو اس کے پورے پس منظر اور سیاق و سباق میں نہ دیکھا جائے، پھر اس تعلق کا صحیح اندازہ نہ کیا جائے جو مجھے دینی، فکری، ثقافتی، لسانی اور جذباتی طور پر عالم عربی سے تھا، اور جس میں برصغیر کے بلکہ بلاد عجم کے بہت سے اہل علم و دین (اپنے ان کمالات و خصوصیات کے باوجود جن میں وہ مجھ سے بدرجہا فائق تھے) شریک نہ تھے، اس لئے کسی قدر اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

مصر کی نئی قیادت، عربوں میں اس کی مقبولیت اور اس کے اسباب

۱۹۵۲ء میں مصر میں فوجی انقلاب ہوا، خدیوی خاندان کے آخری تاجدار

---

[1] برادر زادہ عزیز محمد میاں مدیر "البعث الاسلامی" ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

شاہ فاروق کی حکومت کا خاتمہ ہوا، پہلے جنرل محمد نجیب پھر کرنل جمال عبدالناصر برسراقتدار ہوئے، عالم عربی پر عرصہ سے جو اضمحلال طاری تھا، فلسطین کی جنگ میں سات عرب حکومتوں کے محاذ نے جس طرح شکست کھائی تھی اور اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تھا، مغربی طاقتوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے اور جرأت مندی اور مہم جوئی کی جو پیاس "قدرتاً" عرب نوجوانوں میں پائی جاتی تھی، اور عالم عربی میں قیادت کا جو خلا عرصہ سے محسوس کیا جارہا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ جب جمال عبدالناصر نے صحیح وقت پر اس خلا کو پُر کیا اور نوجوانوں کی پیاس بجھائی، پھر نہر سوئیز کے قومیانے اور اتحاد ثلاثہ (برطانیہ، فرانس اور اسرائیل) کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونے کا کارنامہ انجام دیا تو اس نے عرب نوجوانوں میں صدہا پیمانوں کا نہیں بلکہ صدہا میخانوں کا نشہ بھر دیا، اور ان پر ان کی قیادت کا ایسا جادو چل گیا کہ نوجوان ہی نہیں، عرب صحافی، اہلِ قلم، ادیب ان کی "عصمت و تقدیس" کے گیت گانے لگے، اور ان کے لئے تنقید کا ایک لفظ سننا بھی مشکل ہوگیا اور اس کا اثر عقائد، اعمال پر بھی پڑنے لگا، سوئیز کے مسئلہ میں ان کی غیر معمولی کامیابی نو واقعی سحر کا اثر رکھتی تھی، ان کے انتقال پر جو ۵ جون ۱۹۶۷ء کی ہزیمت کے بعد ہوا، مصری صحافت نے جس طرح ان کو خراج عقیدت پیش کیا، اس سے اس کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ فتح و غلبہ کے وقت جب ان کی کمان چڑھی ہوئی تھی اور ان کا تیر نشانہ پر بیٹھتا تھا، عرب قوم پرستوں کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی، ان کے انتقال پر مصر کے مشہور روزنامہ "الجمہوریۃ" نے لکھا:۔

"اس زمانہ کے نبی نے دنیا سے رحلت فرمائی، جمال عبدالناصر کا سال کے اسی دن انتقال ہوا، جس میں اللہ نے اپنے نبی محمد بن عبداللہ پر معراج کی تجلی ظاہر کی اور ان کو اپنے پاس سدرۃ المنتہیٰ تک بلوائی اور پاس خاطر کے لئے

www.abulhasanalinadwi.org

بلایا، ٹھیک اسی طرح اللہ نے اپنے حبیب جمال کے لئے کیا، آپؐ کا سفر بھی ٹھیک اسی طرح ہوا تھا جس طرح جمال کا ہوا، جمال عبدالناصر کا انتقال نہیں ہوا، بلکہ وہ آسمانی سفر پر اس طرح روانہ ہوئے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور قدوسیوں کا سفر ہوتا ہے"۔ (الجمہوریۃ ۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

"اے جمال عبدالناصر، اے وطنیت کے نبی، حرّیت کے رسول، شب معراج میں آپ کا نام اور آپ کا جسم آسمان پر پہونچا، قدوسیوں اور ابرار سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ اس قافلہ میں شامل ہو گئے، جو اس زمین میں اور آسمان میں زندگی کا موجد ہے"۔ (الجمہوریۃ کے اداریہ سے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء)

"اے وہ جس سے بڑھ کر معزز و محترم دنیا نے کبھی نہیں دیکھا، حوادث کے سامنے ثابت قدم رہنے والا اور جس وقت چاہے اور جس طرح چاہے ان میں تصرف کرنے والا"۔ (ایضاً)

"اگر آنسو سمندر بن جائیں اور دریا روشنائی بن جائیں تب بھی ان کی تعزیت نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ایسے لوگ الفاظ و کلمات سے بالاتر ہیں، بلکہ وہ خود الفاظ و کلمات ہیں"۔ (الجمہوریۃ، ادارتی نوٹ۔ ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

"نیا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ، ناصر حبیب اللہ" ہمارے آباء و اجداد آپ کے نغمے گاتے رہے، آپ ان کے لئے ایک حسین کہانی یا خواب تھے، چار ہزار برس سے وہ اس امید میں جی رہے تھے کہ آپ ظاہر ہوں، آخر کار بیسویں صدی کے نصف آخر میں اہل مصر کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا"۔ (الجمہوریۃ یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء (ہفتہ وار ایڈیشن))[1]

---

[1] عالم عربی کا المیہ حاشیہ ص ۲۱-۲۲

www.abulhasanalinadwi.org

میری مخالفت کے اسباب

صدر ناصر قومیت عربیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے لیکن میری مخالفت کی بنیاد تنہا یہ بات نہیں تھی، شام کے بعثی لیڈر اور عراق کے متعدد قوم پرست مفکر اس بارے میں ان سے پیچھے نہیں تھے، لیکن ان میں سے کوئی عالم عربی کی روح اور دنیائے عرب کی آئندہ نسلوں کے لئے اتنا خطرناک نہیں تھا جتنے وہ تھے، وہ تنہا قومیت عربیہ کے علمبردار نہیں تھے، عالم عربی میں ایک بنیادی، ہمہ گیر اور نہایت دوررس تبدیلی کے داعی و علمبردار تھے، اور بڑی آزمائش کی بات یہ تھی کہ ان کو سوئیز کی کامیابی اور بعض دوسرے اسباب کی بناء پر نئی نسل میں مقتدائیت اور محبوبیت کے ان کو وہ مواقع و وسائل حاصل ہو گئے، جو ان سے پہلے صرف کمال اتاترک کو (ترکی کی حد تک) حاصل ہوئے تھے، وہ عالم عربی کا رخ اس مرکزی نقطہ سے ہٹا کر جو اس کے فکر و عمل، شوق اور تمنا اور جذبہ و جوش کا قبلہ رہا ہے، ہمہ گیر مادیت اور لا مذہبیت (سیکولرزم) کی طرف پھیرنا چاہتے تھے، اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ایسے دوررس اور وسیع انتظامات اور تبدیلیاں کر رہے تھے، جن کا اثر (اگر کوئی عظیم انقلاب اور غیر معمولی واقعہ پیش نہ آئے تو نسلوں اور صدیوں تک قائم رہنے والا تھا) وہ پورے عزم و تنظیم اور ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ساتھ اس منزل کی طرف رواں دواں تھے جس کے نزدیک معیار اور منتہائے کمال اشتمالیت یا کمیونزم اور اس کے داعی و علمبردار تھے۔

اس کے ساتھ قوم پرستی میں جب قدیم تہذیب کے احیاء کی سرمستی اور آباء پرستی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف اخوت اسلامی کی حریف، بلکہ نبوت محمدیؐ کی

www.abulhasanalinadwi.org

رقیب بھی بنتی نظر آتی ہے[1]، وہ جس رفتار سے ترقی کرتی ہے، اسی رفتار سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیادت و امامت کا عقیدہ اور ان کے "دانائے سبل ختم الرسل اور مولائے کل" ہونے کا اعتقاد بھی کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس کے آثار و شواہد اہل قلم اور بعض سنجیدہ اور سال خوردہ مصنفین اور ادیبوں کی تحریروں میں نظر آنے لگے تھے تاریخ الادب العربی" اور "وحی الرسالۃ" کے شہرۂ آفاق مصنف استاذ احمد حسن الزیات کے قلم سے جامعہ ازہر کے ترجمان "مجلۃ الازھر" میں "امۃ التوحید تتوحد" کے عنوان سے جمال عبدالناصر کی زندگی ہی میں ایک مضمون نکلا جس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

> "وہ وحدت جس کی دعوت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی تھی، ایک عام اصول تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد عقیدہ پر تھی، عقیدہ کی کتنی ہی زندگی ہو وہ کمزور بھی پڑ جاتا ہے، اور بدل بھی جاتا ہے، اور وہ وحدت جس کی صلاح الدین ایوبی نے دعوت دی تھی وہ ایک خاص جزئیہ تھا اس لئے کہ اس کی بنیاد طاقت پر تھی، اور طاقت کو ضعف بھی عارض ہوتا رہتا ہے، اور اس کا زوال بھی ہو جاتا ہے، لیکن وہ وحدت

---

[1] اسی خطرہ کو محسوس کر کے مصنف نے ایک مستقل مضمون بلکہ رسالہ "عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟" لکھا جس میں عرب اور اسلام کے لافانی رشتہ کو نمایاں کیا، اور بتایا کہ نبوت محمدیؐ اور شریعت اسلامی نے اس کے قیام و دوام کے لئے کیسے وسیع و عمیق انتظامات کئے ہیں، پھر تاریخی طور پر اس کا جائزہ لیا کہ عربوں میں قومیت کے احساس کا آغاز کب سے ہوا؟ اور اس کے اصل محرکات کیا تھے؟ اور ثابت کیا کہ تحریک قومیت کے اولین قائد عیسائی فضلاء تھے، جو عربوں کا رشتہ اسلام سے کمزور کرنا چاہتے تھے، اور خلافت عثمانیہ کے خلاف عربوں کا ایک محاذ بنانا چاہتے تھے، اس کا نتیجہ مرکز خلافت کے انتقال کی تحریک تھی جس کے نقیب اور داعی دانایان مغرب تھے، اور جس کے نتیجہ میں عربوں نے ترکوں سے بغاوت کی، یہ رسالہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس کی جمال عبدالناصر نے دعوت دی ہے' وہ باقی رہنے والی اور پھلنے پھولنے والی ہے' اس لئے کہ اس کی عمارت تین[۳] بنیادوں پر قائم ہے' غذا اور اسباب معیشت میں اشتراکیت' اظہار خیال میں حریت' اور نظام حکومت میں جمہوریت' اور یہ تین[۳] عناصر اس وحدت کی بقاء کے لئے دائمی ضمانت ہیں۔[۱]"

پھر اس قیادت نے عرب اور مصر کو ایک ذہنی واخلاقی انتشار' اسلام کی برتری' اور قیادت کی صلاحیت سے مایوسی کے احساس اور عزت واستحکام کو کسی اور فلسفۂ زندگی کے سایہ میں اور کسی مشرقی یا مغربی بلاک کے دامن میں تلاش کرنے کا راستہ ہموار کر دیا، ہر طرح کی تنقید واختلاف پر پابندی عائد کر دی اور نفس وخواہشات کی ہر طرح کی آزادی دے دی، دس بارہ[۱۲-۱۰] برس کے عرصہ میں اس قیادت کے دوران عرب ممالک کے نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ایسی تبدیلی آئی اور اولاد ابراہیمؑ کی آزری اور بت تراشی کے ایسے نمونے کھلی آنکھوں دیکھنے میں آئے' جو نہ صرف ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے مرادف تھے' بلکہ اس کے حدود کہیں کہیں اعتقادی ارتداد سے بھی مل جاتے تھے' اور بہت سے نوجوانوں کی زبانوں سے صاف صاف کفریہ کلمات' دین اور اہل دین سے بیزاری کا اظہار تبرا کے حدود تک پہونچ جاتا تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ بہت سے خالص دینی حلقوں میں بھی مدح وذم اور تعریف وتنقید کا معیار کسی شخص کی اسلامیت اور غیر اسلامیت اور اسلام اور مسلمانوں کا سود وزیاں نہیں رہا، بلکہ خالص دنیاوی کارنامے' مادی فتوحات (اگرچہ صدر ناصر کے یہاں سوائے سوئیز کے قومیانے کے اور کوئی کارنامہ نہیں) سیاسی پروپیگنڈہ رہ گیا ہے' اور کسی مغربی طاقت کو للکار دینا اور لاف زنی کسی قائد اور زعیم کے لئے

---

[۱] استاد احمد حسن الزیات کا مضمون "مجلۃ الازہر" محرم ۱۳۸۳ھ

www.abulhasanalinadwi.org

پروانۂ مغفرت ہی نہیں پروانۂ ولایت ہے، مجھے یہ محسوس ہوا کہ خود ہمارے ملک کے دینی حلقے میں بھی اس دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں جو اس حلقہ کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھا اور اس کے اکابر کا شعار تھا، تیزی کے ساتھ انحطاط آگیا ہے، اور یہ وہ نقصان ہے جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں[1]، اس بنا پر میرے قلب و ضمیر کی اذیت میں اور اضافہ ہوا، اور اس نے اس صدائے احتجاج کو اور زیادہ بلند آہنگ اور تلخ بنا دیا ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

عالم عربی اور اس کے واقعات و حالات سے میری غیر معمولی وابستگی

اس واقعہ پر بعض گوشوں سے یہ سوال کیا گیا کہ آخر مجھے ہی اس حادثہ سے کیوں اس قدر تاثر ہے اور جبکہ دنیا مواصلات کی آسانی، اخبارات و ریڈیو کی موجودگی اور سفر کی سہولتوں کی وجہ سے گھر آنگن ہو گئی ہے، میرے لئے معلومات کے وہ کیا خاص ذرائع ہیں، جو تنہا مجھے حاصل ہیں، اور ان میں کوئی دوسرا اس درجہ میں شریک نہیں؟ ایک اردو رسالہ کے ایک

---

[1] اس موقعہ پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ ہندوستان کی دینی علمی حلقے کی متعدد برگزیدہ شخصیتیں میرے اس تاثر اور فکر میں ہم نوا رہی ہیں، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے بارہا صدر ناصر کے بارے میں سخت تنقیدی الفاظ استعمال فرمائے، اور ایک مرتبہ رمضان مبارک میں اپنے معتکف میں محمد میاں مرحوم کا ایک مضمون جو صدر ناصر اور قومیت عربیہ کی تنقید میں تھا مجمع میں پڑھوا کر سنا، ہندوستان اور پاکستان کی جماعت اسلامی کا موقف بھی اس مسئلہ میں تنقیدی اور احتسابی تھا، اور ان کا پریس بھی صدر ناصر کی مخالفت اور ان پر تنقید کرتا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

مضمون میں خاص طور پر یہ سوال اٹھایا گیا کہ میرے کون سے شرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ میں صدر ناصر اور مصر کی موجودہ قیادت کی مخالفت اپنا فرض سمجھتا ہوں؟ مصری سفارت خانہ نے بھی کئی بار احتجاج کیا، اور حکومت ہند نے بھی کئی مرتبہ توجہ دلائی کہ ندوۃ العلماء سے نکلنے والے عربی رسائل "البعث" اور "الرائد" کیوں اس مخالفت کے لئے وقف ہو گئے ہیں۔ [1]

اردو رسالہ کے (جس کے مدیر ایک صاحب فکر مسلمان عالم تھے) اس مضمون نے میرے اندر کچھ لکھنے کا شدید داعیہ پیدا کر دیا اور میں نے "نداء ملت" کے لئے قلم برداشتہ ایک مضمون لکھوایا جس میں پوری بے تکلفی کے ساتھ اس کی وضاحت کی کہ اس مسئلہ سے میری گہری وابستگی کے کیا اسباب ہیں؟ یہ مضمون جس پر کسی قدر خود ستائی کا شبہ کیا جا سکتا ہے فرط تأثر اور جذبہ کے ماتحت لکھا گیا، جس جذبہ کے اثر سے بعض رفیع المرتبت قدسی نفوس

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ "البعث الاسلامی" کے مدیر عزیزی محمد الحسنی مرحوم کو دہلی وزارت خارجہ میں بلایا گیا، اور ان کو بتایا گیا کہ مصری سفارت خانہ نے ان کے رسالہ کے موقف اور ان کے مضامین کے خلاف کئی بار احتجاج کیا ہے، وہ اپنا موقف کیوں نہیں تبدیل کرتے؟ انھوں نے کھلے طریقہ پر اس سے معذرت کی بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ صدر ناصر کو اخبارات و رسائل کے جو منتخب تراشے پیش کئے جاتے تھے ان میں "البعث" کے تراشے بھی ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی وزارت خارجہ دہلی میں طلب کیا گیا، اور اس کے سکریٹری عظیم حسین صاحب نے مجھ سے اس بارے میں سوالات کئے، اس موقعہ پر وزارت خارجہ ہند کے اعلیٰ افسران اور مشرق وسطیٰ کے معاملات کے ماہرین بھی موجود تھے، میں نے صفائی سے عرض کیا کہ ہم نے اس موقف کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور ہم اس پر قائم رہیں گے، خواہ اس کے نتیجہ میں ہمیں ہندوستان سے باہر جانے کی سہولتوں سے محروم کر دیا جائے۔ (یاد ہے کہ اس زمانہ میں میرا پاسپورٹ حکومت ہند کی تحویل میں تھا)۔

www.abulhasanalinadwi.org

نے میدان جہاد میں رجز خوانی کی ہے، اس مضمون کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے،
میں نے لکھا:۔

"میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقعہ پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک اور بے وقت اس میدان میں آگیا ہوں، میں اپنے کو (ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطہ سے بھی) اس وسیع وعظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت، اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب و ثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لئے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی، لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا، اور مجھے اقبالؒ کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے ؎

میرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا   وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

www.abulhasanalinadwi.org

اس حادثۂ الیمہ کے بعد ہی میں نے عربوں کی رسوا کن شکست کے اسباب اور ان کی بنیادی کمزوریوں کا بے لاگ جائزہ لیا اور بتایا کہ وہ کیا تبدیلیاں پیدا کرکے اس داغ کو دھونے کے قابل ہو سکتے ہیں" کارثة العالم العربي وأسبابها الحقيقية" کے عنوان سے مختلف عرب اداروں اور انجمنوں کی طرف سے یہ مضمون ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا، اس کے بعد ہی میں نے عرب سربراہان مملکت اور اخبار نویسوں کے نام ایک کھلا خط لکھا، جو اہتمام سے ان کے نام بھیجا گیا، اس میں بھی اس المیہ کے حقیقی اسباب بیان کئے گئے تھے، اور اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کیا گیا تھا، اسی زمانہ میں ایک طنزیہ مضمون جو اس وقت جذبات اور دکھے ہوئے دل کی ترجمانی کرتا تھا" فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَأَطَاعُوْهُ"[1] کے عنوان سے بھی لکھا اور شائع کیا گیا۔

حجاز و کویت کی تقریریں

۱۹۶۶ء میں تو میں پاسپورٹ کی ضبطی کی وجہ سے ہندوستان سے باہر نہیں جا سکا، اکتوبر ۱۹۶۷ء سے میرے بیرونی سفروں کا سلسلہ شروع ہوا، مصر کی شکست کو ابھی چار مہینے گذرے تھے، اور زخم مندمل نہیں ہوا تھا کہ مجھ سے مکہ معظمہ کے قیام شعبان ۱۳۸۷ھ (نومبر ۱۹۶۷ء) میں مکہ معظمہ کی ایک مؤقر مجلس اور کلب" نادي الوحدة الرياضي" میں تقریر کی فرمائش کی گئی، اس فرمائش میں رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل معالی الشیخ محمد سرور الصبان کی تائید و اصرار بھی شامل تھا، ۶ر نومبر ۱۹۶۷ء کو میں نے" سود و زیاں کی میزان" کے عنوان سے

---

[1] یہ آیت فرعون مصر کے متعلق ہے، ترجمہ حسب ذیل ہے:۔" غرض اس نے اپنی قوم کی عقل ماردی اور انھوں نے اس کی بات مان لی۔" (سورۂ زخرف آیت ۵۴)

www.abulhasanalinadwi.org

نادی میں تقریر کی، جلسہ میں ملک کے سربرآوردہ حضرات، ادیبوں، صحافیوں، اور کالجوں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بڑی تعداد شریک تھی، میں نے اس میں کامیابی اور ناکامی کی میزان پر روشنی ڈالی، اور صدر ناصر کی قیادت کو کلیۃً ناکام ثابت کیا، اور بتایا کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ میں نے بتایا کہ عظمت رفتہ کی کس طرح پامالی ہوئی، ہماری تاریخ پر کیا دھبہ اور ہمارے چہرے پر کیا داغ لگا، ایسے موقعہ پر خود دار قوموں کا کیا شعار ہوتا ہے، وہ کس طرح اپنے زعماء اور قائدین کا احتساب کرتی ہیں، اور شکست و ذلّت کے ذمہ داروں سے کس طرح بیزاری کا اظہار، میں نے کہا کہ آپ کو اور سب عربوں اور مسلمانوں کو رمی جمرات کے ذریعہ دشمن سے نفرت اور اس کی تذلیل کی یہی تعلیم دی گئی ہے، پھر بتایا کہ اب اس کی تلافی کی کیا صورت ہے، اور یہ کہ اسلام کی طرف بازگشت کے سوا کوئی راستہ نہیں، عرب زعماء سے ہم سب مسلمانوں کی یہی اپیل ہے کہ وہ اس میں ہمارے لئے نمونہ بنیں اور آگے آئیں۔

اگلے سال ہی شعبان ۱۳۸۸ھ (نومبر ۱۹۶۸ء) کو مدرسہ ثانویہ طیبہ مدینہ منورہ کے وسیع ہال میں اس موضوع پر دوسری تقریر ہوئی جس میں جامعہ اسلامیہ، مدارس اور کالج کے اساتذہ اور طلباء اور علماء اور سربرآوردہ حضرات کی کثیر تعداد شریک تھی، اس تقریر کا عنوان تھا "فتح وغلبہ کے دو الٰہی نظام" اس کی تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اس عالم اسباب میں ایک تو مادّی قوت، تیاری اور ضروری اسباب اختیار کرنے کا نظام ہے، اور بارہا یہ نظام کامیاب ہوا ہے، افراد اور جماعتوں نے اس کی مدد سے مستحکم سلطنتیں قائم کی ہیں، اپنے دشمن کو شکست دی ہے، اور حالات میں تبدیلی لائے ہیں، اور یہ قانون تکوینی ہے، جو ہزاروں سال سے نافذ ہے، دوسرا ایمان وعقیدہ، نافع مقاصد اور صالح زندگی کا نظام ہے، جس کی کامیابی کی ضمانت خدا نے کی ہے، اور مسلمانوں نے اسی نظام سے دنیا پر فتح حاصل کی، مصر کی موجودہ

www.abulhasanalinadwi.org

قیادت نے دونوں نظاموں سے بغاوت کی اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہا، میں نے بتایا کہ جنگ کے زمانہ میں مصر کی اخلاقی و دینی حالت کیا تھی، اور پھر بتایا کہ یہ شکست تعجب خیز نہیں، یہ بھی صفائی سے عرض کیا کہ۔ ع

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

عرب قومیت میں غیر عربوں کے لئے کوئی کشش نہیں، ان کے لئے صرف ایمان عمل صالح، اسلام کے پیغام اور دعوت میں کشش ہے۔

اس تقریر میں ہمارے استاد ڈاکٹر شیخ تقی الدین ہلالی بھی موجود تھے، انھوں نے بھی اپنے تأثر اور مسرت کا اظہار کیا۔

اسی سال ۲۴ / شعبان ۱۳۸۸ھ (۱۷/ نومبر ۱۹۶۸ء) کو حجاز سے واپسی پر کویت ایک دو روز قیام رہا، اور وہاں جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی کے ہال میں اسی موضوع پر تقریر ہوئی جس کا عنوان اور روح تھی "عالم عربی کو اصل خطرہ اسرائیل سے نہیں اس ضمیر سے ہے، جس نے اپنا کام چھوڑ دیا" اس میں بتایا گیا کہ ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی، قومی ضمیر کا مفلوج ہو جانا، اپنے قائدین سے احتساب نہ کرنا، حادثات سے سبق نہ لینا اصل خطرناک بات ہے اور اس وقت عالم عربی اسی خطرہ سے دوچار ہے۔

اگلے سال شعبان ۱۳۸۹ھ (نومبر ۱۹۶۹ء) کو مدینہ منورہ میں دوبارہ مدرسہ ثانویہ طیبہ کے ہال میں اسی موضوع پر اظہار خیال کیا گیا، اسی جلسہ میں رابطہ عالم اسلامی کے بعض مقتدر ارکان، جامعہ اسلامیہ کے اساتذہ اور طلبہ اور شہر کے تعلیم یافتہ اصحاب موجود تھے، اور ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا، اس تقریر کا موضوع اور خلاصہ تھا "المیہ فلسطین سے تین سبق" اس میں وضاحت کے ساتھ "إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ" کی روشنی میں بتایا گیا کہ رسول اللہ

www.abulhasanalinadwi.org

صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حریفوں اور آپ کی عالمی ابدی قیادت کو چیلنج کرنے والوں کا ہمیشہ انجام ناکامی اور ان کے سلسلہ کا انقطاع رہا ہے، اور "ابتر" صرف نسلی اور نسبی انقطاع ہی کا نام نہیں، اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے، اس میں بدتوفیقی، ناکامی، ذلت، گمنامی اور بے نشانی داخل ہے، لادینی اور ملحدانہ قیادتیں ہمیشہ ناکام رہیں اور رہیں گی، ہمیں ہمیشہ ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے، خودغرض، مفاد پرست رہنماؤں کو پہچاننا چاہیئے نیز اس طرز زندگی اور حکومتوں و معاشروں کے اس انجام سے اجتناب کرنا چاہیئے جس کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے ؂

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

ایک اہم انٹرویو

اس بحث کے بعض پہلو اور اس سلسلہ کے بعض حقائق و تاثرات اس انٹرویو میں بہت واضح طریقہ پر آئے ہیں، جو اکتوبر ۱۹۶۷ء میں میرے مکہ معظمہ پہونچنے کے بعد ہی سعودی عرب کے سب سے بڑے اور کثیر الاشاعت اخبار "الندوہ" کے نمائندہ نے لیا، اور اس کے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے شمارہ میں شائع ہوا[1]، اس کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

سوال:- عالم عربی کے تازہ المیہ نے لوگوں پر مختلف اثرات چھوڑے ہیں، ایک اثر وہ حیرانی ہے، جو کسی اچانک حادثہ سے پیدا ہو جاتی ہے، اس نے بہت سوں کے احساسات میں ایک ہلچل اور عقل و فکر میں تعطل کی کیفیت پیدا کر دی ہے،

---

[1] اس کا ترجمہ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے "ندائے ملت" میں شائع ہوا۔

www.abulhasanalinadwi.org

انھیں ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو نہ کہ دن کی روشنی میں ہونے والا کوئی واقعہ، دوسرا اثر عقائد و مسلّمات میں تشکیک و اضطراب ہے، وہ عقائد و مسلمات جو مسلمانوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں، تیسرا اثر یاس اور مستقبل میں تاریکی کا احساس ہے، آپ کا ردعمل اس واقعہ پر کیا ہے؟ میری خواہش ہے کہ صراحت اور وضاحت سے بیان فرمائیں۔

جواب:۔ مجھے آپ کا سوال بہت پسند آیا، یہ المیہ خود میرے لئے اسی طرح کا المیہ ہے جیسے کسی مسلمان کے لئے ہو سکتا ہے، بلکہ کسی عرب کے لئے، اور مجھے اس پر غور و فکر سے دلچسپی بھی ہے، میں آپ کی خواہش کے مطابق صراحت ہی سے جواب دوں گا، میں تو صراحت اور صفائی کا یوں بھی عادی ہوں، اور یہ موضوع تو ہے ہی صاف گوئی کا، اس لئے کہ مصائب میں تکلف اور تحفظ نہیں نبھتا، عربوں کا محاورہ ہے "الرائد لا یکذب أهله" (قافلہ کے لئے پڑاؤ تلاش کرنے والا جھوٹی خبر نہیں دیتا) اور میں اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ تکلّف بھی نہیں برتتا اور منہ دیکھی باتیں بھی نہیں کرتا۔

میرے اوپر اس حادثہ کا ردعمل وہ نہیں ہے جو کسی غیر متوقع بات سے ہوتا ہے، تمام علامتیں اس بات کی موجود تھیں کہ ایک نہ ایک دن یہ المیہ پیش آنے والا ہے، کچھ لوگ جنھیں اللہ نے بصیرت بخشی تھی، ایمانی عقل اور تدبر فی القرآن کی دولت سے نوازا تھا، وہ اس کی پیشین گوئی کر رہے تھے، بالکل اس طرح جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، نبوت و الہام، یا خرق عادت سے اس کا تعلق نہیں تھا، یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے ایک شخص کے سامنے غبارہ آئے وہ

www.abulhasanalinadwi.org

اُسے ہاتھ لگا کر دیکھے اور پیشین گوئی کرے کہ اگر اسے سوئی کی نوک لگ گئی یا کانٹا چبھ گیا تو اس کا حشر کیا ہوگا۔

اس معرکہ میں عربی قیادت کی مثال بالکل یہی تھی، وہ دشمن کی جنگی تیاری، مضبوطی اور سنجیدگی کا مقابلہ زبانی جمع خرچ سے کر رہی تھی، صحافت کا طمطراق، ریڈیو کی گھن گرج اور لاف گزاف اس کا کل سرمایہ تھا، اس کی صف آرائی دشمن کے خلاف تو بہت کم اصلاً ان بھائیوں کے مقابلہ میں تھی جو عقیدہ میں بھائی تھے، خون اور نسل میں بھائی تھے، قرآن نے مسلمانوں کی صفت بیان کی "اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ" اہل ایمان کے لئے نرم اور اہل کفر کے لئے گرم، لیکن انھوں نے اس کو الٹ کر "اَعِزَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ" کا حال پسند کیا، مومنین کے حق میں سخت اہل کفر کے معاملہ میں دل نرم اور سر خم)۔

بہر حال دشمن کے مقابلہ میں ان کا سارا سرمایہ زبان آوری، لن ترانی اور ڈرامہ آرائی تھا، جیسے "علی بابا چالیس چور" والا ڈرامہ اسکولی بچے اسٹیج کیا کرتے ہیں، چنانچہ جب حقیقت کا سامنا ہوا، اور واقعی لشکر سے سابقہ پڑا تو یہ اداکار میدان جنگ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے، یہ "حقیقت" اور "صورت" کے مقابلہ کا دائمی انجام ہے، میں نے ہمیشہ اس کو اس طرح سمجھا ہے اور کتنی ہی مثالوں کے ساتھ ایک بسیط تقریر بھی کبھی اس موضوع پر کی ہے[۱]۔

س:- آپ کی آمد اس المیہ کے بعد ہو رہی ہے کیا آپ نے یہاں کے لوگوں میں اس کا گہرا اثر پایا؟

ج:- آپ نے میرا زخم کرید دیا، میرے رنج بھرے احساس کو چھیڑ دیا، اور اب میں

---

[۱] تقریر "صورت و حقیقت" اور اس کے عربی ترجمہ "بین الصورۃ والحقیقۃ" کی طرف اشارہ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جو کچھ بھی کہوں اس کو کہلانے کے ذمہ دار آپ ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ ناراض نہ ہوں گے۔

میں نے اس حادثہ کا کوئی خاص اثر اس ملک کی زندگی میں نہیں دیکھا، یہاں زندگی کا چکر اسی انداز پر چل رہا ہے، جو اس واقعہ سے پہلے دیکھنے میں آتا تھا گویا کوئی حادثہ ہی نہیں ہوا، ہماری عزت کو کوئی چوٹ ہی نہیں پہونچی کوئی مقدس چیز ہم سے نہیں چھنی، نہ ہم نے اپنی آبرو اور قیمت میں سے کچھ کھویا ہے، نہ کوئی خطرہ ہمارے وجود اور ہماری غیرت کو چیلنج کر رہا ہے، حالانکہ جو کچھ ہو گیا اور جس کا آگے خطرہ ہے اس کا حق تھا کہ نیندیں اڑ جائیں، عیش مکدر ہو جائے، اور انسان اپنے آپ تک کو بھول جاتا۔

آخری سوال :۔ اچھا تو اس شکست کے آثار و نتائج سے عہدہ برآ ہونے کی واحد سبیل کیا ہے؟

جواب :۔ واحد سبیل اسلام ہے "إلى الاسلام من جديد" نئے سرے سے اسلام پر آیئے! میں ان سطحی تجاویز سے بالکل مطمئن نہیں ہوں، جو آج بہت سے اہل قلم اور مفکرین پیش کر رہے ہیں! میں ان سیاسی کانفرنسوں اور ڈپلومیٹک اجتماعوں پر بھی کوئی عقیدہ نہیں رکھتا جن کو ہم بہت آزما چکے ہیں! اور نہ فلسطین اور بیت المقدس کو تکیہ کلام بنانے میں کوئی فائدہ سمجھتا ہوں جس کا ہر خطیب اور ہر صاحبِ قلم عادی ہو گیا ہے، ضرورت جس چیز کی ہے اور جس سے کام چلے گا، وہ ہے ایک نئی مومن نسل، جو نہ ذلت برداشت کرے، نہ بے فکری کے مشغلوں سے دل بہلائے، ایسی نسل جس کی زندگی سنجیدگی اور دلیری صفات و عقیدے سے آراستہ ہو، جو صورت اسلام کی نہیں، حقیقت اسلام کی حامل ہو، یہی نسل ہے جو فتح و نصرت کی ضامن ہو گی، اور عزت و سربلندی اس کا مقدر ہے۔

پس ہماری صحافت و ادب ریڈیو اور نظامِ تعلیم و تربیت اور قومی رہنمائی کی

www.abulhasanalinadwi.org

وزارت[1] جیسے ہر مؤثر ادارہ کو اس نسل کی تعمیر میں حصہ لینا چاہئے ہم میں جو کچھ دین و کردار و شرافت اور شجاعت کا جوہر باقی ہے اس کی مکمل حفاظت کی جانی چاہئے کہ اس سے کوئی کھلنڈرا کھیلنے کی جرأت نہ کر سکے، یہ اگر بالکل رخصت ہو گیا تو لوٹ کر آنے والا نہیں یہ اس نبوت کی وراثت ہے، جو حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کی جا چکی ہے یہ مصلحین و مرشدین کی باقیات صالحات میں سے ہے اور یہ اس ملک کی وہ دولت ہے جسے یہ اطراف عالم میں برآمد کیا کرتا تھا۔"

مستقبل عربوں ہی کا ہے

ان تنقیدی، احتسابی خطبات اور مضامین کے بعد جب مجھے محسوس ہوا کہ کہیں پڑھنے والوں کے ذہن پر اس کا محض سلبی و منفی اثر نہ پڑے اور ان کے اندر اپنے مستقبل سے مایوسی کی کیفیت ظاہر نہ ہو، میں نے ضرورت سمجھی کہ ایک ایسا مضمون لکھا جائے جس سے ان کے دل میں نیا ولولہ، اعتماد اور اس حقیقت پر یقین پیدا ہو کہ یہودی خواہ کتنی ہی کامیابی حاصل کر لیں اور (خدانخواستہ) سارے عالم عربی ہی پر نہیں آدھی دنیا پر بھی قبضہ کر لیں تو بھی یہودیوں کا کوئی مستقبل نہیں، خدا کے ابدی قانون میں بقائے انفع کی ضمانت دی گئی ہے " فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ[2]" خدا رب العالمین ہے، رب بنی اسرائیل نہیں ہے اس سے کسی کا کوئی رشتہ نہیں، وہ دنیا میں خیر و صلاح، عدل و مساوات، احترام انسانیت کا دور دورہ دیکھنا چاہتا ہے، نہ کہ کسی خاص نسل کا اقتدار و تسلّط، اور انسانوں کا انسانوں کو

---

[1] مصر وغیرہ میں "الارشاد القومی" کے نام سے مستقل وزارت قائم تھی جس کا اصل کام ذہنوں کی تربیت، رہنمائی اور صحیح اطلاعات بہم پہنچانا تھا۔ [2] الرعد - ۱۷

www.abulhasanalinadwi.org

غلام بنانا، یہودیوں کے پاس انسانیت کے لئے کوئی عام پیغام اور احترام نہیں ہے، یہ خصوصیات ساری کمزوریوں کے باوجود عربوں کو حاصل رہی ہیں، اور اب بھی ان کے پاس وہ دین، وہ صحیفہ، اور وہ شریعت موجود ہے جو اس کی داعی ہے، اور وہ تاریخ جو احترام انسانیت وحدتِ بنی آدم اور مساوات انسانی کی تابناک مثالیں پیش کرتی ہے، اس لئے مستقبل عربوں ہی کا ہے، وہ اگر دعوت اسلامی کے حامل اور دین حق کے علمبردار ہیں تو ان کی فتح یقینی ہے۔

یہ مضمون میں نے "الفتح للعرب المسلمین"[1] کے عنوان سے لکھا، اور ایک مستقل رسالہ کی شکل میں شائع کیا، یہ رسالہ جب مفتی امین الحسینی صاحب کے پاس پہونچا تو انھوں نے اپنی کمیٹی "اللجنة العليا لفلسطين" کی طرف سے اس کو "العاقبة للمتقين" کے نام سے بیروت سے شائع کیا۔

ان تقاریر و مضامین کا مجموعہ "المسلمون وقضية فلسطين" کے نام سے کئی بار بیروت و دمشق سے شائع ہوا، میں نے اشاعت سے پہلے اس کے لئے ایک مفصل دیباچہ لکھا، جس میں فتح و شکست اور عزت و ذلت کے اسباب کا قرآن حکیم کے مطالعہ اور قانونِ فطرت کی روشنی میں تحلیل و تجزیہ کیا، تاریخ سے اس کی مثالیں پیش کیں کہ غفلت، تعیش، اخلاقی امراض اور حقائق سے چشم پوشی سے قوموں، معاشروں اور قیادتوں کا کیا انجام ہوتا ہے، اور عالم عربی میں کس طرح ان کمزوریوں نے پرورش پانی شروع کی، اس کے حقیقی اسباب کیا تھے؟ کس طرح وہاں کا تشکیکی و انتشار انگیز ادب[2]

---

[1] "عالم عربی کا المیہ" کے مجموعہ میں اس کا ترجمہ "اسلام کے حلقہ بگوش عربوں کو قرآن کی نوید فتح" کے عنوان سے شامل ہے۔ [2] مصر کے اہل قلم میں قاسم امین، احمد لطفی السید باشا، طٰہٰ حسین، موسیٰ سلامہ، اور رسائل میں "مجلة العربی" کویت، "المصوّر" قاہرہ وغیرہ اس کے بڑے علمبردار تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اور صحافت نے عقائد و مسلّمات کو عرصہ سے متزلزل کرنا شروع کر دیا تھا، اور اس طرح ان المیوں کے لئے زمین ہموار کر دی تھی، اس لئے یہ حادثہ اس طرز فکر اور طرز عمل کا نقطۂ ارتقا تھا، نقطۂ آغاز نہ تھا۔

اردو میں یہ کتاب "عالم عربی کا المیہ" کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہوئی، اور اس وقت تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے، ہندوستان کے بھی سنجیدہ اور حقیقت پسند حلقہ میں یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی گئی، اور بعض اہل فکر نے اس کو مصنف کی کتابوں میں خاص اہمیت دی۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب چہارم

ہندوستان کے ملّی و مُلکی مسائل سے دلچسپی اور میدانی جدوجہد

ایک تضاد اور اس کا حل

اس تصنیفی ذوق کا جو کم سے کم تین پشتوں سے موروثی چلا آرہا تھا، خاندانی اُفتادِ طبیعت جو ہنگاموں اور سیاسی کاموں سے مناسبت نہیں رکھتی تھی، پھر عالم عربی کے حالات سے قلبی و ذہنی وابستگی اور اس کی وجہ سے عربی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانے، اس پر مستزاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی و تربیتی ذمہ داری، اور اس سب پر سونے پر سہاگہ کا کام کرنے والے اس ذوق کا تقاضا تھا (جو رائے پور کی خانقاہ اور اس کے ذکر و فکر کے حلقہ سے ملا تھا اور اس کو خاندانی اثرات نے دو آتشہ بنادیا تھا) کہ زندگی کا بقیہ حصہ اور خدا کی بخشی ہوئی بُری بھلی صلاحیتیں اور توانائیاں تحریر و تصنیف کے کام میں یا تعلیم و تربیت کے میدان میں، یا ذکر و فکر کے حلقہ میں (اور اس سب کے لئے گوشۂ عافیت اور پرسکون ماحول کی ضرورت تھی) صرف کردی جائیں، ان موروثی اور مزاجی خصوصیات کی بناء پر اگر کوئی صاحبِ نظر پیشین گوئی کرتا تو یہی کرتا کہ میں ایک مصنف یا معلم یا ایک طالب سلوک کی حیثیت سے بقیہ زندگی گذاروں گا، اور مجھے ملک و ملت کے مسائل اور گردوپیش میں پیش آنے والے واقعات و حوادث سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن لوگوں نے اچانک دیکھا کہ میں کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے ایک داعی بلکہ بانیوں میں سے ایک بانی کی حیثیت سے میدان میں آیا، میں نے ملک و ملت کے مسائل سے دلچسپی لینی شروع کی، مجلس مشاورت کے وفد کے ساتھ بہار، اڑلیسہ، گجرات اور ریاست میسور کے طویل دورے کئے، جابجا تقریریں کیں، "ندائے ملت" کے صفحات پر میرے وہ مضامین شائع ہونا شروع ہوئے جن میں ملک کے موجودہ رخ پر شدید تنقید، ملت اسلامی کے لئے خطرات کی نشاندہی، اور مسلمانوں کو اس ملک میں باعزت زندگی گذارنے بلکہ اس کی اخلاقی و اصولی قیادت کرنے کے لئے مشورے دیئے گئے تھے۔

یہ ایک تضاد تھا یا ایک طرح کی پہیلی تھی جس کا بوجھنا ان دوستوں کے لئے جو میرے خاندانی مزاج و روایات اور میرے بچپن سے اس وقت تک کے حالات و رجحانات سے واقف تھے، آسان نہیں تھا، بہت سے دوستوں نے اپنے اپنے طرز پر اس کی توجیہ کی، کسی نے اس کو وقتی جوش و تاثر پر محمول کیا، کسی نے بیرونی اثرات اور قریبی ساتھیوں کا اثر بتایا، کسی نے اس کو خام خیالی اور ناتجربہ کاری پر محمول کیا، بقول مولانا روم ؒ ؎

ہر کسے از ظنِّ خود شد یارِ من
واز درون من نہ جست اسرار من

اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ایک ایسے دور میں جب حکومتوں کا دائرۂ عمل محاصل کی وصول یابی، انتظام مملکت اور دفاع تک محدود نہیں رہا ہے، وہ زندگی کے ہر شعبہ میں دخل دے سکتی ہیں، اور ہر شعبہ کے لئے نئے نئے قوانین بنا سکتی ہیں، پورے ملک کے لئے مشترک عائلی قوانین (UNIFORM CIVIL CODE) بنا سکتی ہیں، نئی نسل کی مخصوص ذہنی و اخلاقی تشکیل کے لئے، نیا نظام و نصابِ تعلیم وضع کر سکتی ہیں، جو نئی نسل کے عقائد، مسلمات

www.abulhasanalinadwi.org

تک پر اثر انداز ہو سکتا ہے' اور اس کا رشتہ اپنے ماضی اور اپنی تہذیب و ثقافت سے منقطع کر سکتا ہے' زبان و رسم الخط کی تبدیلی کا بھی اختیار رکھتی ہیں' یہ حکومتیں عمومی انتخابات کے ذریعہ وجود میں آتی ہیں' اور ٹوٹتی ہیں' ایسے دور میں جب حکومتوں کا دائرہ اتنا وسیع اور پوری زندگی پر حاوی ہے' اور ایسے ملک میں جہاں' اپنے حق رائے دہندگی' سیاسی اثر و نفوذ اور دانشمندی کے سوا کوئی ذریعہ اپنے تحفظ یا کسی خطرہ کو روکنے کا نہیں ہو سکتا' ایک ایسی ملت ملک کی سیاسیات اور جمہوری طریقہ سے اثر انداز ہونے سے کیسے کنارہ کشی اختیار کر سکتی ہے' جس کے دین کا دائرہ اور تصور پوری زندگی پر محیط ہے' وہ "مذہب بندہ اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے" کے مسیحی تصور پر یقین نہیں رکھتی' اس کا مذہب دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں (زندگی پر حاوی اور محیط ہونے کی وجہ سے) زیادہ ذکی الحس اور جلد متاثر ہونے والا ہے' اس ملت کے لئے جو لوگ سیاست کو شجرۂ ممنوعہ نہیں بلکہ "الشجرة الملعونة فی القرآن" کے تصور کی تلقین کرتے ہیں' اور اس کو ذہنی اور عملی عزلت کا مشورہ دیتے ہیں' یا اس کو اس کی تلقین کرتے ہیں کہ پارسی اور مارواڑیوں کی طرح محض رفاہی و خیراتی ادارے قائم کرنے یا اپنے اقتصادیات اور اپنی مالی پوزیشن کو مضبوط کرنے یا تعلیم کا معیار بلند کرنے کی طرف کلیۃً متوجہ رہیں' وہ حقیقت میں مسلمانوں کو اجتماعی و ملی خودکشی کا مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان اس طرح نہ اپنی ملی تشخصات کی حفاظت کر سکیں گے نہ اپنے فرائض و شعائر دینی اور عائلی قوانین کے ساتھ باقی رہ سکیں گے' نہ اپنا اعتقادی و تہذیبی تسلسل برقرار رکھ سکیں گے' اور قیادت و دعوت کا مسئلہ تو الگ رہا (جو اس ملت کا حقیقی منصب ہے) اس ملک میں آزادانہ باعزت طریقہ پر زندگی بھی نہیں گذار سکیں گے۔

میرا جس مخصوص علمی و ذہنی ماحول میں نشو و نما ہوا تھا' اور جس کا زندگی کے حقائق

www.abulhasanalinadwi.org

اور باہر کی زندگی سے برابر رابطہ رہا اس نے مجھے کبھی یہ طرز فکر اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی' اور میں اس مخصوص دور اور ملک میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے ملی مسائل کی اہمیت اور ان کے لئے جدوجہد کی ضرورت سے کبھی آنکھیں نہیں بند کرسکا، اس تعلیم و تربیت کا بھی اثر تھا کہ میں نے اپنے اصلی علمی و دینی رجحان اور تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے باوجود ان مسائل سے دلچسپی لی اور کم سے کم جو لوگ ان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے' ان کی میرے دل میں عزت' اور ان کے کام کی قدر و وقعت پیدا ہوئی اور جب موقعہ آیا میں نے اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کے ساتھ تعاون میں کمی نہیں کی۔

ایک اہم انٹرویو

اتفاق سے "ندائے ملت" ۱۹۷۱ء کے ایک شمارہ (۲۱ فروری ۱۹۷۱ء) پر نظر پڑی جس میں اس کے ایک نمائندہ[۱] نے اس سلسلہ میں مجھ سے ایک انٹرویو لیا تھا، اور اس تضاد کو حل کرنے کی کوشش کی تھی' اس سوال و جواب میں نہ صرف اس تضاد کا حل آگیا ہے' بلکہ اس دور کے ماحول پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے جس کو دکھائے بغیر یہ خود نوشت سوانح مکمل نہیں ہوسکتی، یہاں اختصار اور انتخاب کے ساتھ اس کا ضروری حصہ پیش کیا جاتا ہے۔

سوال:۔ ابھی آپ کی تازہ تصنیف "حیات عبدالحیؒ" شائع ہوئی' اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ اور آپ کے دادا، پردادا سب خاموش علمی اور دینی مزاج کے بزرگ تھے، جن کا اصلی ذوق اور پسندیدہ مشغلہ تصنیف و

[۱] یہ نمائندہ عزیزی مولوی نذر الحفیظ ندوی تھے' جو دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جامع ازہر سے فراغت کے بعد اس وقت دارالعلوم میں مدرس ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

تالیف اور تصوف وسلوک تھا، ۱۹۶۴ء سے پہلے ہمیں آپ کی بھی کسی عملی سیاسی دلچسپی کا علم نہیں، علم ومطالعہ اور تصنیف وتالیف کے ساتھ سیاست کا نباہ ہمیشہ سے مشکل رہا ہے، اور اس کو شیشہ وآہن اور پنبہ وآتش کا ساتھ سمجھا گیا ہے، آپ کے لئے سیاست کے میدان میں آنے کا کوئی خاص محرک پیش آیا، اور آپ کے مزاج میں واقعتاً کوئی تبدیلی ہوئی ہے، یا اس کی حیثیت محض ایک شہرت اور تہمت سے زیادہ نہیں؟

جواب: آپ کا یہ استعجاب بے جا نہیں، واقعی جو میرے خاندانی بزرگوں کے حالات سے واقف ہیں، ان کو اس میں ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے۔

لیکن آپ شاید بھول گئے کہ میرے خاندانی بزرگ مختلف دوروں میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور دین کی سربلندی کے لئے میدان میں آتے رہے، اور اس کے لئے انھوں نے بارہا اپنے گوشۂ عافیت اور اپنے محبوب مشاغل کو خیرباد کہا، ان میں تیرہویں صدی ہجری کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ کا نام اور کام سب سے زیادہ روشن ہے، یہ بھی آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے عنفوان شباب ہی میں ان کی سیرت لکھی جو "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے نام سے ۱۹۳۹ء میں چھپ کر مشہور ومقبول ہو چکی تھی، اس کتاب کے سلسلہ میں قدرتاً ان کی دعوت وعزیمت کے پہلو کو سب سے زیادہ نمایاں اور اجاگر کرنا پڑا، ایک مصنف کی حیثیت سے بھی اور خاندانی تعلق اور عقیدت کی بناء پر بھی اس نوعمری میں اس کا دل ودماغ پر اثر پڑنا اور پیوست ہو جانا ایک قدرتی امر تھا، اس سے یہ نقش لوح دل پر ثبت ہو گیا کہ اقبال کے الفاظ میں "خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات" پر "وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل" کو ہمیشہ ترجیح حاصل رہے گی[1]

---

[1] اقبال کا شعر ہے ۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل   یا خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن اس یقین و ذوق پر رفتہ رفتہ میرے علمی و تصنیفی مشاغل غالب آتے چلے گئے، اور انھوں نے پھر مجھے مطالعہ و تصنیف کے گوشۂ عافیت میں پہونچا دیا لیکن دل کی یہ خلش برابر قائم رہی کہ جب پورے ماحول میں بگاڑ پھیل گیا ہو اور اس کشتی میں سوراخ ہو جس میں ہم سب سوار اور ہمارا سارا انسانی اور ملّی اثاثہ بار ہے، ان مشاغل اور کوششوں کا کہاں تک جواز ہے، جن کا فائدہ چند افراد تک محدود اور جن کے نتائج سالہا سال کی مدت میں ظاہر ہوتے ہیں؟ اس کا پہلا نتیجہ وہ سفر تھا جو میں نے ۱۹۶۴ء میں کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا کا کیا[۱]، اور اس کے نتیجہ میں مسلم مجلس مشاورت کے قیام و تشکیل میں نہ صرف شریک رہا بلکہ اس کے داعی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس کے انعقاد کی وجہ سے اس کے اصل میزبان بننے کی ذمہ داری قبول کی، اس وقت ایک طرف ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد و اعتماد بحال کرنے، عداوت اور نفرت دور کرنے، اور انسانیت و ہم وطنی کے احترام کی طرف مائل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ پرسکون فضا اور معتدل (NORMAL) حالات میں ہر طرح کے تعلیمی، تعمیری، اصلاحی اور تحقیقی کام کئے جا سکیں، اور ملّتِ اسلامی نہ صرف اپنا تسلسل باقی رکھ سکے، بلکہ اس ملک اور اہل ملک کو صحیح راستہ اور روشنی دکھا سکے، اور اس طرح خیر امۃ کا فرض انجام دے سکے، دوسری طرف مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے، حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت، اور اپنے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ان کو ایک اسٹیج پر لانے اور ان کی مختلف جماعتوں کے (توڑنے یا ایک جماعت میں مدغم کرنے کے بجائے) ایک وفاق بنانے کا خیال پیدا ہوا، جو مشترک مقاصد پر متفق اور اپنے خصوصی کاموں میں بدستور سرگرم رہیں، یہ وہ پس منظر تھا جس میں ۱۵، ۱۶؍ اگست ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی،[۲]

---

[۱] تفصیل حصہ اول میں گذر چکی ہے۔ [۲] ایضاً

www.abulhasanalinadwi.org

اور میں نے اس کے وفد کے ساتھ بہار، اڑیسہ اور گجرات کا دورہ کیا، جس میں تعمیری پُر مغز اور روح پرور تقریریں ہوئیں، سچی حب الوطنی، صحیح انسان دوستی، انسانی جان و مال، اور عزت و آبرو کی قدر و قیمت کا بڑی طاقت اور خوبی سے احساس دلایا گیا، ملک کے لئے حقیقی خطرہ کی نشان دہی کی گئی، ایک طرف مختلف الخیال مسلمانوں کو، دوسری طرف دور دور رہنے والوں اور ہندو مسلمانوں کو بار بار مل کر بیٹھنے اور قریب سے ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔

سوال:۔ معاف کیجئے گا آپ نے ملک کی سیاسیات اور انتخابات میں مسلمانوں کے طرز عمل کے تعیّن کے مسئلہ سے کیوں دلچسپی لی؟ جبکہ آپ کا مزاج بالکل غیر سیاسی اور زندگی خالص دینی و علمی گذری ہے۔

جواب:۔ ۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات کے موقعہ پر میرے ذہن پر اس بات کا غلبہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں اپنا سیاسی وزن ثابت کرنے کے لئے اور اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہ وہ پاسنگ یا فیصلہ کن طاقت کا درجہ رکھتے ہیں کسی سیاسی پارٹی یا حکمراں جماعت کے پابند نہ رہیں، اور اپنے حق رائے دہندگی کا آزادانہ استعمال کریں، یہ وہ زمانہ تھا جب یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل اور قسمت مستقل طور پر کانگریس سے وابستہ ہے، اور مسلمانوں کے ووٹ اس کی جیب میں پڑے ہوئے ہیں، ہم یہ چاہتے تھے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مسلمانوں نے کسی جماعت کے نام خطّ غلامی نہیں لکھ دیا ہے، میں اس وقت بھی اس خیال کا تھا، اور اب بھی اس خیال کا ہوں کہ مسلمانوں کو کبھی کبھی اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ جس طرح ان میں نفع پہونچانے کی صلاحیت ہے، ضرر پہونچانے کی بھی صلاحیت ہے (اچاہے وہ اپنی شرافت سے کسی وقت اس کا ثبوت نہ دیں) تاکہ کوئی جماعت ان کو صرف نفع کا ذریعہ سمجھ کر ان کے حقوق و مسائل سے مسلسل چشم پوشی نہ برتے، میں اس وقت اکثر اقبال کے

www.abulhasanalinadwi.org

یہ دو شعر پڑھتا تھا ؎

تمیز خار و گل سے آشکارا | نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے | اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری[1]

ریاست میسور کا اہم دورہ

حصۂ اول میں بہار، اڑیسہ اور گجرات کے ان دوروں کا ذکر گذر چکا ہے، جو مسلم مجلس مشاورت کے مؤقر اور نمائندہ وفد کے ساتھ ان ریاستوں میں کئے گئے، اس سلسلہ کے سب سے اہم اور طویل دورہ کو جو ۱۱ر نومبر سے ۲۲ر نومبر ۱۹۶۶ء تک ریاست میسور میں کیا گیا اس حصۂ دوم کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس کا آغاز ۱۹۶۵ء کے بعد سے ہوتا ہے، یہ ساڑھے چار ہزار میل کا طویل دورہ تھا، جو مسلم مجلس مشاورت کے اس وفد نے کیا جس میں تقریباً تمام اہم ارکانِ مجلس اور شریک جماعتوں کے ذمہ دار نمائندے شریک تھے، بلکہ وہ ایک ایسا طویل و وسیع اور مؤثر دورہ تھا جو ہندوستان کی شاید کسی منظم جماعت نے ماضی قریب میں نہیں کیا ہوگا، اس تاریخی دورہ کی روئیداد خود مصنف نے اختصار کے ساتھ قلم بند کی وہ پہلے "ندائے ملت" کے شماروں میں شائع ہوئی، پھر "بارہ دن ریاست میسور میں" کے نام سے الگ رسالہ کی شکل میں شائع ہوا[2]، اس سلسلۂ مضامین کا آغاز غلام ہمدانی مصحفی کے اس معنی خیز شعر سے کیا گیا ؎

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم | کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

---

[1] "ندائے ملت" لکھنؤ، شمارہ ۲۱ر فروری ۱۹۷۱ء۔

[2] یہ رسالہ انجمن طلبائے قدیم دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع کیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس سے مسلم مجلس مشاورت کے بلند مقاصد، شاندار آغاز، مبہم مستقبل اور نامعلوم منزلوں پر بڑے لطیف طریقہ پر روشنی پڑتی تھی، ادیب شہیر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مکتوب میں اس شعر کے انتخاب پر بڑی داد دی۔

مجموعی طور پر اس وفد نے جو مسافت طے کی وہ تقریباً ساڑھے چار ہزار میل کی تھی، اس میں سے تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کی مسافت بس سے طے کی گئی، قافلہ نے اپنا سفر بذریعہ بس مدراس سے شروع کیا، اور گلبرگہ پر ختم کیا، وفد ۳۶ مقامات سے گذرا جن میں سے ۱۵ وہ بڑے شہر اور اہم مقامات تھے جہاں عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے اور ارکان وفد نے پُر اثر اور ولولہ انگیز تقریریں کیں، ۲۱ راستہ کے وہ چھوٹے مقامات تھے، جہاں ارکان وفد کا بڑے بڑے مجمعوں نے استقبال کیا، شرکا نے وفد کی گُل پوشی کی، ان کے اعزاز میں اہلِ قصبہ یا میونسپلٹی کے چیرمینوں نے جن میں بڑی تعداد غیر مسلم حضرات کی تھی استقبالئے دیئے، ایڈریس یا خیر مقدمی قصائد پڑھے گئے، اور صدر محترم ڈاکٹر سید محمود صاحب نے یا ارکان وفد نے ان کا جواب دیا، اور مجلس کا پیغام پہونچایا۔

وفد کا استقبال اور جوش وخروش

استقبال کرنے والوں کا خلوص، ان کی مسرت اور ان کا جوش وخروش دیکھنے کے قابل تھا، ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ایسا نظارہ بھی تحریک خلافت کے بعد دیکھنے میں نہ آیا ہوگا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنوبی ہند کا یہ خطہ ملک کی پوری آبادی کو محبت واتحاد اور ملتِ اسلامیہ کو جرأت واعتماد کا پیغام دینے والوں کے استقبال کے لئے امنڈ آیا ہے، اس دورہ سے اندازہ ہوا کہ اہل ملک کے ضمیر میں محبت کی کیسی چنگاری، قبول حق کی کتنی صلاحیت اور سلامت روی

www.abulhasanalinadwi.org

کا کتنا مادہ ہے، اور اگر بے لوث و بے غرض، خود آگاہ و خدا ترس، خادم ملک و ملت، سیاسی اغراض اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اس ملک کے سیدھے سادے باشندوں، خاموش مگر گرم جوش عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کریں اور ان کے دماغ سے زیادہ ان کے دل وضمیر کو خطاب کریں تو وہ کس طرح پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں، یہ پورا خطہ جو صرف جنوبی ہند نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتا تھا زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا، اور دشت وجبل سے یہی صدا آرہی تھی ؎

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

سلطان شہید کے مدفن پر

اسی سفر میں پہلی مرتبہ ۱۴ رنومبر کو سلطان شہید ٹیپو کے مشہد و مدفن (سرنگاپٹن) پر حاضر ہوا جب سے ہوش کی آنکھیں کھولیں اور دل و دماغ نے اپنا کام شروع کیا سلطان شہید کی عقیدت و محبت جسم و جان میں پیوست ہوتی چلی گئی، جہاں تک راقم کا تعلق ہے اس کے روحانی روابط اس سے زیادہ وسیع و عمیق تھے جتنے اکثر رفقاء کے تھے، جیسا کہ کتاب کے حصہ اول کے ابتدائی اوراق سے معلوم ہوا، ہماری خاندانی روایات اور بعض تاریخی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شہید کے خاندان کو سید شہیدؒ کے خاندان سے روحانی ارتباط رہا ہے، سلطان کے مزار سے باہر آکر ہمارے رفیق قافلہ ابراہیم سلیمان سیٹھ نے مولانا ظفر علی خاں کا شعر جو واقعہ کی سچی تصویر بھی تھا، اور حسب حال بھی، پڑھا جس سے سامعین پر عجیب کیفیت طاری رہی ؎

اس کے اٹھتے ہی مسلماں کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

خلوت در انجمن

اس سفر میں میر جعفر علی صاحب بنگلوری جو علی گڑھ کے گریجویٹ اور اردو، فارسی انگریزی کا بڑا اچھا ذوق رکھنے والے تھے[له] بڑا وقت میرے ساتھ صرف کرتے بس میں وہ "کلیات اقبال" لے کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ سنا ہے کہ آپ کو اقبال کے کلام سے بڑا شغف ہے، اگر اجازت ہو تو میں کچھ سناؤں، میرے ایماء پر انھوں نے بڑے ترنم اور جوش کے ساتھ اقبال کی یہ نظم پڑھی جس کا مطلع ہے۔ ع

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اس وقت سے یہ معمول ہو گیا کہ میں اپنے معمولات سے فارغ ہوا اور انھوں نے چلتی ہوئی بس میں نغمہ سرائی شروع کر دی، اور کلام اقبال کی میری پسندیدہ نظمیں سنانی شروع کیں، اس طرح راستہ بڑا اچھا گذر جاتا، اور بس کے شور میں "خلوت در انجمن" کا لطف آتا اور

له بعد میں وہ "پیام انسانیت" کے پرجوش وفاضل داعی اور مقرر بن گئے تھے، وہ اردو، انگریزی میں یکساں قدرت کے ساتھ تقریر کرتے تھے، پسماندہ طبقات کی انجمن (DALIT) اور اس کے رہنماؤں سے بھی ان کا قریبی تعلق تھا، اور وہ ان سے بڑے مانوس اور ان سے محبت کرنے والے تھے، الامین کالج کی پروفیسری سے ریٹائرڈ ہوئے، ۸ر نومبر ۱۹۸۲ء دوشنبہ کے روز اچانک انتقال کا واقعہ پیش آیا، دعوت پیام انسانیت اور جنوبی ہند کے علمی، ادبی حلقہ میں بڑا خلا چھوڑ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے رحمہ اللہ تعالیٰ۔

www.abulhasanalinadwi.org

یہ نغمہ سرائی محترم رفقائے سفر کے سکوت اور تخلیہ میں مخل نہ ہوتی، جن میں سے بعض مصروف تکلّم اور بعض محوِ خواب ہوتے۔

اس سفر میں میرا زیادہ تر قیام علمی اور دینی مناسبت کی وجہ سے مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی صاحب، اور مولانا ابو اللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی کے ساتھ رہتا۔

حکومتوں کا انقلاب اور جاہ و اقبال کی بے ثباتی

اس سفر میں میں نے بلگام اور بیجاپور اور تال کوٹ (جو جنوبی ہند کا پانی پت تھا) کے تاریخی شہر بھی دیکھے، اور مرکارا اور شموگہ کے خوبصورت مقامات بھی، دنیا کی بے ثباتی اور جاہ و اقبال کی بیوفائی، زمانہ کے انقلابات کا نقشہ دیکھ کر دل سرد ہو گیا، اور یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتانِ آزری

یہ سفر اور دورے کا پروگرام جس کی منصوبہ بندی مولوی سراج الحسن صاحب اور ڈاکٹر جمال احمد صاحب امین آبادی صاحب نے بڑی خوبی سے کی تھی، ۲۲ نومبر کو گلبرگہ کی تاریخی اور دل آویز سرزمین پر ختم ہوا، جس کو سلسلہ چشتیہ کے گلِ سرسبد اور جنوبی ہند کے عظیم ترین مرشد حضرت سید محمد گیسو دراز کا مسکن و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، ہمارا قیام بھی درگاہ کے مہمان خانہ میں ہوا، شب میں عظیم الشان جلسہ ہوا، معلوم ہوتا تھا کہ شہر کی ساری مسلم آبادی جو جلسہ میں آنے کے قابل ہے جلسہ میں آگئی، یہاں راقم سطور کی تقریر اس تاریخی دورہ کی

www.abulhasanalinadwi.org

آخری تقریر تھی۔

گلبرگہ کی تقریر: دوام و استقبال کی ضمانت، اور عوام کا عدم احتساب اقتدار کے لئے مضر

گلبرگہ کی فضا، اہل شہر کا خلوص و محبت، دورہ کے اختتام کا احساس، تقریر دل کھول کر کی گئی، پہلے مسلمانوں کا منصب و مقام، ان کے فرائض و ذمہ داریاں بیان کی گئیں، اور بتایا گیا کہ تمام صوفیائے کرام جن کی ایک اہم کڑی وہ بزرگ ہیں جو یہاں آسودۂ خاک ہیں، اس ملک میں ایک پیغام و دعوت لے کر آئے تھے، ان کا مقصد زندگی دعوت و خدمت تھا، ان کی نظر لینے سے زیادہ دینے پر، فائدہ اٹھانے سے زیادہ فائدہ پہونچانے پر، طلب و سوال سے زیادہ بذل و نوال پر تھی، اس لئے وہ محبوب و مخدوم تھے ؎

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفی
کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

پھر ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی، اور کہا گیا کہ کسی حکمراں پارٹی کا یہ سمجھ لینا کہ وہ ناقابل تبدیل ہے، اور کسی ملک کی حکومت دائمی طور پر اس کے نام لکھدی گئی ہے، اس جماعت کے لئے سخت مضر ہے، اور اس ملک کے لئے بھی نہایت خطرناک ہے، وہ شخصی سلطنتیں جو آپ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، گلبرگہ کی بہمنی سلطنت، بیدر کی برید شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی، گولکنڈہ کی قطب شاہی، احمدنگر کی نظام شاہی اور برار کی عماد شاہی، اس کی بہترین مثال ہیں، ان خاندانوں میں اچھے سے اچھے فرمانروا پیدا ہوئے، یہ سلاطین خدا اور رسول کو پہچانتے تھے، ان میں سے بہت سے لوگ دین کا بھی اچھا علم رکھتے تھے، بہت سے نیک اور پرہیزگار تھے، لیکن جب ان کو یہ احساس ہونے لگا کہ

www.abulhasanalinadwi.org

ہم کو کوئی ہٹا نہیں سکتا اور ہمارے خاندان سے سلطنت منتقل نہیں ہوگی، اور اس ملک کا پٹہ ہمارے نام لکھ دیا گیا ہے، تو انھوں نے بے عنوانیاں شروع کیں، ان سے بڑی بڑی زیادتیاں ہوئیں، انھوں نے نڈر اور بے خوف ہو کر کارروائی شروع کی، یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ جب اس کو اپنی قوت و دولت کا احساس ہوتا ہے، اور حکومت کا نشہ اس پر سوار ہو جاتا ہے تو سرکش و بے لگام ہو جاتا ہے، قرآن مجید میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ ۝ (العلق-٦-٧)

ہرگز نہیں، بے شک انسان سرکشی پر کمر باندھ لیتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ اب وہ مستغنی اور بے نیاز ہے۔

اگر جمہوری حکومتوں اور پارٹیوں کو بھی اس کا احساس ہو جائے کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا، ان کی رعیت ان کا احتساب نہیں کر سکتی، وہ غلطیاں زیادتیاں کر کے بھی اقتدار و حکومت سے محروم نہیں ہوں گی، تو ان میں اور شخصی فرمانرواؤں میں کوئی فرق نہ ہوگا، ہم کو اپنے جمہوریہ میں یہ نظیر قائم نہیں کرنی چاہیئے، اور اپنے حکمرانوں اور نمائندوں کو یہ اطمینان نہیں دلانا چاہیئے کہ حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور وہ اٹل ہے، اس لئے ہم کو اپنے حق رائے دہندگی کو صحیح طور پر استعمال کر کے جب کبھی ضرورت ہو حکومت میں تبدیلی کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور بہتر آدمیوں کے لانے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے تاکہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہے ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہیں، اور اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر سکیں۔

مسلمانوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو چیز ضروری ہے وہ دستور اور ملک کے ساتھ وفاداری ہے، کسی پارٹی یا حکومت کی وفاداری ہرگز ضروری نہیں، اگر ایسا ہوتا تو حکومتوں

www.abulhasanalinadwi.org

میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، حالانکہ جمہوریت کی بقا اور ملک کی حفاظت اور ترقی کے لئے یہ بات ضروری ہے۔

پھر مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ مادّی زندگی کی آسائشوں اور عام شہری حقوق کے حصول پر قناعت نہ کریں، وہ پورے خلوص اور جوش کے ساتھ اس کا مطالبہ بھی کریں، اور اس کے لئے جدوجہد بھی، کہ وہ اپنے تمام ملّی تشخصات، اور اپنی پوری تہذیب و ثقافت اور اپنی پوری مذہبی آزادی کے ساتھ اس ملک میں رہیں گے، ہم کو کسی حال میں ان کتّوں کے پست مقام پر نہیں اتر آنا چاہیے جن کو اگر راتب مہیّا کر دیا جائے تو وہ مطمئن اور قانع ہو جاتے ہیں۔

ایک اہم مکتوب

اسی عرصہ میں مجلس مشاورت کی تاریخ میں کچھ ایسے مرحلے اور ملک میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن میں اس کو بڑی احتیاط سے فیصلہ کرنے اور عزم و حزم کے ساتھ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی ضرورت تھی، عمومی انتخابات سامنے تھے، اور مسلمانوں کو اس میں ایک باعزت قوم کی طرح اپنے طرز عمل اور کردار کا تعیّن کرنا تھا، اس موقعہ پر راقم نے ڈاکٹر سید محمود صاحب کو ایک طویل خط لکھا جس میں اپنے اندیشے اور مشورے وضاحت کے ساتھ ظاہر کئے، اس خط میں میرا الملک کا سیاسی مطالعہ اور ملّی شعور ابھر کر سامنے آگیا ہے، اس لئے اس کو مکمل طور پر نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا، اس خط پر ۲۸ ر دسمبر ۱۹۶۶ء کی تاریخ ہے۔

"مخدومی و معظمی جناب ڈاکٹر صاحب زید مجدہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔ الحمدللہ روز سے

www.abulhasanalinadwi.org

رکھنے کی توفیق ہو رہی ہے، پچھلا رمضان پورا اسپتال میں گذرا، ایک روزہ بھی نہیں رکھ سکا، میری تکلیف سردی ہی میں شروع ہوئی تھی، اس لئے خاص طور پر احتیاط کرنی پڑتی ہے، صحت کو بالخصوص آنکھوں کو شیشہ کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھنا پڑتا ہے، خدا کرے ماہ مبارک پورا روزے اور خیریت کے ساتھ گزر جائے۔

مجھے آپ کی شفقت و عنایت اور خصوصی تعلق پر جو ناز ہے، اس کی بناء پر اس سے پہلے بھی بڑی بڑی جرءتیں کرتا رہا ہوں اور طویل عریضے بھیجتا رہا ہوں، الحمد للہ کہ آپ نے ہمیشہ نہ صرف اس کو گوارا فرمایا، اور اجازت دی، بلکہ میری حقیر معروضات پر بعض بڑے فیصلے بھی فرمائے، مجلس مشاورت چونکہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے حق میں عزت و ذلت کامیابی و ناکامی کا ایک نشان و امتحان بن گئی ہے، جہاں تک میری حقیر ذات کا تعلق ہے، اس کی یہ آخری اجتماعی دلچسپی اور میدانی سرگرمی ہے، اس لئے اس کی حیثیت میرے لئے قریب قریب ویسی ہو گئی ہے جیسی ایک آنکھ کی روشنی جانے کے بعد میرے لئے دوسری آنکھ کے باقی رہنے کا سوال ہے، عام دعاؤں کے علاوہ ادھر کئی مہینے سے سوائے کسی مجبوری کے کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ میں اس کے لئے استخارہ کی نماز نہ پڑھتا ہوں، اور خدا سے یہ دعا نہ کرتا ہوں کہ ہم سب ذمہ داران مجلس کو صحیح راہ دکھائے اور صحیح بات ہمارے دل میں ڈالے، اللہ تعالیٰ نے مجلس کو جو خلاف قیاس اور خلاف توقع مقبولیت اور ہر دل عزیزی عطا فرمائی ہے، وہ اس کے کارکنوں کی قابلیت، یا ان کی سرگرمیوں کا نتیجہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد و نصرت اور اس عنایت کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ ہندوستان کی اس ملتِ اسلامیہ پر مبذول رہی ہے، یا آپ کے بزرگوں کے اخلاص و ایثار کا نتیجہ ہے، اور خدا کی عنایت خاص ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے اس کی دعوت دلوائی اور آپ کے گرد

www.abulhasanalinadwi.org

مسلمانوں کے منتشر و متضاد عناصر کو جمع کر دیا ہے

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب مجلس ایک بار پھر ایک نہایت نازک مرحلہ پر پہونچ گئی ہے، اس موقعہ پر بھی آپ ہی کی عزیمت، ایثار، قربانی اور قوت فیصلہ کی ضرورت ہے۔

گزشتہ فسادات میں مسلمانوں کو اس ملک میں اپنی جان ومال، عزت وآبرو کے بے قیمت و بے حقیقت ہونے کا شدت سے احساس ہوا، دوسری طرف ان کی زندگی کے بنیادی مسائل (تعلیم، زبان، ملّی ادارے) کے بارے میں حکومت نے مسلسل جس بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا، اس سے ان کو اپنے بے وزن اور غیر مؤثر ہونے کا تجربہ ہوگیا اور یہ بھی اچھی طرح سے ثابت ہوا کہ اس ملک میں مسلمانوں کو اپنے وزن کا ثبوت دینا پڑے گا اور اپنے مؤثر ہونے کا مظاہرہ کرنا پڑے گا، اس لئے کہ جیسا کہ میں نے آپ کی موجودگی میں بھی اپنی تقریروں میں بار بار کہا ہے کہ ہمیں اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے، نیز... ان مسائل کو جو ہمارے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں حل کرنے کے لئے مجبوراً نفع نقصان کی زبان استعمال کرنی پڑے گی، اس لئے کہ اس دور میں سود و زیاں کی منطق کے سوا کوئی منطق قابلِ اعتناء نہیں، اسی بناء پر ہم لوگوں نے (جن میں میں پیش پیش تھا) ۲۲ر جولائی ۱۹۶۶ء کے جلسہ میں اس پر اصرار کیا کہ منشور میں یہ عبارت (جو خوش قسمتی سے آپ ہی کی زبان سے نکلی تھی) ضرور بڑھائی جائے کہ "ہندوستان کے مسلمانوں نے کسی پارٹی کے نام خطِ غلامی نہیں لکھا ہے" میں نے اس سلسلہ میں آپ کو بہت آزردہ کیا، اور آپ سے بے جا حد تک ضد کی لیکن آپ نے شفیق بزرگ کی طرح عزیز بچہ کی سی ضد پوری کر دی، میں پورے وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ

www.abulhasanalinadwi.org

اس حملہ نے ایک طرف مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کردی جس کا اظہار عملی طور پر ریاست میسور کے دورہ میں ہوا، مسلمانوں نے جس جوش و خروش، جس خلوص و گرمجوشی کے ساتھ وفد کا استقبال کیا، اور جس طرح آنکھیں اور دل ان کے راستہ میں بچھائے' اس کے پیچھے یہی مسرت اور اعتماد کام کر رہا تھا کہ ہمارے قائدین خودشناس و خودنگر ہیں، وہ ملت کے صحیح مقام کو پہچانتے ہیں' اور وہ کسی سیاسی جماعت کا ضمیمہ نہیں ہیں' دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں اور خود حکمراں پارٹی میں بھی یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی اجتماعی قیادت جو خود وقت کا ایک معجزہ ہے' ایک اونچے مقام سے بات کرتی ہے' اور اس سے ملت کا سودا نہیں ہو سکتا' مجلس کا جلسوں اور کانفرنسوں کی شکل میں سارے ملک میں جو خیر مقدم ہو رہا ہے' اور اچانک مسلمانوں کے وزن میں جو اضافہ ہوا ہے' اور نیز اس احساس سے کہ مسلمان اس ملک میں ایک آزادانہ کردار ادا کر سکتے ہیں' اور انتخاب کی ترازو میں اپنا وزن ڈال کر کسی کو نفع نقصان پہونچا سکتے ہیں' اس کی توقع پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے مسائل کے بارے میں حکومت کا رویہ بدلے۔

لیکن نیشنلسٹ مسلمانوں نے اور خاص طور پر کانگریس کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدواروں نے اس میں خلل اندازی کی اور حکومت پھر اس غلط راستہ پر پڑ گئی کہ وہ مسلمانوں کے بارے میں مسلمانوں کی رائے عامہ اور ان کے اصل جذبات کے بجائے ایک ایجنسی پر اعتماد کرے، آپ کو معلوم ہے کہ میں ذاتی طور پر (آپ کو مستثنیٰ کر کے) اپنے رفقاء میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے خادم انسانیت اور خیر امت ہونے کی حیثیت کو نمایاں کرنے کا خواہشمند اور متمنی ہوں' میں نے کئی سال ہندوستان کے اجتماعوں میں جن میں ۸-۸ ہزار' ۱۰-۱۰ ہزار آدمی جمع ہوئے ہیں' قرآنی پیغام اور اسلام کی اخلاقی اور انسانی دعوت پیش کی ہے' اس کے دو مجموعے "پیام انسانیت" اور "مقام انسانیت" شائع بھی ہو چکے ہیں' اب بھی میرا اصل مزاج اور

www.abulhasanalinadwi.org

بڑی فکر یہی ہے لیکن ۶ کروڑ کی ملت کے ان مسائل کو جن پر بحیثیت ملت کے اس کی بقاء کا انحصار ہے، معلق نہیں چھوڑا جا سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب تک ہماری دعوت سننے کے لئے لوگ تیار ہوں، (جس کے لئے اس ملک کا موروثی تعصب و تکبر بری طرح سدِّ راہ ہے، نیز پاکستان کی موجودگی نے اس میں اور بھی الجھنیں پیدا کر دی ہیں) یہ ملت اپنے ملی وجود سے محروم اور ذہنی و تہذیبی ارتداد کا شکار ہو جائیگی۔

اس مطالعہ اور تجربہ کا حاصل یہ ہے کہ میں اپنی تمام ذہنی افتاد اور خاندانی روایات کے برخلاف انتخاب میں مسلمانوں کو مؤثر اور فیصلہ کن ثابت کرنے کے حق میں ہوں، اور اس انتخاب سے جس کے بعد پانچ سال تک انتظار کرنا پڑے گا، ضرور طاقتور پارٹی اور گورنمنٹ کو یہ تأثر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان غیر مطمئن اور بے چین ہیں، ان میں سیاسی شعور بیدار ہو چکا ہے، اور ملک کی سیاسیات پر اثر ڈال سکتے ہیں، ان کے مسائل کو حل کئے بغیر کوئی پارٹی مسلسل حکومت نہیں کر سکتی، اس لئے برسر اقتدار پارٹی کو سنجیدگی اور عزم کے ساتھ ان کے مسائل کو حل کرنا اور ان کو مطمئن کرنا پڑے گا، ملک کے استحکام اور سالمیت کا بھی تقاضا یہی ہے کہ یہ سبق حکومت کو دیا جائے اور کوئی پارٹی یہ سمجھنے نہ پائے کہ ملک کا پٹہ اس کے نام لکھ دیا گیا ہے، ورنہ اس میں قدیم شخصی سلطنتوں اور خاندانوں کی وہ سب کمزوریاں اور بے عنوانیاں پیدا ہو جائیں گی، جن سے ان حکومتوں کی تاریخ غبار آلود اور انسانیت کی پیشانی داغدار ہے۔

میں نے اپنے "بلگام" اور "گلبرگہ" کی تقریر میں اس مضمون کو بہت وضاحت سے بیان کیا تھا، اور کہا تھا کہ ان شخصی سلطنتوں میں جو خاص طور پر اس علاقہ میں صدیوں تک پھلی پھولیں، بڑے بڑے نیک سیرت، بلکہ فرشتہ خصلت انسان پائے گئے ہیں، ان میں

www.abulhasanalinadwi.org

اکثر مذہبی فرائض کے بڑے پابند تھے، ان میں سے متعدد دین و شریعت کے بڑے عالم، لیکن ان کو جب یہ اطمینان ہوگیا کہ ہمارا کوئی بگاڑ نہیں سکتا، اور اس ملک کا قبالہ ہمارے نام لکھدیا گیا ہے تو انھوں نے من مانی کارروائیاں کیں اور ان سے بڑے بڑے مظالم ہوئے، کانگریس پارٹی کی تو ایسی اخلاقی تربیت بھی نہیں ہوئی جیسی ان کی ہوئی تھی، اس لئے یہ احساس کہ ہم کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا، اور ہم لازوال ہیں، اور اس ملک کی اور خاص طور پر مسلمانوں کی قسمت ہمارے ساتھ وابستہ ہے، نہایت خطرناک ذہنیت پیدا کرے گا، اور اس ملک کو تباہ کرکے رکھ دے گا، اس لئے انتخاب کے موقع پر یہ سبق ضرور ملنا چاہئے کہ صورت حال ہمیشہ یکساں نہیں رہے گی، دوسرے مسلمانوں کی جیسی خود دار اور غیرت مند ملت کا یہ فرض ہے کہ وہ دستوری اور آئینی حدود میں رہ کر اپنی اس بے اطمینانی کا اظہار اور حکمراں پارٹی کو اس کے تغافل کی سزا ضرور دے، اسی بناء پر میری عرصہ سے آرزو تھی کہ جب چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذاتی رنجشوں اور ناانصافیوں پر راجہ جی اور اب آخر میں کرشنا منن جیسے لوگ کانگریس کو چھوڑ چکے ہیں، آپ جو اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے محبوب لیڈر ہیں، اس سے اسی بناء پر استعفا دے دیتے کہ میں اس کی پالیسی سے مطمئن نہیں ہوں، اور مسلمانوں کے مسائل کے حل کرنے میں وہ ناکام رہی ہے، اس لئے میں اب اس کا پابند نہیں ہوں۔

۱۳ر دسمبر کو دہلی میں مجلس کے جلسہ میں جو رزولیشن پاس ہوا، میرے خیال میں اس میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ان احساسات کی روح ہوتی جو میرے اس عریضہ میں بیان کی گئی ہے تو بہتر ہوتا لیکن میں اس موقعہ پر موجود بھی نہیں تھا، اور آپ سب حضرات نے پورے بحث و مباحثہ کے بعد اس کو منظور کیا، وہ اس حد تک غنیمت تھا کہ

www.abulhasanalinadwi.org

اس میں انتخاب کے بارے میں کچھ رہنمائی دی گئی، اور منفی کے بجائے کسی حد تک مثبت رویّہ اختیار کیا گیا، لیکن مجھے اندازہ تھا اور ہے کہ عام مسلمانوں کے جذبات کی اس سے تسکین نہیں ہوتی، اب اس میں درمیانی راستہ یہی ہو سکتا تھا کہ جیسا کہ پہلے بھی یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ صوبوں کو اپنے حالات کے مطابق کام کرنے کا موقعہ دیا جائے، اس کی اجازت دے دی جاتی کہ منشور کے رہنما اصولوں کے مطابق صوبوں کی شاخیں کام کریں، خاص طور پر یو۔پی، چونکہ ان زیادتیوں کی سب سے بڑی آماجگاہ رہا ہے، اور یہاں اس چھ مہینے میں (پرتاپ گڑھ کے اجلاس کے بعد) بہت وسیع پیمانہ پر کام کیا گیا ہے، اس لئے یہاں کے حالات کی خصوصی نوعیت ہے، مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر فریدی صاحب کی پریس کانفرنس سے آپ کو صدمہ پہونچا، میں نے ان سے وعدہ لیا ہے کہ اب وہ کوئی پریس کانفرنس نہیں کریں گے، اور کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہوگی جس سے مجلس کے گزشتہ رزولیشن، یا منشور سے بغاوت کا اظہار ہوتا ہو، لیکن آپ سے میری یہ خوردانہ اور نیازمندانہ درخواست ہے کہ اب آپ بھی اس سے درگذر فرمائیں، اور اب نہ مرکز سے کوئی ایسی بات ہو نہ صوبہ سے، جس سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو، اور عمل و فکر کا تصادم ظاہر ہو، اور نہ کوئی ایسی بات جس سے مسلمانوں کو مایوسی، یا اس بدگمانی کا موقعہ ہو کہ ان کے حقیقی جذبات کا اندازہ نہیں کیا جا رہا ہے، اور ان کے مسائل سے صرفِ نظر یا تغافل برتا جا رہا ہے، مجلس اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے، اور مسلمانوں کی کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے، جبکہ ان کے جائز تقاضوں اور جذبات کی جائز و ممکن حد تک ترجمانی کرے، اور ان کی تسلی ہو۔

یہ عریضہ میں بہت عجلت میں لکھ رہا ہوں نظر ثانی بھی نہیں کر سکا، اگر کہیں حدود سے

www.abulhasanalinadwi.org

تجاوز ہوگیا ہو تو بزرگانہ شفقت سے معاف فرمائیں۔

والسلام

نیاز مند

ابوالحسن علی

۱۵؍ رمضان المبارک

۱۸؍ دسمبر ۱۹۶۶ء تکیہ کلاں، رائے بریلی

مجلس مشاورت کا دور انتشار و اختلاف

لیکن ۱۹۶۷ء کے عمومی انتخابات بلاواسطہ مجلس کے لئے اور بالواسطہ مسلمانان ہند کے لئے بڑے نامبارک ثابت ہوئے، مجلس کی زندگی میں ابھی تک جس ابہام اور اجمال سے کام چل رہا تھا، انتخابات کی بے رحم اور سنگین منطق نے جو ریاضی کی طرح نظریات پر نہیں، بلکہ عملی فیصلہ پر، اور ابہام پر نہیں بلکہ تعین پر عقیدہ رکھتی ہے مجلس کے شیرازہ کو درہم برہم کردیا، جب ۱۹۶۷ء کے انتخابات کا معرکہ سر پر آگیا، ایک فریق جس میں ہمارے دوست ڈاکٹر فریدی پیش پیش تھے، اور میں اور میرے رفقاء بھی اجمالی طور پر اس کے مؤید تھے، یہ مطالبہ کررہا تھا کہ مجلس انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دے، اور خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں "ایک بار ثابت کردے کہ مسلمانوں نے کانگریس کے لئے خط غلامی نہیں لکھ دیا ہے"، بڑی کشمکش کے بعد یہ تجویز منظور ہوئی لیکن تجویز کا متن بڑے سلیقہ اور قابلیت کے ساتھ تیار کیا گیا جس میں ہمارے دوست مولوی محمد مسلم صاحب ایڈیٹر "دعوت" کی صحافتی لیاقت اور توازن دماغی کو بہت دخل تھا، اور جس کا رنگ اور اپیل سیاسی سے زیادہ اخلاقی و اصولی تھی، ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول ہم لوگوں کی

www.abulhasanalinadwi.org

مروت میں بادل ناخواستہ اس کو منظور کیا، مجلس کے ارکان نے یو۔پی میں انتخابات میں حصہ لیا اور کانگریسی امیدواروں کی مخالفت کی، بعض دوسرے مؤقر ارکان نے اپنی ریاست میں کانگریسی امیدواروں کی تائید وحمایت کی، اور وہ سب پیش آیا، جس سے انتخابات کے ہنگامے میں بچا نہیں جاسکتا، اس مختلف ومتضاد طرز عمل نے مجلس کی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا، اور مجلس کا شیرازہ بکھرتا نظر آیا، خاص طور پر ڈاکٹر صاحب اس صورت حال سے بڑے متاثر تھے، اسی ذہنی کشمکش اور قلبی اضطراب میں ۲ر ۳ر اپریل ۶۷ء کو مجلس مشاورت کا جلسہ دہلی میں ہوا، ڈاکٹر صاحب استعفا پر مصر تھے، لیکن ان کو بڑی کوشش سے مستعفی ہونے سے باز رکھا گیا، آئندہ اس انتشار اور بحران کو روکنے کے لئے بڑے غور وفکر کے بعد یہ تجویز کیا گیا کہ ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی صاحب اور ان کے رفقاء کو اجازت دی جائے کہ وہ یو۔پی میں ایک سیاسی اور انتخابی تنظیم قائم کرلیں، اور آئندہ اسی کے نام سے انتخابات میں حصہ لیں، یہ مجلس اس وفاق کی اسی طرح رکن رہے گی، جیسے بعض دوسری سیاسی جماعتیں (مسلم لیگ وغیرہ) ہیں، یہ کام میرے سپرد کیا گیا کہ میں ڈاکٹر فریدی کو اس پر آمادہ کروں کہ وہ الگ ایک سیاسی تنظیم قائم کریں، یو۔پی میں مجلس مشاورت کی شاخ بدستور رہے، اور اس کو الیکشن سے کوئی سروکار نہ ہو، چنانچہ اس پر عمل ہوا، اور ۲ر جون ۶۷ء کے جلسہ میں مسلم مجلس یو۔پی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، وہ مجلس ڈاکٹر فریدی کی صدارت میں ایک الگ سیاسی تنظیم کے طور پر قائم ہوگئی، ڈاکٹر صاحب مجلس مشاورت کے بدستور مرکزی ممبر رہے، اور ڈاکٹر سید محمود صاحب نے اپنی فراخ دلی اور بزرگانہ شفقت سے

www.abulhasanalinadwi.org

پچھلے واقعات کو نظر انداز کر دیا اور دونوں گلے مل گئے، لیکن اب ان میں پہلی سی امنگ اور ولولہ باقی نہیں رہا، اس میں ان کی صحت کے روز افزوں انحطاط اور اضمحلالِ طبع کو بھی دخل تھا، بالآخر انھوں نے ایک جلسہ میں ہم لوگوں کے عرض و معروض کے باوجود صدارت سے استعفا دے دیا، ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے (اپنے قدیم ذاتی تعلق کی بناء پر بھی اور قیاسات و توقعات کی بناء پر بھی) سخت اصرار کیا کہ میں صدارت قبول کروں، لیکن میں طے کر چکا تھا، میں کسی حال میں یہ ذمہ داری قبول نہیں کروں گا، مجھے یقین تھا اور ہے کہ میں اس کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہوں، بالآخر ہم سب کے اتفاق رائے سے مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹر صاحب بدستور رکن رہے، لیکن افسردہ اور دل شکستہ[۱]، یہاں تک کہ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کو وہ اپنے خالق سے جا ملے، اور اس جہان فانی کو خیرباد کہا۔

یہ صورت حال ابھی تک باقی ہے، مجلس مشاورت کا ڈھانچہ اب بھی قائم ہے، لیکن ۱۹۶۷ء کے بعد سے اس میں وہ روح، جوش و خروش اور فعالیت باقی نہیں رہی، جس کا اظہار اس کے تاریخ ساز دوروں میں اور مسلمانوں کے اس کے استقبال میں جوش و خروش سے ہوا تھا" وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا" کہ اب بھی اس کی ضرورت و افادیت باقی ہے، اور اس وفاقی و اصولی قیادت کا کوئی نعم البدل پیدا نہیں ہوا۔[۲]

---

[۱] ماخوذ از "پرانے چراغ" "تذکرہ ڈاکٹر سید محمود صاحب" صفحہ ۴۲۰ تا ۴۲۳ باختصار و اقتباس

[۲] افسوس ہے کہ ۱۰ رشعبان ۱۴۰۴ھ ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء کو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی صدر مسلم مجلس مشاورت نے ایک طویل علالت کے بعد جس کا سلسلہ دو سال جاری رہا انتقال کیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً

www.abulhasanalinadwi.org

جہاں تک ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم کا تعلق ہے، ان کا میرے ساتھ تعلق روحانی اور تاریخی بنیادوں پر قائم تھا، وہ آخر تک قائم رہا، اور میں اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب کے تذکرہ میں "پرانے چراغ" حصہ اول ص ۲۲۵-۲۲۸ میں تفصیل سے کر چکا ہوں۔

www.abulhasanalinadwi.org

بابِ پنجم

تحریکِ پیامِ انسانیت، اس کے محرکات ومقاصد

تحریک کا ذہنی وواقعاتی پس منظر

اس وقت تک ہندوستان کی جن جماعتوں اور تحریکوں میں اپنی شرکت ورفاقت کا ذکر کیا گیا اور جن ملکی وملی مسائل سے اپنی گہری دلچسپی اور (اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کے مطابق) ان کے ساتھ اپنے تعاون اور اشتراکِ عمل کا تذکرہ کیا گیا، ان کی اولیت وقیادت اور ان کا خیال پیدا ہونے کا شرف کسی طرح مجھے حاصل نہیں تھا، واقعات وحقائق کے مطالعہ اور ضرورت کے احساس نے اس کاروانِ عمل میں شریک ہوجانے کا مشورہ ہی نہیں دیا، بلکہ ضروری قرار دیا، اور اس میں اپنی صلاحیتوں، مناسبت، ذوق اور وقت وفرصت کے مطابق حصہ لیا گیا۔

لیکن تحریک "پیامِ انسانیت" کا معاملہ اس سے ذرا مختلف ہے، اس کا خیال خود دل کی گہرائیوں سے ابھرا اور اس نے قوتِ فکریہ اور اعصاب پر اپنا تسلّط قائم کرلیا، اور اس کا (اپنی ذہنی ساخت اور مزاجی افتاد کے ساتھ جو ہر شخصیت کا خاصّہ ہے) داعی اور شارح بنادیا، اس کے لئے اس ذہنی پس منظر، ماحول اور اس کے محرکات ودواعی کے جاننے کی ضرورت ہے، جنھوں نے ایک تحریک اور دعوت کی شکل اختیار کرلی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس موقعہ پر اس حصہ کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو ایک عزیز کے سوالات کے جوابات میں ایک موقعہ پر کہا گیا، جس میں پوچھا گیا تھا کہ اس کام کا آپ کو کیسے خیال پیدا ہوا، اور یہ کام سب سے پہلے آپ نے کب شروع کیا؟

میں نے کہا یہ بالکل فطری اور قدرتی امر ہے کہ آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا جس میں اس کو رہنا ہے، اور جہاں اس کی عزیز متاع اور زندگی کی پونجی ہے، اور جس کے بنانے اور سنوارنے پر اس کی اور اس کے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں، یہ ہر سلیم الفطرت بلکہ صحیح الفطرت انسان کا خاصہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے، اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاخ پر اس کا نشیمن ہے عقل و ہوش کی موجودگی میں نہ اس پر خود تیشہ چلا سکتا ہے اور نہ کسی کو تیشہ چلانے کی اجازت دے سکتا ہے۔

روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ یہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی، بلکہ قومی و اجتماعی خودکشی کی طرف جا رہا ہے، اخلاقی قدریں بے دردی کے ساتھ پامال کی جارہی ہیں، خود غرضی بلکہ خود پرستی کا جنون (ان افراد کو مستثنیٰ کر کے جن پر مذہب و اخلاق کی کسی وجہ سے گرفت مضبوط ہے، یا جو زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہیں) سب پر سوار ہے، انسان کی جان و مال، عزت و آبرو کا احترام تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے، حقیر شخصی فوائد کے لئے اجتماعی و ملکی مفاد کو آسانی سے قربان کر دیا جاتا ہے، کام چوری، احساس ذمہ داری کا فقدان، رشوت خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، بے عنوانی یہ سب اسی درخت کے پھل ہیں، اور انھوں نے پوری زندگی کو عذاب بنا دیا ہے، اور ان کی وجہ سے ملک کے آزاد اور با اختیار ہو جانے کے بعد بھی اس میں جینے اور آزادی سے فائدہ اٹھانے کا مزہ نہیں رہا۔

www.abulhasanalinadwi.org

یہ خرابیاں اور کمزوریاں انگریزوں کے زمانہ میں بھی تھیں، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے دور اقتدار اور نظام تعلیم کو ان کے پیدا کرنے یا ان کو ترقی دینے میں بڑا دخل ہے، لیکن ایک بدیشی جابر طاقت، پولس انتظامیہ، اور مجبوری و بے اختیاری نے ان کو بہت کچھ دبا رکھا تھا، ہانڈی کے اوپر سے اس سرپوش کے اٹھ جانے سے یہ خرابیاں اُبال اور بھاپ کی طرح نکل پڑیں، آزادی کی جنگ، و ربدیشی جوئے کے اتار پھینکنے کی مصروفیت نے قومی تعمیر اور کردار سازی کی مہلت نہیں دی، ملک تو آزاد ہوگیا لیکن ضمیر اندر سے غلام تھا، برطانیہ یا کسی غیر ملکی طاقت کا نہیں، بلکہ ہوا و ہوس، دولت و قوت، عزت و اقتدار، اور تنگ نظری و تنگ دلی کا، اتنے بڑے ملک کے نظم و نسق، اور سیاسی پارٹیوں کی باہم کشمکش، اور کرسیِ اقتدار کی حفاظت نے اس کی مہلت ہی نہ دی کہ اس کی طرف توجہ کی جائے (اور چند کو مستثنیٰ کرکے) ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ذہن میں اس کی کچھ اہمیت بھی نہ تھی، کہ وہ عوام سے رابطہ پیدا کرکے ان کے دل و ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کریں، ان کے اخلاقی حس کو تیز اور متحرک کریں اور جو باتیں ملک کے لئے حقیقی خطرہ بنی ہوئی ہیں، ان کی طرف متوجہ کریں۔

بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی و بے اثری کا پورا علم واحساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلا تفریق مذہب و ملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا کہ جب کسی محلہ یا گاؤں میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا، گونگے بھی چلّا اٹھتے ہیں، اور اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں۔

پھر کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی و تعمیری کاموں کے لئے (خواہ وہ کتنے مقدس، ضروری اور مفید ہوں) شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل (NORMAL) حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

قہرسامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو، وہاں تعلیمی و تعمیری کام کے لئے دماغی سکون اور ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں، اوران پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات انسان کشی، اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں پر اعصابی (ہسٹریا) کے دورے جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت و قوت کے سوا کوئی حقیقت زندہ اور مسلّم نہ مانی جاتی ہو، اور جیسا کہ میں نے ابھی سیوان کی تقریر میں کہا تھا کہ :-

"یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا عمارت پر بجلی گر جائے، ۶۷ء کی ۱۴ر جولائی کو جب میں امریکہ ہی میں تھا، نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے، کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہو کر انسانوں کی جان لے لے، اس لئے کہ یہ سب بے شعور و بے ضمیر چیزیں ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پڑھا لکھا کسی پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے، جیسا کہ جمشید پور، راؤرکیلا، اور رانچی میں ہوا، ایک ہی کالج میں پڑھانے والے استاد دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے، طالب علم طالب علم کی مخبری کرے، اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے"۔

اور یہ دورے کسی وقت بھی معاشرہ پر پڑ سکتے ہیں، اور لوگ معمولی بات پر اپنا دماغی توازن کھو سکتے ہیں، وہاں کسی تعلیمی و تعمیری کام یا ادارہ کی بقا کی ضمانت کب تک دی جا سکتی ہے، اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے؟ بقول میر:

www.abulhasanalinadwi.org

؎ یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے؟

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب وشاعری اور فنون لطیفہ اور اقبالؒ کے الفاظ میں "لذت کردار اور جرأت اندیشہ" کی بھی کیا گنجائش ہے؟

اور یہ تو ملک گیر اور وسیع پیمانہ کے حوادث ہیں، جہاں سوسائٹی اتنی مسخ (CORRUPT) ہوجائے کہ کسی کو بغیر رشوت دیئے نہ اس کا حق ملے، نہ ریل پر وہ آرام سے سفر کرسکے، نہ طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوں، نہ استاد پڑھانے کی طرف، انتظامیہ کے سب کام بےعمل اور سست ہوں، پورے ملک میں وقت کی کوئی قدر وقیمت نہ ہو، سفر غیر محفوظ اور قیام مخدوش ہوجائے، وہاں اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں افراد کے لئے اپنے اصولوں پر قائم رہنا کب تک ممکن ہے؟

اس بناء پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور "پیام انسانیت" کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لئے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے، اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پُرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی، اس لئے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون، بلکہ پاسبان ومحافظ سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت وتحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے، کم سے کم اس کی حیثیت وہ ہے جو کسی فرّاش یا سقّہ، یا زمین برابر کرنے والے، یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی بھی جلسہ، یا اجتماع ہوسکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو، یا تعلیمی بحث ومذاکرہ کا۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے جو اس ملک میں اقلیت میں ہے، اور اس کے بیسیوں مسائل حل طلب ہیں، آپ نے اپنی ہی ذمہ داری کیوں سمجھی،

www.abulhasanalinadwi.org

اور اس کا اسلام کے مسئلہ سے کیا تعلق ہے؟

میں نے کہا:۔

"آپ کا سوال بالکل حق بجانب ہے لیکن آپ خود صاحبِ علم ہیں، اور قرآن و حدیث اور سیرت نبوی پر آپ کی نظر ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان خالص اپنے مذہب کے رُو سے بھی اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر خطروں سے آنکھیں بند نہ کرلے "اور سب خیریت ہے" کا سبق نہ دہرائے، مسلمان کو ہر جگہ بھلائی کا حکم دینے، برائی سے روکنے، اصلاح، اور فساد کے روکنے کے کام میں شرکت و تعاون کا حق ہے[1]، اس کو سمجھنا چاہئے کہ وہ زندگی کی جس کشتی پر سوار ہے، وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی، آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس صورت حال کے لئے جو مثال دی ہے، اس سے بہتر مثال کم سے کم مجھے مذہبی و اخلاقی لٹریچر میں نہیں ملی، آپ نے فرمایا کہ "ایک کشتی پر کچھ لوگ بالائی منزل پر سوار ہیں، اور کچھ نیچے کی منزل پر، میٹھے پانی کا

---

[1] اسی جذبہ کے ماتحت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت سے قبل اور نبوت سے پیشتر مکہ معظمہ کی اصلاحی تنظیم "حلف الفضول" میں شرکت فرمائی، جو عربوں کا (جاہلیت میں) ایک شریفانہ و کریمانہ (اصلاحی و شہری) معاہدہ تھا، اس میں انھوں نے اللہ کے نام پر یہ عہد و پیمان کیا تھا کہ وہ ظالم کے مقابلہ اور مظلوم کی حمایت میں ایک ہاتھ کی طرح کام کریں گے، اور اس وقت تک کوشش جاری رکھیں گے جب تک ظالم مظلوم کا حق نہ دے دے، سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ آپ اس معاہدہ سے بہت خوش تھے، بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف و تحسین فرمائی اور فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدہ میں شریک تھا جس کے نام پر اگر اسلام کے ظہور کے بعد بھی مجھے بلایا جائے تو میں اس کی تکمیل کے لئے تیار ہوں، انھوں نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ حق حقدار تک پہونچائیں گے، اور کوئی ظالم مظلوم کو دبا نہ سکے گا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت ابن کثیر ج ۱ ص ۲۵۸)

www.abulhasanalinadwi.org

انتظام اوپر ہے، نیچے والے مجبور ہیں کہ اوپر جاکر پانی لائیں اور اپنی پیاس بجھائیں، پانی گرتا اور چھلکتا ضرور ہے، کشتی کے "بالانشینوں" کو اس سے کچھ تکلیف ہوئی، انھوں نے روک ٹوک کی، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر انسان کا گزارا نہیں، اگر اوپر والے پانی نہیں لینے دیتے تو ہم نیچے کے حصہ میں سوراخ کرلیں گے، اور وہیں بیٹھے بیٹھے دریا سے پانی حاصل کریں گے، آپؐ نے فرمایا اگر اوپر والوں میں ذرا بھی سمجھ ہے تو وہ ان کو ایسا کرنے سے روک دیں گے، اور پانی لے جانے کی اجازت دے دیں گے، اگر انھوں نے ایسا نہ کیا اور کشتی میں سوراخ ہوگیا تو نہ اوپر والے بچیں گے نہ نیچے والے۔"

بس ہم سب اسی کشتی کے سوار ہیں، یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے، اگر خدانخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے نہ کتب خانے، نہ مقدس اور خدا رسیدہ افراد، نہ عالم و فاضل، نہ بزرگ۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ بھی اس دعوت و تحریک سے کچھ فائدہ پہونچے گا؟ کہا گیا۔

میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہونچے اور ملک کو فائدہ پہونچ جائے، جب بھی ان کو یہ کام کرنا چاہئے، وہ اپنے دینی منصب کے لحاظ سے اس کے لئے مامور ہیں، اور ملک کے ہر فائدے میں شریک، لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت طریقہ پر رہنے کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پُر کریں جو عرصہ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے، کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت و ضرورت اور بے لاگ اور بے غرض قیادت و دعوت کے بغیر عزت و اطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا ہے۔ ع "زندگی جہد است استحقاق نیست"

www.abulhasanalinadwi.org

تحریک کا آغاز و ارتقاء

میں نے تقسیم اور ملک آزاد ہو جانے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین اور رسائل کے ذریعہ کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے!" کے عنوان سے نکلا تھا جس کا ہندی، انگریزی ترجمہ میں نے اس وقت ملک کے تقریباً تمام سربرآوردہ سیاسی رہنماؤں اور وزرائے اعلیٰ کو بھیجا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ کوشش ۱۹۵۴ء کے آغاز میں شروع ہوئی، اس سلسلہ کی پہلی تقریر (جیسا کہ حصہ اول میں گزر چکا ہے) جس سے اس مہم کا آغاز کیا گیا، ۹ جنوری ۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک ایسے اجتماع میں کی گئی جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیر مسلم تعلیم یافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی، اس زمانہ میں تبلیغی دورے کے ساتھ اس جزء کو شامل کیا گیا تھا، چنانچہ اس کے بعد ہی مشرقی اضلاع کا ایک دورہ کیا گیا، جس میں جون پور، غازی پور، مئو اور گورکھپور میں بڑے بڑے ملے جلے اجتماعات ہوئے، اس دورہ کی تقریریں ایک مجموعہ میں جمع کر دی گئی ہیں، جس کا نام ہی "پیام انسانیت" ہے، اس سلسلہ کا دوسرا نمبر "مقام انسانیت" کے نام سے شائع ہوا۔

لیکن کچھ ہی دن کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اس کو تبلیغی دوروں کے ساتھ ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہوگا، ادھر یہ احساس غالب آنے لگا کہ ایسی تقریروں کے لئے جن احتیاطوں اور رعایتوں کی ضرورت ہے ان پر سب کو قدرت نہیں، اس لئے ان تقریروں کا بوجھ زیادہ تر اس ناچیز پر اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی پر تھا، اور جہاں ہم نہ ہوتے

www.abulhasanalinadwi.org

وہاں اس طرح کا کوئی اجتماع بھی نہ کیا جاتا۔

اُدھر میرے بیرونی ملک کے سفر پیش آنے لگے، کچھ عرصہ کے بعد ہی مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت آئی اور کئی مہینے ملک سے باہر رہا، وہاں سے آنے کے بعد اپنے دوسرے تصنیفی و علمی مشاغل میں مصروف ہوگیا، واقعہ یہ ہے کہ مجھے ساری عمر اس کا قلق رہے گا کہ یہ سلسلہ کیوں نہ جاری رکھا گیا، میں اس کو اپنی ایک اخلاقی کوتاہی سمجھتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس پر ہمارا محاسبہ نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا اور رفقاء بھی تیار ہو جاتے اور ملک کی فضا پر بھی اس کا ضرور اثر پڑتا، اس طویل وقفہ کے بعد دسمبر ۱۹۷۴ء کو الہ آباد سے پھر اس مہم کا آغاز کیا گیا، اور اس کے بعد کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس سلسلہ میں بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ اور پنجاب اور یو۔پی کے دورے ہوئے، جن میں مختلف مقامات پر بڑے کامیاب جلسے ہوئے، ان جلسوں میں غیر مسلم اور تعلیم یافتہ اصحاب کی بڑی تعداد ہوتی تھی، اور وہ سب بڑے غور و توجہ سے تقریر سنتے اور اپنے گہرے تاثر کا اظہار کرتے تھے، ۲۲ مئی ۱۹۷۵ء کو لکھنؤ کے تاریخی مقام گنگا پرشاد میموریل ہال امین الدولہ پارک میں جلسہ ہوا، جس میں مسلم و غیر مسلم تعلیم یافتہ عوام اور خواص نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی، یہ تقریر "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" کے عنوان سے شائع ہوگئی ہے، اس تقریر میں غلامی اور محکومی کے اسباب، بیرونی و ملکی حکومت کا فرق بتانے کے بعد اس پستی اور گراوٹ کی تصویر کھینچی گئی، جس کا ملک شکار ہے، اور بتایا گیا کہ اصل مرض یہ ہے کہ اجتماعی بگاڑ سے انفرادی بناؤ کا رجحان پیدا ہوگیا ہے، بتایا گیا کہ آج جو صورت حال ہے، وہ بالکل مصنوعی اور غیر فطری ہے، اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں،

www.abulhasanalinadwi.org

یہ اہلِ ملک کی کمزوری ہے کہ ہم اس صورت حال کو برداشت کررہے ہیں، میں بغاوت کا نعرہ نہیں دیتا، میں انقلاب کا بھی نعرہ نہیں دیتا، میں اصلاح کا نعرہ دیتا ہوں، میں انسانی حقوق کی اپیل کررہا ہوں، ہندوستانی ہونے کے ناطے یہ اپیل کررہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے، میرا اگران بلند پایہ شخصیتوں اور تحریکوں سے تعلق نہ ہوتا جنھوں نے سب سے پہلے اس ملک کی آزادی کا خواب دیکھا تھا، اور آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، تو میں اتنی صاف گوئی سے کام نہیں لے سکتا تھا، لیکن میرا دل وضمیر اس تلخ نوائی اور تنقید کے باوجود مطمئن ہے، کیونکہ میرے اور میرے اسلاف اور بزرگوں کا ریکارڈ نہ صرف پاک وصاف بلکہ درخشاں اور تاباں ہے۔

میں نے عرض کیا کہ کسی ملک یا قوم کے تحفظ وبقا کے لئے اور افراد کو خود غرضی، ظلم، بے ایمانی اور خیانت سے بچانے کے لئے اصل طاقت تو خدا کا عقیدہ اور خوف ہے، جب کسی انسان کے دل ودماغ میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جائے کہ ایک بالاتر ہستی ہے جو اندھیرے اجالے میں ہماری نگراں ہے، اور مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے، تو وہ کوئی غلط کام نہیں کرسکتا، اصلاح کے لئے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں، یہ اصل طاقت ہے، جو چوروں کو پاسباں بناتی ہے، اس کے بعد کسی درجہ میں کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا سکتی ہے تو وہ سچی حب الوطنی ہے، یہ احساس کہ یہ ہمارا ملک ہے، ہمارا شہر ہے، خدانخواستہ کسی ملک میں دونوں جذبے ختم ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا نہیں سکتی، کوئی فلسفہ، اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم، ایک لاکھ یونیورسٹیاں کام نہیں آسکتیں یورپ آج جذبۂ حب الوطنی کی بدولت باقی ہے، اس نے دو عظیم جنگیں جھیلی ہیں، یورپ دو مرتبہ خون کے دریا میں نہایا ہے، ہم پر تو صرف خون کے چھینٹے پڑے ہیں، یورپ تو خون کے

سمندر میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ڈوب کر نکلا ہے، جنگ عظیم میں بعض بڑے بڑے شہر تباہ ہوگئے تھے، مگر وہاں کے لوگوں کی سچی حب الوطنی تھی، جس نے پھر انھیں دنیا کے نقشہ پر اہمیت دلا دی، کھنڈر اور ملبہ پر ایک نیا ملک، ایک نیا شہر وجود میں آیا، یورپ میں ہزار خرابیاں الحاد اور دہریت فسق و فجور اور عیش و عشرت کی ترقی ہے لیکن سچی حب الوطنی انصاف پسندی، ذمہ داری کے احساس اور ہر شہری کے حقوق کی حفاظت اور جان و مال کی قیمت کے احساس نے اس کو تھام رکھا ہے، اگر کسی ملک یا قوم میں نہ تو خوف خدا ہو، نہ سچی حب الوطنی تو اس کو تعمیری منصوبے اور مادی ترقیاں تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔

آخر میں میں نے مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا کہ ان کی اس موقع پر ڈہری ذمہ داری ہے ایک تو یہ کہ ان کا مذہبی صحیفہ قرآن اور ان کے پیغمبر کی تعلیم (جو خدا کا شکر ہے کہ محفوظ ہے، اور اپنے اندر اب بھی طاقت رکھتی ہے) اس کو نہ صرف اس عام بگاڑ، اس پھیلی ہوئی آگ اور دولت کی اندھی پرستش کے اس بہتے ہوئے گندے پانی سے بچنے کی تلقین کرتی ہے، بلکہ ان پر اس کو روکنے اور اس سے لوگوں کو بچانے کی ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے، ان کو ان کے پیغمبر نے صاف طریقہ پر سمجھا دیا ہے، کہ اگر کسی کشتی کے کسی سوار کو بھی ایسی حرکت سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی گئی جس سے یہ کشتی خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اور یہ کشتی ڈوبی تو پھر اس کشتی کا کوئی سوار بھی نہ بچ سکے گا، اور یہ کشتی نیک و بد قصوروار اور بے قصور سونے جاگنے سب کے ساتھ ڈوب جائیگی، اور اس وقت کوئی نیکی اور کوئی دانائی کام نہ آئے گی۔

ان کی دوسری ذمہ داری کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک میں انسانیت کے احترام، عدل و مساوات اور سماجی انصاف کا پیغام لے کر آئے تھے، اور انھوں نے اس ملک کی بڑے نازک موقعوں پر مدد کی، یہ پیغام ان کی مذہبی تعلیمات میں اب بھی پورے طور پر محفوظ ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

اگر انھوں نے اس ملک کی سوسائٹی کی اس ڈوبتی، یا ڈگمگاتی کشتی کو بچانے کی امکانی کوشش نہ کی تو وہ خدا کے سامنے قصوروار، اور گنہگار ٹھہریں گے، اور تاریخ میں بھی فرض ناشناس، بلکہ احسان فراموش اور مجرم قرار پائیں گے۔

۱۶؍اپریل ۱۹۷۸ء کو سیوان میں کوٹھی نشاط افزا کے وسیع سبزہ زار پر شب میں ایک عام جلسہ ہوا جس کی صدارت عالمی شہرت کے حامل، ممتاز تاریخ داں ڈاکٹر بی پی مصرا (سابق وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی) نے کی، اس کا عنوان اور تقریر کی جان یہ فقرہ تھا، جس کو اس تقریر کا عنوان بنا دیا گیا کہ "جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے"[1] اس تقریر میں اس پر زور دیا گیا کہ ہماری فطرت خراب نہیں اوپر کی چیزیں خراب ہیں، تعلیم، سیاست، صحافت، اقتدار کی ہوس، پارٹی کی اندھی محبت تعلیم یافتہ آدمی کو خراب کرتی ہے، ایک غلط نعرہ اس کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی ہو جاتا ہے، تعلیم سب کچھ کرتی ہے، مگر آدمی کو آدمی نہیں بناتی، انسان اندر سے بنتا ہے باہر سے نہیں بنتا، ہم نے اندر کو بھلا دیا، ہم نے اندر کے انسان کو نہیں جگایا، ہمارے اس انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوا ہے، وہ اندر کا انسان ہے، وہ دل والا انسان ہے، وہ ضمیر والا انسان ہے، وہ خدا سے ڈرنے والا انسان ہے، جب وہ انسان جاگ جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے، بڑی بڑی سلطنتیں اور شہنشاہیاں (EMPIRES) اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں لیکن اس کا حال کیا ہوتا ہے، وہ قوم کے پیسہ کو، ملک کے پیسہ کو خدا کی امانت سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے پوری قوم مالک ہے، اور میں اکیلا خادم۔

اس موقعہ پر میں نے تاریخ اسلام اور خلافت راشدہ کے چند مؤثر واقعات سنائے

---

[1] اس جملہ کی تشریح میں جو کچھ کہا گیا اس کا اقتباس پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جن میں حضرت ابوبکرؓ کا اس رقم کو جوان کی اہلیہ صاحبہ نے روزمرہ کے خرچ سے پس انداز کرکے جمع کی تھی تاکہ اس سے بچوں کا منہ میٹھا کیا جاسکے، یہ کہہ کر حوالہ کردی کہ تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اتنے پیسے کم دیئے جائیں، جب بھی ابوبکرؓ کے گھرانے کا گذارا ہو سکتا ہے، اس لئے آئندہ سے روزمرہ کے خرچ میں اتنی کمی کردی جائے، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اس وقت سرکاری شمع کو بجھا دینا جب ان کے دوست نے ان سے ان کے گھر کا حال اور بچوں کی خیروعافیت دریافت کرنی شروع کی، اور کہا کہ ابھی تک میں خلافت کا کام کر رہا تھا، اب ذاتی باتیں شروع ہوگئیں، ان قصوں کے لئے میں مسلمانوں کا پیسہ خرچ کرنا صحیح نہیں سمجھتا ہوں۔

آخر میں میں نے کہا کہ میں انسانیت کو سویا ہوا سمجھتا ہوں مرا ہوا نہیں سمجھتا، انسانیت سو بار سوئی سو بار جگائی گئی، آیئے ہم آپ سب مل کر سوئی ہوئی انسانیت کو جگائیں، پہلے خود جاگیں پھر دوسروں کو جگائیں، سویا ہوا سوئے ہوئے کو نہیں جگا سکتا، ایک جاگتا ہوا سیکڑوں سوئے ہوؤں کو جگا دیتا ہے لیکن سو سوئے ہوئے ایک سوئے ہوئے کو بھی جگا نہیں سکتے پھر میں نے بتایا کہ یہ جو کچھ رونق ہے سب امن وامان کی ہے، نارمل (NORMAL) حالات کی ہے، نارمل حالات نہ ہوتے، بارش کا زمانہ ہوتا، بجلی چمک رہی ہوتی، اور ذرا سا پانی برسنے لگتا، یا ایک کڑاکا ہوتا تو سارا مجمع منتشر ہو جاتا، نارمل حالات اگر ملک میں ہوں گے تو آپ اس ملک کو جتنا چاہیں اونچا کیجئے، جتنا چاہیئے بڑھایئے اور پڑھایئے، علم وفن کی تحقیقات کیجئے۔[۱]

۱؎ یاد رہے کہ یہ تقریر جس ریاست (بہار) میں کی جارہی تھی، وہاں فرقہ وارانہ فسادات (RIOTS) روزمرہ کے زندگی کا معمول بن گئے تھے، اور ذرا سی بات پر بھیانک فساد ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسی سال دسمبر کے آخر میں مراد آباد کے ٹاؤن ہال میں انصاف کونسل کے زیر اہتمام جلسہ ہوا، ہال کھچا کھچ سامعین سے بھرا ہوا تھا، اور اس میں ہر طبقہ کے لوگ تھے، انھیں دنوں علی گڑھ میں فسادات ہو رہے تھے، اور اطراف میں کشیدگی تھی، اس تقریر میں پوچھا گیا تھا کہ دنیا میں آنے والے انسان چمن کے کانٹے ہیں یا پھول؟ اس میں بتایا گیا تھا کہ خدا تو ابھی نسل انسانی سے مایوس نہیں ہے، وہ برابر اس میں اضافہ کر رہا ہے، اور نئے نئے مہمان بھیج رہا ہے، مگر ہم اس سے مایوس ہیں، ہم ثابت کر رہے ہیں کہ انسان سے بڑھ کر کوئی چیز قابلِ نفرت نہیں ہے، پھر بتایا گیا کہ ہمارا سماج ڈانواڈول ہے، اس کی جلد خبر لینے کی ضرورت ہے، ہر شخص کی زبان پر ہے کہ۔ ؏

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہم کو سمجھ لینا چاہئے کہ ؎

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

پھر اس مسافر کی دردناک تصویر کھینچی گئی تھی، جو پردیس سے کما کر کچھ پیسے بچا کر بڑے ارمانوں کے ساتھ اپنے شہر میں آیا تھا کہ برسوں کے بعد گھر جاؤں گا، بوڑھی ماں کی باچھیں کھِل جائیں گی، بیوی خوش ہوگی، بچے پاؤں سے لپٹ جائیں گے، میں بمبئی سے تحفے لے کر آیا ہوں وہ سامنے رکھوں گا، یہ سارے ارمان اس کے دل کے دل ہی میں رہے، اور ایک ظالم نے اس کو دوسرے فرقہ کا آدمی دیکھ کر اس کا کام تمام کر دیا، کیا خدا ان باتوں سے خوش ہو سکتا ہے، اور ان باتوں سے ملک پنپ سکتا ہے، اور ایسے ملک پر خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہو سکتی ہیں؟

www.abulhasanalinadwi.org

یہ چند اقتباسات اس لئے دیئے گئے کہ اس سے اس تحریک کا مزاج، اس کی روح اور اس کا پیام سمجھنے میں مدد ملے، اور کم سے کم یہ ٹکڑے تاریخ میں محفوظ رہ جائیں۔

اس سلسلہ کا سب سے کامیاب اور حیرت انگیز دورہ (۲۱ر-۳۱ر مارچ ۱۹۷۸ء) ہریانہ اور پنجاب کا تھا، جہاں کی سرزمین تقسیم ملک کے زمانہ میں مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن چکی تھی، مسلمانوں کی آبادی اس پورے خطہ میں برائے نام رہ گئی تھی، پھر اس پر مستزاد ہولی کا زمانہ تھا جو خود ہمارے صوبہ میں ایسی افراتفری کا زمانہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، اس سفر میں جمنا نگر، خضر آباد، بوڑیہ، جگادھری، پیپلی مزرعہ، سرہند، مالیر کوٹلہ اور چنڈی گڑھ جانا ہوا، سفر ٹرینوں پر بھی تھا لیکن کہیں پیام انسانیت کے اس قافلہ کو کوئی ناخوشگوار تجربہ نہیں ہوا۔

سب سے بڑا جلسہ چنڈی گڑھ میں ہوا، جس کی صدارت ڈویژن کے کمشنر صاحب نے کی جو مذہباً ہندو تھے، سارا میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا جن میں قدرتاً مسلمان آٹے میں نمک کے برابر تھے، دو مرتبہ بجلی اور ایک مرتبہ مائک فیل ہوا، لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہیں اٹھا، صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کون سی طاقت تھی جس نے بجلی اور مائک فیل ہو جانے کے باوجود لوگوں کو اٹھنے نہیں دیا اور جلسہ میں کوئی انتشار پیدا نہیں ہوا، بعض دیکھنے والوں نے بتایا کہ اگر مجمع میں سے کوئی مسلمان اٹھنے لگتا تو پاس بیٹھا ہوا سکھ یا ہندو اس کو بٹھاتا اور کہتا کہ سنو کیسی اچھی باتیں ہو رہی ہیں، اس سب سے اندازہ ہوا کہ اس کام کی کتنی گنجائش ہے اور کتنی ضرورت، اور لوگوں میں اس کے قبول کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔

نومبر کی آخری تاریخوں اور دسمبر ۱۹۷۸ء کی ابتدائی تاریخوں میں مدھیہ پردیش کا دورہ ہوا، جو پنجاب ہی کی طرح کامیاب تھا، اس دورہ میں بھوپال، اندور، اجین، دھار، دیپال پور اور مہو میں بڑے بڑے جلسے ہوئے اور ہر جگہ اس پیام کا استقبال،

www.abulhasanalinadwi.org

اندور میں ٹیگور ہال اور بار ایسوسی ایشن میں بھی تقریر ہوئی، جہاں سامعین کی کثرت سے بیٹھنے کی جگہ نہ تھی، ایک تقریر سن کر آر۔ایس۔ایس کے لیڈروں کا ایک وفد ہماری قیام گاہ پر آیا، اور اس نے گہرے تاثر کا اظہار کیا، اور کہا کہ کل کی تقریر سے ہم کو معلوم ہوا کہ آپ کو اس ملک کی ہم سے زیادہ فکر ہے۔[1]

یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح اس وقت تک جاری ہے، ۲۷، ۲۸؍ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی سفید بارہ دری میں "پیام انسانیت" کانفرنس بھی ہوئی جس میں ملک کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مسلم و غیر مسلم دانشوروں نے شرکت کی اور بڑی اچھی فضا میں جلسہ ہوا۔

اس تحریک اور دوروں نے جو چند ترجمان اور اس موضوع کے اچھے مقرر پیدا کئے، ان میں مولوی اسحاق جلیس ندوی مدیر "تعمیر حیات" سب سے پیش پیش تھے، ان کا قلم اور زبان اس کے بہت مؤثر ترجمان بن گئے تھے، اور بعض مواقع پر ان کی تقریر کے بعد مجھے خود تقریر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، لیکن چونکہ اس کا اعلان ہو چکا ہوتا تھا، اس لئے میں بھی تقریر کر دیا کرتا تھا، یہ تحریک ان کی فطری صلاحیتوں اور ذہنی ساخت کے بالکل مطابق تھی، اور وہ گویا اصلاً اسی کے لئے پیدا کئے گئے تھے، وہ ملک کے حالات سے بہت باخبر، ہر طبقہ کی نفسیات سے واقف، اور غیر مسلم تعلیم یافتہ نوجوانوں اور سیاسی کارکنوں کے بہت قریب رہے تھے، پھر ان کو ہندی کے الفاظ اور جملے (جو غیر مسلم سامعین کی نفسیات پر

---

[1] اس دورہ کی مفصل رپورٹ اور تقریریں اس روداد میں پڑھی جا سکتی ہیں، جو مولوی اسحاق جلیس کے قلم سے "تعمیر حیات" میں نکلی، اور حال میں "مکتبۂ عثمانیہ، رائے بریلی" کی طرف سے "تحفۂ انسانیت" کے نام سے کتاب کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

گہرا اثر ڈالتے ہیں) برمحل استعمال کرنے کا بڑا ملکہ تھا، اسی طرح وہ انگریزی سے بھی اچھی طرح واقف تھے، اس لئے ان کی تقریر مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے دلکش اور قابل فہم ہوتی۔

مولوی اسحاق صاحب کے بعد اس تحریک سے پوری مناسبت برادرزادۂ عزیز محمد میاں مرحوم کو تھی، وہ اور مولوی اسحاق جلیس دونوں ایک دوسرے کے کلی طور پر ہم خیال اور شریک حال تھے، دونوں نے مل کر وہ حلف نامہ تیار کیا جو ہر طبقہ پر حاوی اور ہمہ گیر ہے، تحریک کا تعارف کرانے میں بھی دونوں کا قلم یکساں رواں دواں تھا۔

تحریک کسی نہ کسی طرح جاری ہے لیکن اس کو جس توجہ اور انہماک، جتنے وقت اور جتنے ترجمانوں اور داعیوں کی ضرورت ہے، وہ ابھی تک فراہم نہیں ہوئے، بڑا انحصار ان رسائل اور تقریروں پر رہ گیا ہے، جو اردو، ہندی اور انگریزی میں چھپ چکی ہیں، یا کبھی کبھی کے میرے سفروں اور دوروں پر، لیکن اس قحط الرجال، بے سروسامانی، لوگوں کی ابھی تک اس کام کی اہمیت اور ضرورت نہ سمجھنے کے باوجود اب بھی اس کام کی اہمیت و ضرورت پر اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ پہلے دن تھا، بلکہ ملک کے تیزی سے بگڑتے ہوئے حالات نے اس کی ضرورت کا اور بھی شدت کے ساتھ احساس پیدا کر دیا ہے۔

ادھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اب بھی اس راستہ سے ملک کی قیادت اور اس کو بچا کر اہل ملک کی محبت و عزت اور اعتماد حاصل کرنے کا موقعہ دے رہا ہے کہ ابھی تک اتنے لمبے چوڑے ملک کے کسی گوشہ سے بھی سنجیدگی کے ساتھ اس صورت حال کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہو رہی ہے، اور سیکڑوں قسم کی تحریکوں کے باوجود ایک "پیام انسانیت" اور اصلاح معاشرہ کی تحریک ہی ہے جس کا کوئی علمبردار اور داعی نہیں، گویا حکمت الٰہی برابر

www.abulhasanalinadwi.org

مسلمانوں کو اشارہ کر رہی ہے کہ میدان اب بھی خالی ہے، اور تمہاری جد وجہد کا منتظر، کانوں میں صدائے غیب آرہی ہے ؎

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند

کس بمیدان در نمی آید سواراں راچہ شد؟

جہاں تک ہندو معاشرہ کا تعلق ہے وہ قابل رحم نظر آتا ہے، اس میں اگر کوئی اٹھتا بھی ہے تو وہ صرف مسلمانوں کو اپنی اصلاح کا مشورہ دیتا ہے، یا قومی دھارے MAIN STREAM میں ضم ہو جانے کا، اپنے ہم مذہبوں کی تنقید اور اپنے معاشرہ کو خود بدلنے اور سدھارنے کا مشورہ دے کر اپنے فرقہ کی ادنیٰ سی ناراضگی اور ناپسندیگی کا خطرہ مول لینے کے لئے کوئی تیار نہیں، نئی بیاہی ہوئی دلہنوں کو اپنے میکہ سے معقول جہیز اور رقم نہ لانے پر آگ لگا کر جلا دینے اور زہر دے کر مار ڈالنے کی وباء عام ہو رہی ہے، ایک نیشنلسٹ اخبار کی تازہ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ صرف دہلی میں مہینہ دو مہینے کی مدت میں ۲۳۲ واقعات اس قسم کے ہوئے ہیں، لیکن اس صریح ظلم اور سفاکی کے خلاف ہندو سوسائٹی میں جو ردّ عمل ہونا چاہئے تھا، اس کے کوئی آثار ابھی تک نہیں، ملّتوں اور دعوتوں کی زندگی میں یہی موقعے ہوتے ہیں، جب کوئی ملّت یا دعوت ایسی کسی انسانیت کشی، سفّاکی اور بربریت، سنگدلی اور وحشت کے خلاف اللہ کے خوف اور انسانیت کی محبت اور حفاظت کے جذبہ سے اصلاح وخدمت کے لئے میدان میں آجاتی ہے، اور اپنے خلوص وصداقت سے اس خرابی کو بھی دور کرتی ہے، معاشرہ اور ماحول کی بھی خدمت کا فرض انجام دیتی ہے، اور اپنے دین وپیغام کے لئے بھی عزت کا مقام اور دلوں میں اپنے لئے اعتماد واحترام حاصل

www.abulhasanalinadwi.org

کرتی ہے۔

میں نے حال میں ایک تقریر میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ" (اللہ تعالیٰ ان پر عذاب بھیجنے والا نہیں اس حالت میں کہ آپ ان میں موجود ہیں) ہم اس رسولؐ کی امت ہو کر جس کو رحمۃ للعالمین کا خطاب دیا گیا ہے، اور جس کا وجود عذاب الٰہی کے لئے مانع تھا کسی ملک میں موجود ہوں اور ۸ کروڑ اور ۱۰ کروڑ کی تعداد میں ہوں، اور وہاں ایسے واقعات دن رات پیش آ رہے ہوں جو خالق کائنات کو ناراض کرنے والے اور اس کے ہولناک نتائج کا پیش خیمہ ہوں، یہ بات مسلمانوں کی اس ذمہ داری کے ساتھ میل نہیں کھاتی جو ان کے دین، ان کے اسلاف اور ان کی تاریخ نے ان کے سپرد کی ہے، ہم اس نبیؐ کی امت ہیں جس نے عربوں کی دختر کشی (وأد بنات) کی رسم اس طرح مٹائی کہ اگر سیرت و تاریخ نہ ہوتی تو کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ عربوں کے یہاں کسی دور میں یہ ظالمانہ رسم تھی، کیا اس موقعہ پر مسلمانوں پر اقبالؔ کا یہ شعر صادق نہیں آتا جو انھوں نے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ؎

نہ نالم از کسے می نالم از خویش
کہ ما شایان شان تو نبودیم

(میں کسی کی شکایت اور فریاد نہیں کرتا، اپنی ہی شکایت اور اپنے سے فریاد کرتا ہوں کہ سچی بات یہ ہے کہ ہم آپ کے قابل نہ تھے۔)

www.abulhasanalinadwi.org

باب ششم

تین سال کے چند اہم واقعات

پاکستان و ہندوستان کی جنگ

دسمبر ۱۹۷۱ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ گئی، یہ جنگ تقریباً دو ہفتے جاری رہی، جو جنگوں کی تاریخ میں کوئی طویل مدت نہیں، جنگیں سالہا سال جاری رہتی ہیں، اور عظیم تباہیاں لاتی ہیں، لیکن ہندوستان کے ایک مسلمان شہری اور محبّ وطن کے تعلق سے اس جنگ کی نوعیت، اس کے نفسیاتی اور اخلاقی نتائج اتنے سنگین تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک دن ایک ایک سال کے برابر ہے، جہاں تک مصنف کا تعلق ہے، یہ اس کی زندگی کے بڑے نازک اور صبر آزما دن تھے، ہندوستان کے کسی مسلمان کو اس کی دعوت دینا کہ وہ اس سے مطلقاً متاثر نہ ہو، ایک غیر فطری اور غیر عقلی کوشش تھی، نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان کے بھی ہر حقیقت پسند تعمیری ذہنیت رکھنے والے شہری کا یہ نظریہ ہونا چاہئے تھا، کہ دونوں ملک امن و سکون کی فضا میں ترقی کریں اور انسانیت، نیک مقاصد اور اخلاقی قدروں، بلکہ دنیا میں امن و اعتماد کی فضاء بحال کرنے اور اس جنگ کے خطرہ کو دور کرنے میں جو پوری نوع انسانیت کے لئے ہلاکت کا باعث ہوسکتی ہے، اپنی کوششیں صرف کریں اور

www.abulhasanalinadwi.org

ایک دوسرے سے تعاون کریں، جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اس کی تحریک کے بارے میں میں اپنا نظریہ اور احساسات کتاب کے جلد اول میں پیش کر چکا ہوں، خود مولانا آزاد کا (جو تقسیم کے آخر تک مخالف رہے، اور جنھوں نے گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے اس کے قبول کر لینے پر اپنے استعجاب کا اظہار کیا ہے) یہ مقولہ گزر چکا ہے کہ "اب جب پاکستان بن گیا ہے تو اس کو باقی رہنا چاہیئے اور اس کو ترقی کرنا چاہیئے"۔

لیکن کبھی کبھی کسی ملک کے سربراہ اپنے ملک کے حقیقی مسائل سے شہریوں کی توجہ ہٹانے کے لئے بعض اوقات اپنے ملک کو داؤں پر چڑھا دیتے ہیں، بہرحال مقاصد و محرکات جو بھی ہوں، یہ نا شدنی جنگ چھڑ گئی، اور ہندوستان کا ہر مسلمان شک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا، ادھر پاکستان کی حکومت و قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی[1] وہ اپنے سیاسی مقاصد، ذاتی سیرت و کردار، اور پچھلی تاریخ کسی لحاظ سے بھی ایک اسلامی مملکت کے رہنما، اور مسلمانوں کے صحیح نمائندہ نہ تھے، اور ان کی نیتوں پر کسی طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء سے شروع ہونے والی یہ جنگ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ختم ہو گئی لیکن اس نے تاریخ اسلام میں بعض ایسے شرمناک تجربوں کا اضافہ کیا جو مسلمانوں کی تاریخ کے لئے نئے اور رسوا کن تھے، پھر اس کے نتیجہ میں پاکستان کا مشرقی بازو، (مشرقی پاکستان حال بنگلہ دیش) جو اپنی آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے بڑھا ہوا، اور اس کی دولت و آمدنی کا ایک بڑا سرچشمہ تھا، اس سے علیحدہ اور آزاد ہو گیا جس کے متعلق اب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مغربی پاکستان کے سربراہ اس کی علیحدگی ہی پسند کرتے تھے، تاکہ وہ مغربی پاکستان پر پوری آزادی اور

---

[1] اس وقت پاکستان کے صدر یحییٰ خاں اور وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اطمینان کے ساتھ حکومت کر سکیں اور مشرقی پاکستان کا ووٹ ان کی راہ میں حائل نہ ہو، دو ہفتے کی اس جنگ میں فضا ایسی مکدّر ہو گئی تھی، اور غیر تعلیم یافتہ اور پسماندہ طبقہ کی نگاہیں بھی ایسی بدل گئی تھیں کہ بعض حسّاس اور غیور لوگوں نے صبح کا ٹہلنا (WALK) اور بے ضرورت سفر کرنا بھی چھوڑ دیا تھا، اگر یہ جنگ طول کھینچتی تو معلوم نہیں ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزرتی، لیکن شکر ہے کہ جلد اس کا خاتمہ ہو گیا۔

مشرقی پاکستان میں لسانی اور تہذیبی تعصب کا طوفان

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موقعہ پر ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا، جس نے مسلمان اہلِ فکر، دین کے داعیوں، اور روح اسلام ہی نہیں، اسلام کی ابتدائی تعلیمات سے واقفیت رکھنے والوں کو ہلا کر رکھ دیا اور مسلمانوں کا سر شرم سے جھک گیا، اور یہ ثابت ہو گیا کہ کسی مسلمان قوم اور ملک کے ظاہری اعمال، دینی مظاہر و شعائر اور دینی جوش و خروش کے مظاہرہ پر اس وقت تک اعتبار نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس کا شعور پختہ، اس کا اسلام کا فہم گہرا، اس کا دماغ "جاہلیت" کے اثرات سے پاک، اور وہ اسلام کی نسبت و حمیت کو وطن، قوم، نسل، زبان و تہذیب کی ہر نسبت پر ترجیح دینے والا نہ ہو، اس کو زبان، تہذیب، قومیت اور حصول اقتدار کا کوئی نعرہ ایسا بے خود و سرمست نہ بنانے پائے کہ وہ نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی حدود کو بھی پھلانگ جائے، اور جنون کی ایک ایسی لہر اٹھے جو دوسری زبان بولنے والوں یا دوسرے ملک سے آنے والے ہم مذہبوں کو سانپوں اور بچھوؤں کی طرح مارنے پر آمادہ ہو جائیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغربی پاکستان کے ان حکمرانوں، فوجی افسروں اور خود فوج کے سپاہیوں اور دانشوروں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات، اسلامی مساوات، اخوت کے اصول اور قرآن مجید کی اس حکیمانہ تعلیم پر عمل نہیں کیا کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ	مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر
مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا	نہ کرے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے
مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ	بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے
أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا	(تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے
أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ	اچھی ہوں اور اپنے (مومن بھائی) کو
(سورۂ حجرات۔ ۱۱)	عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

نیز حدیث کی تعلیم "لا یحقرنّ مسلمٌ مسلماً" (کوئی مسلمان کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھے) پر عمل نہیں کیا، ان میں احساس برتری بلکہ حاکمانہ نخوت و غرور تھا، ان کے اعمال مسلمان حاکموں اور سپاہیوں اور پاسبانوں اور ذمہ داروں کے سے نہیں تھے، ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ان سے ان افعال و حرکات کا صدور ہوا، جو اسلام کے نام پر دھبّہ اور انسانی اخلاق و شرافت کے بھی منافی تھے، انھوں نے بنگلہ زبان سیکھنے اور اس کو پورا حق دینے کی کوشش نہیں کی جو نہ صرف یہ کہ پاکستان کی آبادی کے بڑے حصہ کی زبان تھی، ایک ترقی یافتہ شیریں زبان بھی تھی، جو ادب و شاعری سے مالامال ہے، انھوں نے عہدوں کی تقسیم اور پاکستان کی عمومی قیادت اور ذمہ داری میں حصہ لینے کے بارے میں مشرقی پاکستان کے صاحب صلاحیت قائدین کے ساتھ جو آئینی و جمہوری طریقہ پر ایوان میں آئے تھے، پورا انصاف نہیں برتا۔

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن اس سب کے ساتھ اس لسانی وتہذیبی جارحیت اور اسلام کی اصطلاح میں "جاہلیت" کا کوئی جواز نہیں تھا، جو اس کے ردّ عمل کے طور پر یا سیاسی سازش کے نتیجہ میں سامنے آئی، یہاں پر میں اپنی اس تقریر کا وہ حصہ نقل کروں گا، جو میں نے اس المیہ سے متاثر ہو کر ۲۳ مئی ۱۹۷۲ء کو کلکتہ کے ایک عظیم جلسہ میں امجدیہ ہال زکریا اسٹریٹ میں کی تھی، اور بعد میں "لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق" کے عنوان سے اردو، انگریزی، عربی، اور بنگلہ میں شائع ہوئی، میرا سینہ اس وقت اس المیہ کے اثرات سے داغ داغ تھا، اور دل زخموں سے چور چور زبان حال کہہ رہی تھی ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

اس المیہ کے بعد میں اس انتظار میں تھا کہ مجھے اس واقعہ کے ظہور کے میدان سے قریب تر کوئی موقعہ ملے جہاں میں اپنے قلبی تاثر کا اظہار کر سکوں، اتفاق سے مجھے کلکتہ سے ایک دعوت ملی، اور میں نے اس موقعہ کو غنیمت جان کر اس المیہ پر اپنے دردِ دل کا اظہار کیا، یہاں اس کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں:۔

"ابھی چند روز کا واقعہ ہے کہ ایک قدیم اسلامی ملک[1] اور مسلمانوں کی خاص اکثریت والے علاقہ میں جو علماء اور مشائخ اور مدارس وخانقاہوں کی سرزمین تھی، جس کے چپہ چپہ پر مسجدیں اور خانۂ خدا تھے، جس کے لئے صدیوں اولیائے کرام نے آبِ دیدہ اور خونِ جگر بہایا، اور جس کی زمین ان کے آنسوؤں سے نم اور جس کی فضا ان کے نالہائے نیم شبی سے گرم تھی، زبان وتہذیب کے جنون کی

---

[1] اس وقت کے حالات اس سے زیادہ صراحت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ایک تیز و تند لہر اٹھی، اور دیکھتے دیکھتے صدیوں کی محنتوں پر پانی پھر گیا، مسلمان نے بے تکلف مسلمان کا گلا کاٹا، بے گناہ انسان اس طرح مارے گئے جیسے سانپ اور بچھو مارے جاتے ہیں، اور ان پر کوئی رحم نہیں کھایا جاتا، جن لوگوں نے اس ملک میں پناہ لی تھی، ان کے لئے اب اس ملک میں کہیں پناہ نہ تھی، نہ کسی دل میں ان کے لئے رحم کا جذبہ تھا، نہ کسی آنکھ میں ان کے لئے کوئی آنسو، انسانوں کا شکار اس طرح کھیلا جارہا تھا، جیسے کسی جنگل میں درندوں، پرندوں کا، اور کسی تالاب و دریا میں مچھلیوں کا کھیلا جاتا ہے[1]، نہ شریف عورتوں کی عصمت محفوظ رہی، نہ بوڑھوں کے بڑھاپے پر ترس کھایا گیا، نہ معصوم بچوں کی چیخ پکار پر کان دھرے گئے، بھوک پیاس کا عذاب، سنگدلی اور شقاوت کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو اپنے بھائیوں کے لئے روا نہ رکھی گئی ہو، زبان کی "وثنیت" (بت پرستی) عقیدۂ توحید پر، قوم پرستی اور نسل پرستی اسلامی وحدت پر، اور حمیت جاہلیت اور عصبیت، اخوتِ اسلامی پر اس طرح غالب آکر رہی کہ ابتدائے اسلام سے آج تک کسی خطۂ زمین پر اس طرح غالب نہیں آئی تھی، اور اسلام و مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں کبھی اس طرح ذلیل نہیں ہوئے جس طرح اس زمانہ میں۔"

---

[1] یہ سب واقعات ہیں جو بنگلہ دیش میں پیش آئے، بچوں سے آنکھیں نکالی گئیں، چارہ جس طرح کاٹا جاتا ہے اس طرح انسانوں کے سر قلم کئے گئے، مسجد میں نمازیوں پر بم پھینکے گئے، اور بعض دوستوں نے بتایا کہ انسانوں کو زندہ بھی دفن کر دیا گیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پوری آبادی اس جنون کا شکار نہیں ہی تھی، امت کے باشعور و باحمیت مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی اور اس صورت حال پر خون کے آنسو بہائے۔

www.abulhasanalinadwi.org

آگے چل کر میں نے کہا:۔

"ان واقعات کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو یہ ہے کہ اس سے مخالفین کو اسلام کی ناکامی کے ثبوت کے لئے ایک دلیل ہاتھ آگئی، اور انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام میں رابطہ بننے اور مختلف قوموں اور نسلوں کو (جن کی زبانیں اور رنگ و نسل مختلف ہیں) متحد کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، نیز یہ کہ اسلامی عقیدہ پر کسی معاشرہ اور کسی ریاست (STATE) کے قائم ہونے، اور اگر قائم ہو جائے تو باقی رہنے کا امکان نہیں، یہ وہ معنوی خسارہ ہے جس کا کوئی خسارہ مقابلہ نہیں کر سکتا، اس سے اسلام کی ساکھ کو زبردست نقصان پہونچا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ تجارت میں اصل چیز ساکھ اور اعتبار ہے"

آگے چل کر اس المیہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے میں نے کہا:۔

"میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ اس قوم میں صحیح دینی شعور کی کمی تھی، قلب کے ساتھ دماغ کا مومن ہونا بھی ضروری ہے، تنہا اسلام کی محبت کافی نہیں، اس کے ساتھ خلاف اسلام فلسفوں اور دعوتوں کی نفرت بھی لازمی ہے، بلکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر طاغوت اور شیطان اور جاہلیت کے داعیوں سے بغاوت اور بیزاری کا ایمان باللہ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔ (سورۂ بقرہ-۲۵۶)	پس جو کوئی سرکش کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

پھر میں نے بتایا کہ قرآن مجید میں عصبیت جاہلیہ کی کتنی مذمت کی گئی ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بڑے سے بڑے دشمن کے لئے بھی کوئی درشت اور نا ملائم الفاظ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن آپؐ نے ایسے شخص کے لئے جو جاہلی نعرہ لگائے، اور جاہلیت کی کسی نسبت پر بلائے سخت ترین الفاظ استعمال کرنے کی اجازت دی، اور اس میں مطلق رو رعایت کرنے، اشارے کنایہ سے کام لینے سے بھی منع فرمایا[1] میں نے کہا زبانیں باعثِ رحمت ہیں، باعث زحمت نہیں، زبان اس لئے ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑے، اس سے نکلا ہوا ایک لفظ مُردوں میں جان ڈال دے، اور محبت کے پھول برسائے، بیگانوں کو یگانہ، دور کو نزدیک اور دشمن کو دوست بنائے، اس کا کام نفرت پیدا کرنا، انگارے برسانا، بھائی کو بھائی سے جدا کرنا، نفرت کا زہر پھیلانا نہیں، اگر زبان سے یہی کام لیا جانے لگے تو اس سے گونگا اور بے زبان ہونا ہزار درجہ بہتر ہے، پھر میں نے صحابہ کرامؓ کی جامع تربیت کے نمونے سنائے جس کی وجہ سے وہ کسی چالاک اور بدنیت آدمی کے دھوکہ میں نہیں آسکتے تھے، اور کوئی جاہلی نعرہ ان کو بدمست نہیں کر سکتا تھا، پھر بتایا کہ کسی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں جس میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو، پھر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ کسی زبان کا اسلامی روح سے محروم رہنا اور جاہلی تصورات اور عقائد کا غلام ہونا بہت بڑا خطرہ ہے، بنگال کے بھائیوں کا فرض ہے کہ اس خطرہ کا سدباب کریں، اپنی زبان وادب کو نہ صرف اسلامیات سے مالامال کردیں، بلکہ ان کی روح اور ضمیر کو مسلمان بنائیں، اور ان شخصیتوں کا رعب اور ذہنی تفوق دور کرنے کی

---

[1] میرا اشارہ حدیث "من تعزّی بعزاء الجاهلية فاعضوه بهن أبيه ولا تكنوا" کی طرف تھا، جو مشکوٰۃ میں آئی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

کوشش کریں، جوان کو اسلام سے دور اور مشرکانہ تخیلات سے قریب کرتی ہیں، اور اس طرح ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔

وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ط (سورۂ روم ۴-۵)

اور اس دن اہل ایمان اللہ کی نصرت سے خوش ہوں گے۔

میں نے ان کو یاد دلایا کہ آپ کے اسلاف نے ماضی قریب میں تیرہویں صدی ہجری کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ وہ جانبازیاں اور سرفروشیاں دکھائیں جنھوں نے ڈاکٹر ہنٹر جیسے نقادوں کو بھی انگشت بدنداں بنا دیا۔[1]

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام

ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے اپنے تشخصات کے ساتھ وجود و بقا کے لئے بلکہ مذہب کے دائرہ میں رہتے ہوئے آزادانہ زندگی گزارنے کے لئے ایک دوسرا خطرہ نمودار ہوا، اور وہ حکومت کا یہ رجحان اور خود مسلمانوں کے تجدد پسند اور آزاد خیال طبقہ کا یہ مطالبہ تھا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون (UNIFORM CIVIL CODE) ہونا چاہئے کہ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہو سکتی، یہ خطرہ اندیشہ سے بڑھ کر واقعات کی شکل میں سامنے آنے لگا، حکومت کے بعض محتاط لیکن معنی خیز بیانات

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (OUR INDIAN MUSALMANS)

یہاں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ مصنف نے اپنے حالیہ سفر بنگلہ دیش (۹ - ۱۹ / مارچ ۱۹۸۴ء) میں ... حالات بدلے ہوئے دیکھے، اور نئی اسلامی بیداری کے آثار دیکھے، جس کی تفصیل مصنف کی تقریروں کے مجموعہ "تحفۂ مشرق" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

وقتاً فوقتاً اس اندیشہ کو تقویت پہونچاتے تھے، پھر عبدالحمید دلوائی صاحب کی قیادت میں ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جو وقتاً فوقتاً اس کا مطالبہ کرتا تھا، اور ایک مہم اور تحریک کی طرح اس کو چلا رہا تھا، یہ مسلمانوں کے تہذیبی، معاشرتی ارتداد اور شریعت اسلامی سے بغاوت اور اس کے برکات سے محرومی کا پیش خیمہ اور " وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ[1] " (اور جو خدا کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے لوگ کافر ہیں) کی وعید کا مصداق بنانے والا تھا۔

اس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہوا، ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار واڑلیسہ پیش پیش تھے، ان کے اس منصب و مشاغل اور علمی تجربات نے اس سلسلہ میں بروقت رہنمائی کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف محاذ قائم کرنے کی سعادت (دوسری سعادتوں کے ساتھ) ان کے لئے مقدر فرمائی، اور انھوں نے اس کے خلاف ایک منظم مہم اور تحریک چلانے اور ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا، مسلم مجلس مشاورت، جماعتِ اسلامی، دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم، اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے علماء نے اس کی پوری تائید کی اور طے ہوا کہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن بلایا جائے، جس میں مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال، مذہبی گروہوں اور فرقوں کو دعوت دی جائے، اور ان کی نمائندگی اور تعاون سے اس فتنہ کے خلاف مضبوط متحدہ محاذ قائم اور ایک ادارہ وجود میں لایا جائے، میں اور مولانا محمد منظور صاحب اس سال رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے جو ذی قعدہ میں ہوا کرتا تھا، حجاز مقدس گئے ہوئے تھے، اور قدرتاً حج سے فراغت کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، لیکن مولانا محمد یوسف صاحب (جماعت اسلامی)

---

[1] المائدہ ۔ ۴۴

اور بعض دوسرے احباب کے تار و پیغام پہونچے کہ اس بنیادی جلسہ اور پہلے کنونشن میں آپ دونوں کی شرکت ضروری ہے، ہم لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کئی بار حج کی سعادت نصیب فرمائی ہے، اور آئندہ بھی اس سے توقع ہے، حج میں صرف ۲-۳ ہفتے کی مدت رہ گئی تھی، کہ ہم لوگوں نے براہ بیروت بمبئی کا سفر کیا، اور کنونشن میں شریک ہوئے، ملت اسلامیہ ہندیہ کی ایسی مکمل نمائندگی اس سے پہلے کم دیکھنے میں آئی تھی، شرکاء میں بریلوی مکتب خیال کے عالم و قائد مولانا برہان الحق جبل پوری، اثنا عشری فرقہ کے نمائندہ مولانا کلب عابد صاحب، بوہرہ فرقہ کے نمائندہ اور ذمہ دار ڈاکٹر نجم الدین، اہلِ حدیث حضرات کے متعدد مقتدر علماء و زعماء شریک تھے، رات کو مدن پورہ کے وائی، ایم، سی، اے کے میدان میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں ایک لاکھ کے قریب مجمع ہوگا، متعدد عالمانہ و مفکرانہ تقریریں ہوئیں، بمبئی بلکہ مہاراشٹر کے مسلمانوں نے بڑی گرم جوشی سے اس مقصد کے ساتھ تعاون کیا، اور بڑی فراخ دلی سے میزبانی کے فرائض انجام دیئے، ایک آل انڈیا بورڈ کی تشکیل ہوئی، جس کے صدر بالاتفاق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے، اور اس طرح اس مبارک مہم کا آغاز ہوا جو مسلمانوں کے لئے (دینی و شرعی نقطۂ نگاہ سے) موت و حیات کا مسئلہ ہے، اور یہ جد و جہد ابھی تک جاری ہے۔

اسی کنونشن کے زمانہ میں عبدالحمید دلوائی صاحب کی قیادت میں ایک چھوٹا سا گروہ مظاہرہ کے لئے نکلا، عوام نے چپلوں اور جوتوں سے اس کا استقبال کیا، اگر پولیس جلد اس کو اپنی حفاظت میں نہ لے لیتی تو اس سے زیادہ سنگین واقعات پیش آسکتے تھے،

www.abulhasanalinadwi.org

حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلے دن ٹائمز آف انڈیا کے بمبئی ایڈیشن میں ایک گوشہ میں پرسنل لا کنونشن کے جلسۂ عام کی خبر تھی، جس سے اس کی وسعت و عظمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا، اس کے برخلاف ڈوائی صاحب کے مظاہرہ کو ایسا چمکا کر دکھایا تھا جس سے باہر کا آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہو تا کہ اس میں مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی، یہ ہندوستان کی غیر ذمہ دارانہ انگریزی، ہندی صحافت کا ایک نمونہ ہے، جو نہ صرف حقائق کو حکومت اور اکثریت سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ رائی کا پربت بنا دیتی ہے، اور حکومت اور پبلک دونوں کو گمراہ اور حقائق سے بے خبر رکھنے کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے، جو ملک کی خدمت کے بجائے بد خدمتی اور روشنی پہونچانے کے بجائے اس کو تاریکی میں رکھنے کے مرادف ہے۔

آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن دہلی کا افتتاح

کتاب کے حصۂ اول میں گزر چکا ہے کہ میں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جس کو (اپنے ہی الفاظ میں) ایک ایسا قیمتی ملی اثاثہ سمجھتا ہوں جس پر مرفہ الحال اور با اثر ہندوستانی مسلمانوں کی بہترین ذہنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں، اقلیتی کردار کی حفاظت اور مولانا شبلیؒ کے الفاظ میں۔ ع

کہ اس سر رشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد

کے عمل میں آنے کو شروع سے ایک ملی خدمت سمجھا اور اس سلسلہ میں اس کے عظیم بانی کے بعض افکار و تصورات سے اختلاف رکھنے کے باوجود (جس کا ذکر وضاحت و تفصیل کے ساتھ میں نے اپنی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" میں کیا ہے)[1]

[1] ملاحظہ ہو ص ۹۵-۱۰۲

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے ان باحمیت طلبائے قدیم (OLD BOYS) اور ہمدردوں کے ساتھ جن کی سرگرمیوں کا مرکز لکھنؤ تھا کبھی تعاون میں دریغ نہیں کیا، یونیورسٹی کے بارے میں وہ خطرے اب زیادہ واضح طریقہ پر سامنے آنے لگے تھے، جن کا شروع میں اظہار کیا گیا تھا، ۱۹۶۵ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی ترمیم کے ذریعہ ایڈمنسٹریشن ایک نئی ایگزیکٹیو کونسل کے ہاتھ میں دے دیا گیا، جو ۱۹ اشخاص پر مشتمل تھی، جو سب حکومت کی طرف سے نامزد کئے گئے تھے، کورٹ اکیڈمک کونسل اور پرانی ایگزیکٹیو کونسل معطل کر دی گئی، اور تمام اختیارات اسی نئی ایگزیکٹیو کونسل کو دے دیئے گئے، جس کو مرکزی حکومت کی نگرانی میں کام کرنا تھا، پھر یکم جون ۱۹۷۲ء کو لوک سبھا میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ نہایت عجلت کے ساتھ پاس کر دیا گیا، اس ایکٹ کی رو سے جو مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹیو کونسل اور جو اکیڈمک کونسل بنتی ہے اور ان کے ممبروں کے انتخاب کرنے کے اختیارات اور صلاحیت جن جماعتوں اور افراد کو دی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ محض مرکزی حکومت اور اس کی ایجوکیشن منسٹری کے منشاء کو پورا کرنے والی فرماں بردار جماعتیں ہوں گی، ان میں مسلمانوں کی آزاد نمائندگی کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا، اور اس کے نتیجہ میں مسلم یونیورسٹی کورٹ محض ایک مشاورتی ادارہ بن کر رہ جاتا ہے، اس پس منظر میں یونیورسٹی کے بہی خواہوں کو یہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ ترمیمی ایکٹ کمیونسٹوں کی آرزوؤں کی تکمیل، اور یونیورسٹی پر حکومت کے ذریعہ ان کے اقتدار کی ضمانت ہے۔

"کلیت پسندی" کا خطرناک رجحان

اس مطالعہ اور تجزیہ کی بناء پر یونیورسٹی کے بہی خواہوں نے جن میں ہمارے لکھنؤ کے

www.abulhasanalinadwi.org

رفقاء اور احباب پیش پیش تھے، دارالحکومت دہلی میں (جو علی گڑھ سے قریب بھی ہے) اس موضوع پر ایک آل انڈیا کنونشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، انھوں نے مجھ سے اس کا افتتاح (INAUGURATE) کرنے اور اس موقعہ پر اپنے خیالات کے اظہار کی خواہش کی، مجھے کچھ عرصہ سے حکومت کی کلّیت پسندی کے رجحان کا احساس ہو چلا تھا، اور میں اس کو دانشگاہوں کے حق میں (جن میں مدارس عربیہ اور دینی جامعات بھی دیر سویر شامل ہو جائیں گے) سخت مضر سمجھتا تھا، اس احساس نے اس پر آمادہ کر دیا کہ مدرسہ کا آدمی ہونے کے باوجود یہ ذمہ داری قبول کروں، میں نے اس کے لئے افتتاحی خطبہ لکھا جس میں شاید پہلی مرتبہ اس کلّیت پسندی اور کمیونسٹ ملکوں کی روایت کے مطابق دانشگاہوں کو اپنے انتظام میں لینے کے خلاف واضح طریقہ پر آگاہی دی گئی ہے، بعض غیر مسلم دانشوروں اور پروفیسروں کو اس پر تعجب ہوا کہ ایک مولوی کی کمزور اور مریض آنکھ نے اس خطرہ کو اتنی دور سے کیسے دیکھ لیا، میں نے اس خطبہ میں کہا:۔

"تاریخ جدید کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور ریاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن و اخلاق کے سرچشمے، شخصیت و کردار کی کارگاہیں اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مرکز، بے رحم اور بے ضمیر سیاسی مقاصد اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں اور وہ ان کے مستقبل، اور ان کی موت و حیات کے بارے میں فیصلہ کن بن جائیں، اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ قومی حکومت، غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں قومی زندگی، اور تعلیم و تربیت کے میدان میں رہنمائی کے زیادہ قابل، اور اعتماد کی زیادہ مستحق ہے، اور اب حکومتوں کا دائرۂ اختیار ٹیکس وصول کرنے اور جان و مال کی حفاظت اور ملک کے دفاع تک

www.abulhasanalinadwi.org

محدود نہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ تعلیمی مرکزوں کو صنعتی کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں پر قیاس کرنا، اور ان کو یکسر اپنے نظم ونسق میں لے لینا، ان کا رشتہ اس اقلیتی فرقہ، یا جماعت سے کاٹ دینا جس نے ان کو قائم کیا اور اپنے خون پسینہ سے ان کو پروان چڑھایا، ایک بڑا سنگین اقدام ہے، جس کے نتائج بڑے دوررس اور عمیق ہیں کسی ملک میں ایک ہی طرح کے دل و دماغ کے ڈھالنے، ایک ہی طرح کی سیرتیں اور شخصیتیں پیدا کرنے اور ایک ہی طرح کے سیاسی خیالات و مقاصد رکھنے والوں کا گروہ وجود میں لانے کی کوشش، ملک اور معاشرہ کو ایک بڑے خطرہ سے دوچار کرنے کے مرادف ہے، یہ رویہ کسی شوگر فیکٹری اور کسی گن فیکٹری کے ساتھ تو مناسب ہے، لیکن دانشگاہوں اور ذہنی تربیت کے مرکزوں کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں۔

مذہب اور تعلیم ہی دو مرکز ہیں، جنھوں نے ہمیشہ مریض قوموں کی دستگیری اور مسیحائی کی ہے، اور انھیں سے وہ مصلح، ریفارمر اور انقلابی برآمد ہوئے ہیں، جنھوں نے ملک اور معاشرہ میں زندگی کی ایک نئی روح بیدار کر دی ہے، اور ان کی کشتیٔ حیات کو ہمیشہ کے لئے غرق ہونے سے بچا لیا ہے، یونان اور روما، مشرق اور خود یورپ کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے، یہ نازک وقت پوری سیاسی بیداری، دفاعی قوت، اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ ہر ملک اور قوم پر آسکتا ہے، اگر ہماری تعلیم گاہیں کلیۃً حکومت کے اختیار اور اقتدار میں آجائیں، وہاں ایک ہی طرح کا فلسفہ پڑھایا جانے لگے، ایک ہی طرح کے

www.abulhasanalinadwi.org

ماڈل تیار ہوں، ایک ہی سیاسی پارٹی اور اس کے مقاصد کا ان کو نقیب اور نفارچی بنادیا جائے، وہاں کے اساتذہ اور تعلیمی منتظم سرکار دربار کے چشم و ابرو کے اشارے کو دیکھنے والے ہوں تو پھر اس ملک کو تباہی سے بچایا نہیں جا سکتا۔"

یہ جلسہ ۱۰ر ۱۱ر مارچ ۱۹۷۳ء کو مہندیوں میں منعقد ہوا، پورے ملک سے علی گڑھ کے طلبائے قدیم، ممتاز فضلاء، مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے نمائندے، کل ہند مجلس مشاورت اور مسلم مجلس کے ذمہ دار شریک ہوئے، میرے اور چند رفقاء کے قیام کا انتظام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے مزار و مسجد سے متصل حجرہ میں تھا، مدراس کے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب نے صدارت کی[1] میں نے افتتاحی خطبہ پڑھا جس کا اقتباس اوپر گذر چکا ہے، خدا کا شکر ہے کہ یونیورسٹی کے ڈھانچہ اور روح کی تبدیلی کا جو کام تیزی سے شروع ہو گیا تھا (یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ محض اس کنونشن کی وجہ سے) اس میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا، اور ایک حد تک یونیورسٹی اس فوری خطرہ سے نکل گئی، جو اس کے سر پر منڈلانے لگا تھا، اور ایک طویل پرسکون قانونی و اخلاقی جدوجہد شروع کرنے کا راستہ پیدا ہو گیا، جو قوموں، ملتوں اور زندہ اداروں کی زندگی میں ناگزیر ہے اور جس کو ہر وقت چوکنا اور بیدار رہنے کی ضرورت ہے کہ ؏

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

---

[1] افسوس ہے کہ ، فروری ۱۹۸۴ء کو ان کی وفات ہوئی غفر اللہ لہ مرحوم میں بہت سی ایسی خصوصیات تھیں جو اس طبقہ میں کمتر جمع ہوتی ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب ہفتم

مشرقِ وسطیٰ کے چھ مسلم ممالک کا دورہ اور خلیج عربی کے سفر

دورہ کے لئے ملکوں کا انتخاب

رابطۂ عالم اسلامی نے جس کے امین عام (سکریٹری جنرل) اب شیخ صالح القزاز تھے، جنھوں نے رابطہ کے اولین اور بانی سکریٹری جنرل شیخ محمد سرور الصبّان (سابق وزیر مالیہ مملکت سعودیہ) کے انتقال کے بعد سکریٹری جنرل کا چارج لیا تھا مختلف ممالک میں اپنے وفود بھیجنے کا پروگرام بنایا، ان وفود کے پروگرام میں دنیا کے پانچوں برّاعظم شامل تھے، اور ان کا مقصد مسلمانوں کے حالات و کیفیات، ان کے علمی و تہذیبی اداروں اور ان کی ضرورتوں سے واقفیت بہم پہونچانا، اور وہاں کے باشندوں کو رابطہ کے مقصد و پیام سے آگاہ کرانا تھا، شیخ صالح قزّاز سے میرے روابط رابطہ کی قیام و وجود سے بہت پہلے کے تھے، اور وہ اخلاص و مناسبت اور دینی ذوق پر مبنی تھے، اس کی وجہ سے وہ رابطہ کے مؤثّر ارکان میں (جو سب اپنے اپنے ملکوں کے چیدہ و برگزیدہ اشخاص تھے) مجھ سے خصوصی تعلق اور حسن ظن رکھتے تھے، انھوں نے میرے سامنے مختلف ملکوں کی فہرست رکھی جہاں وفود کو جانا تھا، ان میں امریکہ و یورپ کے مغربی ممالک بھی تھے، اور

www.abulhasanalinadwi.org

جاپان، انڈونیشیا کے مشرقی ممالک بھی، میں نے اپنی قدیم تعلیم اور ذہنی و ثقافتی روابط کی بناء پر اس وفد میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا، جس کو افغانستان، ایران، لبنان، شرق اردن اور شام و عراق کا دورہ کرنا تھا۔

شیخ صالح قزاز نے مجھے اس وفد کا قائد اور سربراہ بنا دیا، میرے علاوہ اس وفد میں رابطہ کے دو فاضل ارکان کو بھی شرکت کرنی تھی، ایک سری لنکا کے حنیفہ محمد حنیفہ (سابق وحال وزیر حکومت لنکا) دوسرے شیخ سعدی یٰسین جو لبنان کے مشہور عالم اور رابطہ کے رکن تھے، لیکن سوءِ اتفاق کہ یہ دونوں حضرات بعض قانونی دقتوں یا ذاتی مصروفیتوں کی بناء پر شریک نہیں ہو سکے، اس لئے ان کی جگہ حجاز کے اسلامی موضوعات پر لکھنے والے مشہور اہل قلم و صاحبِ فکر، جامعۃ الملک عبدالعزیز کے استاد اور رکن مجلس شوریٰ سعودی عرب، استاذ احمد محمد جمال کا انتخاب ہوا، یہ حُسنِ اتفاق تھا یا میری خاص رعایت کہ وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے عزیز گرامی مولوی عبداللہ عباس ندوی کا انتخاب ہوا، جو اس وقت رابطہ کے شعبہ تنظیمات اسلامی کے سکریٹری تھے[1]، میری مزید سہولت کے لئے رابطہ نے ان کو ہندوستان بھیج دیا، تاکہ وہ میرے سفر کے قانونی و انتظامی مراحل کی تکمیل میں مدد کریں اور ہندوستان ہی سے وہ میرے ساتھ ہوں۔

افغانستان و ایران سے دلچسپی

اس زمانہ میں مجھے نقرس (GOUT) کی تکلیف تھی، جس کا سلسلہ ۱۹۶۰ء سے شروع ہو گیا تھا، اور یہ میرا موروثی مرض ہے، جو والد صاحب کو بھی تھا، مجھے اس وقت چند قدم

[1] حال ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر جامعۃ ام القریٰ مکہ مکرمہ۔

www.abulhasanalinadwi.org

چلنے میں بھی تکلف تھا، لیکن احساس فرض احساس مرض پر غالب آیا، جس میں کچھ ان ملکوں کے دیکھنے کا شوق بھی شامل تھا، جن میں افغانستان و ایران میرے لئے نئے تھے، اور وہاں کی تاریخ، زبان و تہذیب ہندوستان کی تاریخ، زبان و تہذیب میں اور پھر اپنے ذہن و حافظہ میں اس طرح تحلیل ہو گئی تھی کہ اس کا الگ کرنا مشکل تھا، اور یہ نقوش بدو شعور ہی سے قلب و دماغ پر ایسے مرتسم ہو گئے تھے کہ گویا یہ احول ہی کی چیزیں ہیں، اور ایک ہی خاندان کی باتیں ہیں، بچپن ہی سے افغانیوں کا آنا جانا جن کو ہم لوگ "آغا" کہتے تھے، قصبات اور دیہاتوں تک میں ہوتا تھا، جن کو ولایتی بھی کہتے تھے، ہندوستانی علماء کے اساتذہ اور علماء میں افغانی النسل حضرات کی ہمیشہ ایک تعداد ہوتی تھی، میرے حدیث کے استاد اور شفیق معلم و مربی مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکیؒ نہ صرف افغانی النسل تھے، بلکہ وہاں کی بہترین خصوصیات و روایات کے نمائندہ اور نمونہ، پھر فارسی نے جو تعلیم کا جز تھی ایران سے ذہنی و ذاتی وابستگی پیدا کر دی تھی، اور سعدیؒ و حافظؒ نے خاص طور پر اس سرزمین رنگ و بو کا شائق، اور اس سے مانوس بنا دیا تھا، اور ان سب خصوصیات نے اس سفر کو اس کمزور صحت، مصروف زندگی میں قابل تحمل ہی نہیں، مرغوب و خوش گوار بنا دیا تھا، اسی بناء پر میں نے سفرنامہ "من نهر کابل إلی نهر الیرموك" میں لکھا ہے کہ جب افغانی طیارہ کے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب ہمارا ہوائی جہاز کابل سے قریب ہے، تو دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، اور کانوں نے بھی اس نام کی حلاوت اور ترنم محسوس کیا، "کان لهذا الاسم رنین فی الآذان وحنین فی القلوب"۔

"دریائے کابل سے دریائے یرموک تک"

یہ سفر ۱۴ جون ۱۹۷۳ء سے ۲۰ اگست ۱۹۷۳ء کے درمیان ہوا تھا، اس کا آغاز

www.abulhasanalinadwi.org

افغانستان سے ہوا اور اختتام شرق اردن پر، اس لئے میں نے اس سفر نامہ کا نام عربی میں "من نهر کابل إلى نهر اليرموك[1]" اور اردو میں "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" تجویز کیا۔

مصنف کی کتابوں میں یہ سفرنامہ اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں ان ممالک کو جن کے ساتھ اسلام کی تاریخ کا بڑا اہم اور طویل حصہ وابستہ ہے، مصنف نے ایک حقیقت پسند مسلمان، تاریخ کے طالب علم، صحیح اسلامی زندگی کے متجسس اور اسلام کے عروج و ترقی کے خواہش مند، لیکن حقائق و واقعات کو ان کی صحیح جگہ دینے اور خطرات و اندیشوں پر نظر رکھنے والے سیّاح کی حیثیت سے دیکھا تھا، اس میں پڑھنے والے کو ایک دردمند مسلمان کے احساسات بھی ملیں گے، اور ایک فکرمند واقف کار کے اندیشے اور پیش گوئیاں بھی، اس میں نہ ضرورت سے زیادہ رجائیت (OPTIMISM) ہے، نہ قنوطیت (PESSIMISM) اس میں بعض اشارے ایسے بھی ملیں گے جو ایک محدود دینی و علمی ماحول میں رہنے والے ہندوستانی مسلمان کی سطح سے بلند اور اس شخص کے لئے جو ذاتی طور پر مصنف سے واقف ہے، خلاف قیاس اور خلاف توقع ہیں، اور وہ بعض مرتبہ فرط استعجاب میں کہہ اٹھے گا ؎

سرِ خدا کہ عارف کامل بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

پھر اس میں سفرنامہ کی دلچسپی، مناظر کی بوقلمونی، اور معلومات اور مواد کا عنصر بھی ہے، شاید اسی بناء پر پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے اردو کے ادیب و نقاد کو میری ناچیز تصانیف

---

[1] دریائے یرموک جس کے کنارہ یرموک کا تاریخ ساز معرکہ خلافت فاروقی میں ۵ رجب ۱۵ھ (۶۳۶ء) ہوا تھا، شرق اردن کی پہاڑیوں کے نیچے شام کے علاقہ میں بہتا ہے، اور مصنف نے بلندی پر کھڑے ہو کر اس کا نظارہ کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

میں یہ کتاب سب سے زیادہ پسند آئی، اور انھوں نے اپنے خطوط میں اس سے اپنے گہرے تأثر کا اظہار کیا[1]، اپنے ایک خط میں جو ۲۴ر جنوری ۱۹۷۵ء کا لکھا ہوا ہے تحریر فرماتے ہیں:-

"اسلامی ممالک اور ان کے مسائل سے آگاہ ہونے اور رکھنے کا یہ کتاب بڑا معتبر وسیلہ ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے جتنے عظیم مقاصد اور مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس امر سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اس سے یہ خیال دل میں آنے لگتا ہے کہ اگر آپ برابر ایسے سفر پر رہیں تو مسلمانوں اور ملت پر بڑا احسان ہوگا"

مجھے آنے جانے والوں میں بالخصوص ان کے سعید بھانجہ ڈاکٹر فصیح نے جو مسلم یونیورسٹی ہی میں استاد ہیں، بتایا کہ وہ اپنے یہاں آنے جانے والوں کو بھی اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو (RATIONING) کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہیئے[2]۔

انقلابات سے پہلے

یہ بھی تقدیر الٰہی کی کارفرمائی تھی کہ مجھے ان ملکوں کی سیاحت اور آزادانہ اور بے تکلفانہ طریقہ پر دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ان انقلابات سے پہلے مل گیا جنھوں نے ان ملکوں کا حلیہ ہی بدل دیا، اور ان انقلابات کے بعد اب ان ملکوں میں آزادانہ چلنا پھرنا، لوگوں سے ملنا اور حقیقت حال کا معلوم کرنا ہی مشکل ہوگیا، ان ملکوں میں چار ملک افغانستان، ایران، لبنان اور کسی حد تک عراق انقلاب کی زد میں آگئے، بہت اچھا ہوا کہ ان ملکوں کو اس زمانہ میں دیکھ لیا، جب ان کا رشتہ اپنی قدیم تاریخ و تہذیب سے کٹا نہیں تھا، اور ایک ایسی

---

[1] ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۱۸۱-۱۸۴ [2] ایضاً ص ۱۸۱

www.abulhasanalinadwi.org

مصنوعی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی جس میں بقول غالب ؎

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

افغانستان کا ماضی و حال

کہا جا سکتا ہے کہ اس پورے سفر میں سب سے زیادہ جی افغانستان میں لگا، شاید اس وجہ سے بھی کہ یہ افغانستان کے اس دور کا جو اسلام کے داخلہ کے بعد سے قائم ہوا تھا، دمِ واپسیں تھا[1]، وہاں کی تقریریں جن کا کچھ نمونہ آگے آئے گا، دل کی صحیح ترجمانی تھی، مقرر کی زبان اور مصنف کا قلم دونوں اس کے ذکر میں اپنے پورے جوش پر معلوم ہوتے ہیں، اس کے ساتھ اس ملک میں اپنی ساری دینی صلابت اور قدیم افغانی روایت کے ساتھ جو تبدیلیاں آچکی تھیں، اور جن عظیم تر تبدیلیوں کے آثار اُفق پر نمودار ہو گئے تھے، مصنف نے ان کو بھی دیکھا، اور اپنے سفرنامہ میں دوسروں کو دکھانے کی کوشش کی، ایک جگہ یہ لکھا ہے :-

"ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ ملک میں مغربی تہذیب بہت آگے جا چکی ہے اور اس کے کھلے ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں ۱۹۲۸ء (جب امیر امان اللہ خاں کو بعض قدیم اسلامی روایات کی خلاف ورزی کی بناء پر تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا تھا) اور ۱۹۷۳ء کے درمیان وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے"

---

[1] مصنف کے وہاں سے آنے کے پانچ ہفتے .... بعد ہی وہاں وہ انقلاب آگیا جس کا اختتام اور نقطۂ عروج کمیونسٹ اقتدار اور روس کی سرپرستی و نگرانی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

............افغانی قوم اپنے ماضی سے بہت دور جا پڑی ہے، اور یہ دوری ماہ و سال کی تعداد کے اعتبار سے تو بہت کم ہے یعنی صرف پینتالیس ۴۵ سال لیکن فکری و تمدنی اعتبار سے یہ مسافت بہت طویل ہے، اکثر قومیں کہیں صدیوں میں یہ مسافت طے کرتی ہیں[۱]،.........دین کے نمائندہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بہت وسیع ہوگئی ہے جس کو پُر کرنا آسان نہیں ہے"!

اس مختصر قیام میں (جو آٹھ روز سے زائد نہیں تھا) یہ محسوس کر لیا گیا کہ اس کی ایک بڑی وجہ قوم میں علماء کے اثرات کی روز افزوں کمی ہے جن کا زمانۂ سابق میں ایسا اثر تھا، جو شاید کسی اسلامی ملک میں نہیں تھا، علماء کے نعرۂ جہاد — جس کو وہ عام طور پر غزا کہتے تھے — کی صدائے بازگشت سے شہر، قصبات اور دیہات گونج اٹھتے، اور عوام و خواص کے دل و دماغ نشۂ جہاد سے معمور و مخمور ہو جاتے[۲]، شاید علامہ اقبال کے بیان کردہ ابلیس کی اس حکیمانہ وصیت پر عمل کیا گیا جس میں اس نے کہا تھا ؎

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

قیادت علماء کے ہاتھوں سے نکل کر ریاست دانوں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، جو ہر معاملہ کو اقتصادیات اور سیاست کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور "صورت حال" کے سامنے سر جھکا دینا ہی حقیقت شناسی کا تقاضا سمجھتے ہیں۔

---

[۱] "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" ص۳۱ [۲] اور اسی اثر و نفوذ کا نتیجہ تھا کہ انگریزی افواج کبھی افغانستان پر قابض نہیں ہو سکیں اور ۱۸۳۹ء کی مہم پوری کی پوری تباہ ہوگئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس سفرنامہ میں جو انقلاب سے پہلے لکھا گیا، سردار محمد داؤد خاں کے متعلق اندیشے ظاہر کئے گئے ہیں اور ان کی ترقی پسندی اور آزادی کا ذکر ہے اور وہی بعد میں اس انقلاب کے ہیرو ثابت ہوئے، جس نے روسی مداخلت کے لئے راستہ صاف کیا، اور اب یہ مجاہد و غیور ملک جو ہر دور میں ہندوستان میں اسلامی اقتدار کو سہارا دیتا رہا ہے کمیونزم اور الحاد کی گود میں جا پڑا ہے اس سفرنامہ میں صفائی کے ساتھ لکھا گیا کہ کمیونزم یا لادینیت کی گود میں پناہ لینے، مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر پر ٹوٹ پڑنے اور مغربی قوموں کی ہم رکابی اختیار کرنے کی ذمہ داری صرف افغانستان ہی پر نہیں ہے بلکہ افغانستان کے ساتھ عالم اسلام بھی اس سے بری نہیں قرار دیا جا سکتا، خاص طور پر دولت مند مسلم ممالک جنھوں نے اس کو امداد اور ترقی دینے سے غفلت برتی جب کہ سوویت روس اور سرخ چین نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا، اور اس کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے گرانقدر امداد دی، اور اس کا اثر قدرتی طور پر پڑا۔

میں نے اس کا بھی اظہار کیا کہ افغانستان کا تعلیمی رشتہ (پاکستان کے حائل ہو جانے کی وجہ سے) عرصہ سے ہندوستان سے ٹوٹا ہوا ہے جس کے نتیجہ میں اسے اپنے قدیم علمی ورثہ پر قناعت کرنی پڑی، اور جدید علمی و دینی سرگرمیوں اور پیش رفت سے اس کا براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکا، اگر مصر اور اس کا جامعہ ازہر[1] نہ ہوتا تو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اسلامی تحریکوں سے افغانستان کا تعلق بالکل ہی منقطع ہو جاتا۔

---

[1] جہاد افغانستان کے موجودہ قائد عبد الرسول سیاف اور کابل یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ کے پرنسپل غلام محمد صاحب نیازی، پروفیسر برہان الدین ربانی اور ڈاکٹر محمد موسیٰ توانا وغیرہ مصر ہی کے تعلیم یافتہ ہیں جنھوں نے وہاں کے زمانۂ قیام میں نیا ایمان پرور لٹریچر اور اسلامی تحریکوں کا مطالعہ کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

قیام کابل کی اہم تقریریں دو تھیں[2]، ایک کابل یونیورسٹی کی تقریر جو یونیورسٹی کے ہال میں ۶ر جون ۱۹۷۳ء کو طلباء اور اساتذہ اور دانشور طبقہ کے ایک بڑے مجمع کے سامنے کی گئی[1]، اور ایک وہ تقریر جو سعودی سفارت خانہ کی طرف سے دیئے ہوئے استقبالیہ میں کی گئی۔

ملاقاتیں اور دید و شنید

افغانستان کے آٹھ روزہ قیام میں جس میں صرف کابل اور غزنی ہی رہنا ہو سکا، اور جو وزارت تعلیم کی ضیافت اور رہنمائی میں تھا، ہم نے تعلیمی، ثقافتی اداروں کا معائنہ بھی کیا، خواتین کے ایک تعلیم یافتہ مجمع سے خطاب بھی، علمائے کابل سے گفتگو بھی رہی اور ان کے سامنے اس وقت اسلامی بیداری پیدا کرنے اور قوم کی رہنمائی کے مشورے اور تجربے بھی رکھے، متعدد وزراء اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقاتیں بھی رہیں، مجددی خاندان کے محترم افراد سے جن کا مرکز قلعہ جواد[2] تھا، جامع مسجد میں بھی خطاب ہوا، اور آثار قدیمہ اور باغات بھی دیکھے۔

سکندر اسلام محمود غزنوی کے دار الحکومت میں

سب سے زیادہ اثر غزنی پہونچ کر ہوا، جو سلطان محمود غزنوی کا دار السلطنت اور ایک زمانہ میں عالم اسلام کا دوسرے نمبر (بغداد کے بعد) کا شہر تھا، سلطان محمود غزنوی کی قبر پر بھی گئے، اور حکیم سنائی کے مزار پر بھی حاضر ہوئے، محمود غزنوی کی قبر پر پہونچ کر قلم سے

---

[1] یہ تقریر "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" کے صفحات ۵۹-۶۱ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

[2] افسوس ہے کہ وہ تباہ ہو چکا اور سربرآوردہ حضرات شہید اور جلا وطن ہو گئے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بے اختیار یہ سطریں نکلیں :۔

"ہم حرار شاہی پر تصویر حیرت بنے کھڑے رہے، یہاں وہ شیر سو رہا ہے جس کی ہیبت سے افغانستان اور ہندوستان کے بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی نیند اڑ جاتی تھی، آج وہ خود محو خواب ہے محمود کے درباری شاعر فرخی نے اس کی موت پر جو دل دوز مرثیہ کہا تھا اس کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے ۔

اے بادشاہ اٹھ، بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں، جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیئے اور تحفے لائے ہیں، کس کی طاقت ہے کہ تجھ کو اس نیند سے جگا سکے ؟ تو ایسی نیند سویا ہے کہ اب پھر نہ جاگے گا! اے آقا دیر تک تو سونا تیری عادت نہ تھی کسی نے اس طرح تجھ کو سوتے نہ دیکھا تھا"[1]

بادشاہوں کے جاہ و حشم کے اس انجام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سب بچوں کا کھیل اور اسٹیج کی نقالی ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتانِ آزری

اللہ نے سچ کہا ہے "وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ"[2]

ایران میں

اب ایران کی باری تھی جس کو اردو سفرنامہ میں ذوق جمال اور رعنائی خیال کی سرزمین سے تعبیر کیا گیا ہے[3]، ایران میں وفد نے دس روز گذارے (۱۱-۲۰ جون) اس مدت میں

---

[1] ترجمہ ماخوذ از "شعر العجم"   [2] ص ۵۰-۵۲ باختصار۔

[3] عربی سفرنامہ کا حصہ جو ایران سے متعلق ہے اردو میں مولوی نذر الحفیظ ندوی کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

طہران، قم، مشہد، طوس، اصفہان، اور شیراز جانا ہوا، وزراء علماء سے ملاقاتیں رہیں، دینی و تاریخی مقامات دیکھے، مجالس مذاکرہ اور استقبالیہ جلسوں میں شرکت رہی، امام غزالی شیخ سعدی، حافظ شیرازی، حضرت علی رضا، سیدہ معصومہ، خلیفہ ہارون رشید کے مزارات و قبور کی زیارت کی، طوس کی مردم خیز سرزمین، اصفہان و مشہد کے تاریخ ساز شہر اور شیراز کی مردم خیز اور شاعری و ساحری کی سرزمین کی بھی زیارت کی، تخت جمشید کو بھی دیکھا جہاں دو برس پہلے حکومت ایران نے الف لیلائی انداز میں ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا تھا، تخت طاؤس کو بھی دیکھا۔

لیکن حیرت ہے کہ اپنے نقطہ سے لفظ اور لفظ سے عبارت پڑھ لینے کے اس ذوق کے باوجود جس کا اظہار سفر افغانستان میں کیا گیا، ہمیں مستقبل قریب میں (جس پر ۸-۹ سال ہی کی مدت مشکل سے گذری ہوگی) اس زبردست تحریک کے کوئی آثار نظر نہیں آئے، جس نے ایران میں مستحکم ترین پہلوی سلطنت کو ختم کر کے "ولایت الفقیہ" یا امام غائب کے نائب کی حیثیت سے آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب کا وہ روحانی اور سیاسی اقتدار قائم کر دیا، جس نے ایک طرف اپنی پُراسرار تنظیم میں قلعۂ الموت کے باطنی فرماں روائی اور دوسری طرف (بالکل متضاد طریقہ پر) اپنے مخالفوں کو ختم کرنے اور اپنے امیر کے حکم پر بلا تمیز سن و سال، خوشی خوشی جان دینے میں پہلی دوسری صدی ہجری کے خوارج کی یاد تازہ کردی، پورا ملک تمدن و ترقی، امارت و رفاہیت، اور نغمہ و سرود میں ڈوبا ہوا تھا، کہیں گداگر اور پریشان حال لوگ نظر نہیں آتے تھے، علماء، ادباء، نوجوان و کہن سال سب ملے مگر کسی نے کسی بے چینی یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا، یہ یا تو اس حصار کا نتیجہ تھا، جو باہر سے آنے والوں کے گرد قائم کر دیا جاتا ہے، یا تحریک کی خفیہ تنظیم و رازداری کا کرشمہ کہ ہم زیر زمین

www.abulhasanalinadwi.org

(UNDERGROUND) تنظیم کا کوئی پتہ نہیں چلنے پایا۔

ذاتِ نبویؐ اور سیرتِ نبویؐ سے تعلق ثانوی درجہ میں

مصنف کا نشو و نما چونکہ لکھنؤ میں ہوا تھا، اس لئے اس کو ایران آکر شیعی عقائد، اثنا عشری حضرات کی نفسیات و ذہنیت، ذاتِ نبویؐ کے مقابلہ میں اہلِ بیت سے شیفتگی، مساجد سے زیادہ مشاہد کی آبادی اور رونق کے بارے میں کوئی ایسی نئی چیز نہیں معلوم ہوئی، جس کو انکشاف کہا جائے، البتہ سیدنا علی مرتضیٰؓ اور ائمہ اہلِ بیت کی تصویریں کثرت سے گھروں میں اور مسجدوں میں نظر آئیں، بلکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصاویر بھی جابجا آویزاں نظر آئیں یہ بات ہندوستان کے شیعی مرکزوں میں نہیں دیکھی تھی، سفرنامے میں "عزیب شہر سخنہائے گفتنی دارد" کے عنوان کے تحت قلم سے کچھ تاثرات نکل گئے ہیں جن میں اپنے اس احساس کا اظہار کیا گیا ہے کہ :۔

"شیعہ حضرات کا ان ائمہ اہلِ بیت سے اتنا غیر معمولی جذباتی تعلق، اور اہلِ بیت کی محبت میں حد سے بڑھا ہوا انہماک عقل و جذبات اور ضمیر پر غالب آگیا ہے، اور ہمارا تاثر یہ ہے کہ اس شیفتگی و شغف نے اس تعلق و محبت کو کسی حد تک مجروح اور کمزور کر دیا ہے، جو نبوت محمدیؐ اور ذاتِ نبویؐ کے ساتھ ہر مسلمان کا ہونا چاہیئے، جس کی وجہ سے اہلِ بیت نے عزت و شرف کا مقام حاصل کیا اور وہ ہماری محبت و تعظیم کے مستحق قرار پائے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اندرونی ربط و تعلق کا ایک حصہ جو اس ذاتِ گرامی کے ساتھ اس تعلق میں داخل ہو گیا ــــــــــــــــــــــــــــ

www.abulhasanalinadwi.org

بلکہ اس کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیز امامت کو نبوت کا حریف اور اس کی بہت سی صفات و خصوصیات میں شریک و سہیم نہ بنا دے[۱]"۔

یہ محض اندیشہ اور قیاس آرائی نہیں، فرقہ اثنا عشریہ کی مستند ترین کتاب "الکافی" وغیرہ دیکھنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، امام خمینی کی تازہ کتاب "الحکومۃ الاسلامیۃ" میں صاف صاف آیا ہے کہ ہمارے مذہب کے بدیہی اور مسلّم الثبوت مسائل میں سے یہ ہے کہ ہمارے ائمہ کو وہ مقام حاصل ہے جس کو کوئی مقرب فرشتہ یا مبعوث نبی بھی نہیں پہونچ سکتا، یہ بھی تصریح ہے کہ ان کو وہ خلافت تکوینی حاصل ہے جس کا اس کائنات کا ہر ذرہ تابع فرمان اور زیر اقتدار ہے[۲]۔

یہی قلبی تأثر تھا، جو میری اس تقریر میں ابھر کر سامنے آگیا جو اس جلسۂ استقبالیہ میں کی گئی تھی، جو آیت اللہ العظمیٰ، مرزا محمد خلیل کمرئی کے دولت کدہ واقع زریں نعل طہران میں کی گئی تھی[۳]:-

"محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ایک نئے دور کا آغاز تھی، بنی آدم میں سے جس کو بھی سعادت و خیر کا کوئی ذرہ ملا، وہ خواہ امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؓ ہی کے مرتبہ کا کوئی شخص کیوں نہ ہو، سیدنا محمد بن عبد اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ ہی سے نصیب ہوا ے

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں ۔۔۔ کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ۔۔۔ غبار راہ کو بخشا فروغ وادئ سینا

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ص۱۰۴-۱۰۶

[۲] الحکومۃ الاسلامیۃ ص۵۲ [۳] اردو میں ترجمہ مولوی اجمل اصلاحی ندوی کے قلم سے۔

www.abulhasanalinadwi.org

دعوت و تبلیغ کی راہ میں سب سے بڑی چٹان

اثنا عشری حضرات کا صحابہ کرامؓ کے بارے میں جو عقیدہ ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا گیا:۔

"لوگ یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جب اسلامی دعوت اپنے سب سے بڑے داعی کے ہاتھوں اپنے دور عروج میں کوئی دیرپا اور گہرے نقوش مرتسم نہ کر سکی، اور جب اس دعوت پر ایمان لانے والے اپنے نبی کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کے وفادار اور امین نہ رہ سکے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس صراط مستقیم پر صحابہ کرامؓ کو چھوڑا تھا، ان میں سے معدودے چند آدمی ہی اس پر گامزن رہے[1]، تو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ اس کے اندر نفوس کے تزکیہ کی صلاحیت ہے، اور وہ انسان کو حیوانیت کی پستی سے نکال کر انسانیت کی بلند چوٹی تک پہونچا سکتی ہے، اور ہم کس امید پر اس وقت دنیا کی قوموں اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے سکتے ہیں؟[2]"

---

[1] شیعی علماء اور مصنفین معاذ اللہ اس ارتداد عام سے مشکل سے چار پانچ صحابہؓ کو مستثنیٰ کرتے ہیں، سلمان فارسیؓ عمار بن یاسرؓ، مقداد بن الاسودؓ، ابوذر غفاریؓ، اسی سلسلہ میں مشکل سے ایک دو نام اور لئے گئے ہیں۔

[2] مصنف نے لکھنؤ کی ایک تقریر میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ فرض کیجئے کہ اسلام کا ایک نمائندہ ہائیڈ پارک لندن میں یا امریکہ کے کسی ہال میں اسلام کی صداقت پر مؤثر تقریر کر رہا ہے، اور بڑے جوش کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کرتا ہے، شیعی عقیدہ سے واقف ایک شخص اس کو برملا ٹوک دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ پہلے آپ اپنے گھر کو دیکھئے اور اپنی خبر لیجئے، آپ کے نبی کی ۲۳ سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ صرف ۴۔۵ آدمی ہیں (باقی ص۱۵۸ پر)

www.abulhasanalinadwi.org

ایران کے اس قیام میں میں نے وہاں کے بعض اہل فکر سے جن میں وہاں کے وزیر تعلیم (MINISTER OF HIGHER EDUCATION) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک سوال کیا جس کا تعلق تاریخ اور فلسفۂ تاریخ سے ہے، اور جس کو اقبال نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

میں نے کہا کہ ایران کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو بعض اوقات محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ایران میں بجز (GENIUS) اور عبقری انسانوں کے اور کوئی پیدا ہی نہیں ہوتا، اور "لنکا میں ہر ایک ۵۲ گز ہی کا ہوتا ہے" اب اس ذہنی و علمی زوال اور قحط الرجال کی کیا توجیہ ممکن ہے کہ صدیاں گزرتی چلی جارہی ہیں اور متوسط سطح سے بلند اور عالمی شہرت کا کوئی آدمی سننے میں نہیں آتا، اس کا کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایران کے جمود و انحطاط کا یہ سبب تو نہیں ہے کہ خیالات کی بلندی، حوصلہ مندی، مادّیت کے خلاف بغاوت، حقیقت کی جستجو، سازِ دل کو چھیڑنے اور روح کے سرچشموں کے جاری کرنے میں جس تصوف نے مرکزی و بنیادی کردار ادا کیا تھا، اس کا خاتمہ ہو گیا؟ یا اس انحطاط و جمود کی علت یہ ہے کہ علم و مسلک کے بارے میں ایران میں عرصہ سے ایک مخصوص اور محدود شکل پر انحصار کر لیا گیا ہے اور اس کے علاوہ

(باقی صـ۱۵۷ کا) جو آپ کی وفات کے بعد آپ کے راستہ پر گامزن رہے، باقی ہزاروں بلکہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمیوں نے جو آپ کی محبت و پیروی کا دم بھرتے تھے (معاذ اللہ) ارتداد کا راستہ اختیار کیا، آپ کس منہ سے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے ثبات و استقامت کی کیا ضمانت ہے؟ کیا اس کا جواب ممکن ہے؟

www.abulhasanalinadwi.org

دوسرے ملک اور ہر نظام کو ملک سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس طرح ایران صفویوں کے دَور کے بعد سے ایک (مذہبی اور فکری) خول میں زندگی گزار رہا ہے، اور اس کو باہر کی دنیا کے جھونکے جو اس کے علمی و فکری قویٰ میں حرکت پیدا کریں، اور اس کے علمی و ادبی ذخیرہ میں اضافہ کریں، نہیں پہونچنے پاتے[1]

مشرق و مغرب کے سنگم لبنان میں

۲۱ رجون کو ایران سے ہمارا وفد چند گھنٹے بیروت ٹھہرتا ہوا مکہ معظمہ آ گیا، اس لئے کہ وفد کے سکریٹری مولوی عبداللہ عباس ندوی کو بعض شدید مجبوریوں کی بناء پر مکہ معظمہ قیام کرنا تھا، ان کی جگہ پر رابطہ نے وفد کو ایک دوسرا اسکریٹری استاذ عبداللہ بابسری دیا اور میرے ذاتی رفیق و معاون کی حیثیت سے میرے بھانجہ مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی کو وفد میں شامل کیا، ان کو ہندوستان سے سعودی عرب پہونچنے میں خاصی تاخیر ہوئی اور اس بناء پر حرمین شریفین میں پانچ ہفتے قیام کرنا پڑا جس سے فائدہ اٹھا کر میں نے افغانستان و ایران کی روئیدادِ سفر عربی میں مرتب کی تا کہ اس کو رابطہ کے سامنے پیش کر سکوں۔

۲۹ رجولائی ۱۹۷۳ء کو ہم نے دوسرے سفر کا آغاز کیا جس کی پہلی منزل بیروت تھی، بیروت میں مختلف اداروں اور تنظیموں کو دیکھنے کا موقعہ ملا، مختلف استقبالیہ جلسوں میں شرکت ہوئی، طرابلس، سیر، صیدا بھی جانے کا موقعہ ملا، ملک کے عمائد، قائدین مسلمان وزراء، اور ممتاز علماء سے ملاقاتیں رہیں، لبنان کے دار الافتاء میں ایک اہم اعزازی تقریب منعقد ہوئی، جو مفتی لبنان شیخ حسن خالد نے ترتیب دی تھی، اس میں اس وقت کے

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۱۱۲-۱۱۵

www.abulhasanalinadwi.org

لبنان کے وزیر اعظم استاذ تقی الدین الصلح، سابق وزیر اعظم استاذ صائب سلام، مفتی امین الحسینی اور متعدد وزرائے مملکت، ممبران پارلیمنٹ، عمائدین شہر، علماء اور قضاۃ اور ادباء و مفکرین کی بڑی تعداد شریک تھی، راقم نے تہذیبوں کے سنگم اور عالمی اسٹیج پر "مسلم قوم کے کردار" کے عنوان پر تقریر کی، اور علماء و ماہرین فقہ کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا۔

اندیشے اور خطرات

لبنان کے قیام میں آنکھوں نے بعض ایسے حقائق اور علامتیں دیکھیں، اور دل نے بعض ایسے خطرے محسوس کئے جن کا اس سفر نامہ میں تذکرہ ذرا قبل از وقت معلوم ہوتا تھا لیکن ۱۹۸۲ء کے لبنان کے المیہ نے ان کی تصدیق کر دی۔

دو دن دمشق میں

۵ رجب ۱۳۹۳ھ ۳ اگست ۱۹۷۳ء کو ہم دمشق کے لئے روانہ ہوئے، یہ جمعہ کا دن تھا، یہ شام کا چوتھا سفر تھا[1]، اور جیسا کہ حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ حرمین شریفین کے بعد اگر کوئی شہر مصنف کے لئے سب سے زیادہ معروف و مانوس کہا جا سکتا ہے تو وہ دمشق ہی ہے جیسا کہ سفر نامہ میں آیا ہے:۔

"یہ چوتھا سفر آٹھ برس کے وقفہ کے بعد پیش آیا تھا، یہ وقفہ ماہ و سال کے

---

[1] یاد رہے کہ یہ زمانہ بعث پارٹی کی حکومت اور حافظ الاسد کی صدارت اور فوجی حکومت کا زمانہ تھا، جو تادم تحریر قائم ہے، حافظ الاسد اور ان کے اکثر معاونین نصیری فرقہ دروزیوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو علوی کہتے ہیں، اور ان کو مسلمان جاننا اور کہنا مشکل ہے، اور ان کو خود بھی اس پر اصرار نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

حساب سے طویل نہیں تھا لیکن حوادث سے پُر اور بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس وقفہ میں ملک متعدد انقلابات سے دوچار ہوا، بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں، کتنی حکومتیں آئیں اور گئیں، اسی وقفہ میں ۵ جون ۱۹۶۷ء کا روح فرسا حادثہ پیش آیا، اور ان عرب ملکوں کے نقشہ میں جن کی سرحد اسرائیل سے ملتی ہے، اور عرب اسرائیل مسئلہ سے براہ راست دوچار ہیں، بڑی اہم اور عظیم تبدیلیاں وجود میں آئیں گویا یہ وقفہ مسلم عرب قوم کی تاریخ میں فیصلہ کن وقفہ تھا جس کی جڑیں بہت گہری اور جس کے نتائج و اثرات بڑے دوررس تھے۔"

خواب یا حقیقت؟

ہم نے صرف جمعہ اور ہفتہ کا دن (۳، ۴ اگست) دمشق میں گزارا تھا، وہاں احباب اور بزرگوں کا وسیع حلقہ تھا، ان سب سے ملنے کا خیال تھا، حمص، حماۃ اور حلب کا بھی پروگرام تھا، سعودی سفارت خانہ نے اتوار (۵ اگست) کو وفد کے اعزاز میں جلسہ اور دعوت کا پروگرام بنایا تھا، اور متعدد وزراء، سفراء، علماء اور عمائدین شہر کو دعوت نامے بھیج دیئے تھے۔

لیکن ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب (۴، ۵ اگست) میں ڈرامائی طریقہ پر ہمارے وفد کو شام کے حدود سے خارج کر کے لبنان کی حدود میں پہونچا دیا گیا، اور یہ سب اس طرح پیش آیا، جیسے کوئی خواب دیکھا ہو، مصنف نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ قرآن مجید نے حضرت موسیٰ کے سینا سے مصر آنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ   موسیٰؑ شہر میں اس وقت داخل ہوئے

www.abulhasanalinadwi.org

غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا۔ (القصص۔۱۵) جب شہر کے لوگ نیند اور غفلت میں تھے۔

لیکن ہمارے ساتھ معاملہ اس طرح پیش آیا کہ عربی میں یوں کہا جائے گا "وَخَرَجَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا" (شہر سے اہل شہر کی بے خبری اور لاعلمی میں نکل گئے) صبح ملاقاتوں کا وقت مقرر تھا، کئی دوستوں کے گھر، اور علمی و دینی اداروں میں جن سے ابھی تک رابطے قائم تھے، جانا تھا، لیکن یہ سب خواب و خیال بن کر رہ گیا کہ اچانک نصف شب میں مخابرات (سی۔ آئی۔ ڈی) کے لوگ فندق امیہ کے اس کمرہ میں آئے جہاں ہم سو رہے تھے، اور حکم دیا کہ سامان باندھئے اور روانہ ہو جائیے پہلے تو ہم سمجھے کہ ہم کو پولیس اسٹیشن یا جیل خانہ لے جائیں گے، وہاں شریف آدمی کی جو گت بنتی ہے، اور اس پر جو گزرتی ہے، اس کے قصے ہم سنا اور پڑھا کرتے تھے، لیکن موٹر روانہ ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہم کو شامی لبنانی سرحد کی طرف لے جا رہے ہیں۔

بیروت کے اخبار "الحیاۃ" نے اس واقعہ کی خبر ۸ رجب ۱۳۹۳ھ مطابق ۷ر اگست ۱۹۷۳ء کو دوشنبہ کے روز شائع کی اور اس سے بیروت میں ہمارے دوستوں کو اس واقعہ کا علم ہوا، اسی روز بی۔ بی۔ سی لندن اور اسرائیل ریڈیو نے بھی یہ خبر نشر کی اور بیروت اور دوسرے عربی ممالک کے اخبارات نے اس واقعہ پر تبصرہ کیا، اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، بیروت میں سارے دوست واحباب ملاقات کے لئے آتے، واقعہ کی تفصیلات دریافت کرتے، محو حیرت ہوتے اور مسئلہ سے دلچسپی کا اظہار کرتے۔[1]

ہارون رشید کے پایۂ تخت بغداد میں

دوشنبہ ۷ر اگست ۱۹۷۳ء کو ہمارا وفد بغداد کے لئے روانہ ہوا، اور دجلہ کے

---

[1] "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" صفحہ ۱۸۳-۱۸۴

سامنے شارع ابونواس کے عظیم الشان ہوٹل "ایمبسڈر" میں حکومت عراق کے مہمان کی حیثیت سے قیام ہوا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اندازہ ہو گیا کہ ہم ہر وقت اور ہر جگہ سرکاری نگرانی میں ہیں، بغداد میں ہم نے ان برگزیدہ اشخاص اور مشاہیر اسلام کے قبور کی زیارت کی جن کے ہم پایہ مشکل سے کسی اسلامی دارالحکومت میں محو خواب ہوں گے، بقول حالی ؎

پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

دیوان الاوقاف کے اعزازی جلسہ میں جس میں بغداد کے ممتاز ترین علماء اور مساجد کے خطباء موجود تھے، زبان حال ... کہہ رہی تھی ؎

گفتگو آئین درویشی نبود
ورنہ باتو ماجراہا داشتیم

اس تاریخی شہر میں ہم نے بغداد یونیورسٹی "المجمع العلمی العراقی" "المجمع العلمی الکردی" اور عراقی میوزیم بھی دیکھا، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے مرقد "الحضرة الکیلانیة" اور امام اعظمؒ کے مزار "الاعظمیة" کی زیارت کی، میرا یہ بغداد کا دوسرا سفر تھا، پہلا سفر (جیسا کہ حصہ اول میں ذکر آیا ہے) ۱۹۵۶ء میں ہوا تھا، صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ عبدالکریم قاسم کے انقلاب سے پہلے ملک زیادہ خوشحال اور مستحکم تھا، قوم میں آج سے زیادہ آزادی، بے فکری اور اعتماد تھا، تاریخ کے ایک طالب علم اور ملکوں کا سیاح یہ دریافت کرنے میں حق بجانب ہے کہ ان مشرقی ممالک کو ان ہولناک انقلابات سے کیا ملا، جو حالات کو سدھارنے، قوم کو ظلم و استبداد کے آہنی پنجہ سے آزاد کرنے

www.abulhasanalinadwi.org

اور اس کی اس فطری حریت کو بحال کرنے کے لئے رونما ہوئے تھے۔

قرآن کی مشکل کشائی

حکومت نے جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے ہمارے لئے "جامع الشہداء" کا انتخاب کیا تھا، جو بغداد سے کئی کلو میٹر دور ہے، شدید گرمی کا زمانہ تھا، منتظمین کو اندازہ تھا کہ دوپہر کے وقت وہاں لوگوں کا پہونچنا بہت مشکل ہے، ہم لوگوں کی آمد کی عام طور پر خبر بھی نہیں تھی لیکن معلوم نہیں کیسے یہ خبر پھیل گئی، اور مسجد نمازیوں سے بھر گئی، حاضرین نے خواہش کی کہ میں نماز کے بعد تقریر کروں، اس فضا اور حالات میں میرے لئے تقریر کرنا بہت مشکل تھا، میں نے ہر چند معذرت کی لیکن بے سود، وزارت اوقاف (جو ہماری میزبان تھی) کے قائم مقام صدر استاذ عبد الرزاق فیاض نے جب حاضرین کا اشتیاق واصرار دیکھا تو منظوری دے دی، میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں حالات کی رعایت کرتے ہوئے محراب و منبر (جو حق بات کہنے کی سب سے زیادہ موزوں جگہ ہے) اور اپنے ضمیر کے ساتھ کیسے وفاداری برتوں؟

لیکن اس موقعہ پر بھی قرآن نے مشکل کشائی کی جیسے ہمیشہ کرتا رہا ہے، خود استاذ عبد الرزاق فیاض بلند آواز سے سورہ انبیاء کی تلاوت کر رہے تھے، میں نے اسی سورہ کی ایک آیت کو موضوع تقریر بنایا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے، جس میں تمہارا تذکرہ ہے تو تم غور کیوں نہیں کرتے۔

www.abulhasanalinadwi.org

میں نے صالح اور غیر صالح افراد، اچھی اور بری جماعتیں، خدا ترس، معدلت شعار اور سرکش اور ناخدا ترس حکومتوں کا وہ حلیہ اور چہرہ پیش کیا جو قرآن مجید میں مختلف مقامات میں آیا ہے، اور ان کے انجام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، میں نے کہا کہ میں نے قرآن مجید کا آئینہ سامنے رکھدیا ہے، اس میں ہر ایک اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے، اور اپنی اصلاح کر سکتا ہے، اس طرح میں نے اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر قرآن کی زبان میں سب کچھ کہہ دیا، اور "ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق" کی تفسیر کردی، کسی کو گرفت کا موقعہ بھی نہیں تھا۔

تقریر ختم ہونے کے بعد حاضرین مصافحہ اور معانقہ کے لئے چل پڑے اور ایک نے میرے کان میں چپکے سے کہا "ہجوم دس گنا ہوتا اور پورا بغداد امنڈ آتا اگر حالات معمول پر ہوتے اور لوگوں کو آزادی حاصل ہوتی"!!

شہیدوں اور پاسبانوں کی زمین اردن میں

ہمارے اس دورہ کی آخری منزل "شرق اردن" تھا، ہم ۱۲ ؍ اگست ۷۳ء کو عمّان کے لئے روانہ ہوئے، ایک گھنٹہ کے لئے بصرہ کے ہوائی اڈہ پر بھی اترے، جس کے دیکھنے کی ہمیں حسرت ہی رہی، براہ کویت ہم ۱۳ ؍ اگست ۷۳ء کو عمّان پہونچ گئے، وہاں بھی ہم وزارت اوقاف کی میزبانی میں تھے۔

اردن کا بھی یہ میرا تیسرا دورہ تھا، یہاں اپنے قدیم دوستوں سے ملاقات کی، اور مشہور اداروں کو دیکھا، ۱۴ ؍ اگست ۷۳ء کو شاہ حسین سے ملاقات ہوئی، ۲۲ سال قبل ہم ان کے نامور دادا شاہ عبداللہ بن شریف حسین سے ملے تھے، غالباً شاہ حسین کو اس واقعہ کا علم تھا، انھوں نے اپنی خاندانی شرافت یا گذشتہ ملاقات و تعلق کے احترام

www.abulhasanalinadwi.org

میں بڑی تواضع اور انکساری کا مظاہرہ کیا، خود بڑھ کر دروازہ کھولا، اور معذرت کی کہ ہم اسی پوشاک میں مل رہے تھے جس میں وہ تھے، وہ رخصت کرنے کے لئے بھی کچھ دور آئے۔[۱]

ہم نے فلسطینی پناہ گزینوں کو بھی دیکھا جو افلاس و بدحالی کا شکار تھے، اور جرمن مشینری ان کو مدد پہونچاتے اور ان میں کام کرتے تھے، مرکز اسلامی کے ایک استقبالیہ جلسہ میں میں نے اپنے تمام تأثرات، اندیشوں اور خطرات اور سرحد کی اس پاسبان قوم سے توقعات کا صفائی سے اظہار کیا۔[۲]

میں نے کہا کہ آپ اسلام کے نازک ترین محاذ اور مسلمانوں کے آخری قلعہ اور آخری دفاعی لائن پر ہیں، سیلاب شہر کی فصیلوں تک پہونچ چکا ہے، اگر سیلاب فصیلوں کو پار کر گیا تو کوئی بند اس کو روک نہیں سکے گا، ان معصوم روحوں کے بارے میں خدا سے ڈریئے جنھوں نے ابھی عالم اجسام میں قدم نہیں رکھا، اگر آپ نے ان کی مقدس اور قابل احترام چیزوں کی حفاظت کی اور انھیں ایک تابناک ماضی عطا کیا، تو وہ آپ کی ممنون ہوں گی، اور اگر آپ نے ان مقامات مقدسہ کو کھودیا، اور ان کے لئے ذلت و رسوائی کا ترکہ چھوڑا تو وہ بارگاہِ خداوندی میں فریاد کریں گی۔

اردن میں مختلف مقامات اور شہروں میں تقریریں ہوئیں، جن میں سلط، اربد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اربد کے قریب ام القیس نامی بستی کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر ہم نے شام کے دریائے یرموک کو دیکھا، جہاں خلافت فاروقی میں مسلمانوں اور رومی لشکروں کے درمیان فیصلہ کن تاریخی جنگ ہوئی تھی، وہیں سے گولان کی پہاڑی بھی

---

[۱] اس ملاقات و گفتگو کی تفصیل "سفرنامہ" ص ۲۲۱-۲۲۴ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[۲] یہ تقریر تفصیل کے ساتھ "سفرنامہ" میں آئی ہے ص ۲۲۸-۲۳۸

www.abulhasanalinadwi.org

دیکھا جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے اور جس کی وجہ سے پورا شام اس کی توپوں کے دہانے کے نیچے اور اس کے رحم و کرم پر ہے، طبریہ نامی اسرائیلی شہر پر بھی بلندی سے نظر ڈالی، عمان کے قریب اس غار کو بھی جا کر دیکھا جس کے بارے میں آثار قدیمہ کے مشہور ماہر رفیق وفا دجانی کی تحقیق ہے کہ وہ اصحاب کہف کا غار ہے اور قرآن مجید کے بیان کئے ہوئے واقعہ کا تعلق اسی غار سے ہے[1] ایک اہم مذاکرہ میں بھی شرکت کی جس کا عنوان تھا" نوجوانوں کی بے چینی اور اس کا علاج"[2]۔

زندگی کا ایک پُراثر منظر

میری زندگی کا بڑا اہم واقعہ اور دل پر گہرا اثر ڈالنے والا منظر وہ تھا جو ۱۹ اگست ۷۳ء کو پیش آیا، ہمیں موقعہ دیا گیا کہ اس سعودی فوجی مرکز کا معائنہ کریں جو سرحد کی حفاظت کے لئے متعین ہے، اور ان فوجیوں سے خطاب بھی کریں، جب یہ مسلح نوجوان صف بستہ کھڑے ہوئے، اور انھوں نے اسلامی طریقہ کے مطابق ہم کو سلامی دی تو جسم میں عزم و ایمان اور سرخوشی اور سرشاری کی ایک لہر دوڑ گئی، اور طرب و اہتزاز کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی، آنکھوں میں آنسو آگئے، اور میں نے زبان ذہن کے بجائے زبان دل سے گفتگو کی۔

جنگ موتہ کے شہداء کے مزار پر

اس کے بعد کچھ وقت شہدائے موتہ کے مرقد پر گذارا، تاریخ کا مطالعہ کرنے والے

---

[1] تفصیل اور دلیل کے لئے ملاحظہ ہو "اکتشاف الکھف اہل الکھف"۔

[2] پوری تقریر سفر نامہ میں آئی ہے ص۲۵۱-۲۶۵ ، ملاحظہ ہو ص۲۶۷-۲۷۲

www.abulhasanalinadwi.org

جانتے ہیں کہ یہاں ۸ھ میں وہ غزوہ پیش آیا تھا جس میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار اور رومیوں اور عیسائیوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ تھی، حضرت زید بن حارثہ کی شہادت کے بعد جو مسلمانوں کے قائد تھے، ابن عم رسول حضرت جعفر طیار ؓ نے علم اٹھایا، داہنا ہاتھ کٹ کر گرا تو بائیں ہاتھ میں علم لے لیا، وہ بھی کٹ گیا تو دونوں بازوؤں سے اس کو تھام لیا، برابر لڑتے رہے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے، اس موقعہ پر آپ کو جعفر طیار ؓ اور ذوالجناحین کا لقب ملا، آپ کے بعد عبد اللہ بن رواحہ نے علم لیا، اور لڑتے رہے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے، ان کے بعد حضرت خالد بن ولید ؓ نے قیادت قبول کی اور اپنی حکمت عملی سے دشمن کو پسپا بھی کر دیا، اسلامی فوج کو بچا بھی لیا، ہم ان شہداء کے خواب گاہ پر خاموش سر جھکائے کھڑے رہے، اور ان جاں بازوں کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

موتہ سے ہم نے بترا کا رخ کیا، بترا قدیم تاریخی شہر ہے، جس کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے، یہ شہر بھی حجر اور مدائن صالح کی طرح پہاڑوں کے اندر کھود کر بنایا گیا تھا، اور عرب بنطیوں کا آباد کیا ہوا تھا، وہ اپنے زمانہ میں تجارت و بت پرستی کا مرکز تھا، بعض مورخین کا خیال تھا کہ حجاز کا مشہور بت "لات" یہیں سے لایا گیا تھا۔

۲۰ اگست ۱۹۷۳ء کو اس دورہ کا اختتام ہوا اور ہم ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے، اور کویت ایک شب ٹھہرتے ہوئے بخیر و عافیت بمبئی پہونچ گئے۔

خلیج کا ایک سفر

محرم ۱۳۹۴ھ (جنوری ۱۹۷۴ء) کو مکہ معظمہ سے واپسی پر جہاں رابطہ کے اجلاس میں

www.abulhasanalinadwi.org

شرکت کے لئے جانا ہوا تھا، حاکم شارقہ شیخ سلطان محمد بن القاسمی کی دعوت پر شارقہ دبئی، ابوظبی کا ایک مختصر سفر ہوا جس میں عزیز گرامی مولوی سعید الرحمٰن ندوی اور عزیز القدر محمد واضح حسنی ندوی ساتھ تھے، شارقہ میں ۵ محرم ۱۳۹۴ھ (۲۷ جنوری ۱۹۷۴ء) کو مسجد علی بن ابی طالبؓ میں تقریر ہوئی جس کا عنوان وہاں کی جغرافیائی نوعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے "خلیج بین الإسلام والمسلمین" رکھا گیا، اس میں بتایا گیا کہ جس طرح عرب ایران کے درمیان یہ خلیج ہے اور اس کی وجہ سے زمین کے دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے، اسی طرح یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج واقع ہوئی ہے، اسلامی تعلیمات کچھ کہتی ہیں، عقیدہ کا تقاضا کچھ ہے، منصب و ذمہ داری کے فرائض کچھ ہیں، اور مسلمان کی سیرت اور طرز عمل اور دنیا کے اسٹیج پر ان کا کردار کچھ ہے، میں نے اسی بُعد و انفصال کو جو بالکل مصنوعی اور غیر فطری ہے تفصیل سے بیان کیا، اور حقیقت اسلام اور مسلمانوں کو اصلی سیرت و کردار کی طرف واپسی کی دعوت دی، اور بتایا کہ اس غیر طبعی صورت حال کی وجہ سے خود مسلمانوں اور دنیا کو کیا نقصان پہونچ رہا ہے[1]۔

اس سفر میں دبئی کی پبلک لائبریری میں ۲۸ جنوری ۱۹۷۴ء کو ایک دوسری تقریر ہوئی جس میں عمائدین شہر، علماء فضلاء کی بڑی تعداد شریک تھی، تقریر کا عنوان تھا، "کیف دخل العرب التاریخ" عربوں نے کیسے عالمی اہمیت اختیار کی اور دنیا کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ اور مورخین کے قلموں کو اپنے کارناموں کو لکھنے میں مشغول

لے "خلیج بین الإسلام والمسلمین" شائع کردہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام"

www.abulhasanalinadwi.org

کردیا، اس کے حقیقی اسباب کیا تھے، اور اس مرکزیت و محبوبیت کا راز کیا تھا؟[1]

۱۹۷۶ء میں پھر خلیج کا سفر انہیں دونوں عزیزوں کی معیت میں ہوا، ابوظبی (جو عرب امارات کا دار الحکومت ہے) کے دیوان امیری میں ۲۳ ردسمبر ۱۹۷۶ء کو ایک تقریر ہوئی، اس کا عنوان تھا "ایک صاحبِ شعور مسلمان موجودہ تہذیبوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے"۔[2]

---

[1] رسالہ "کیف دخل العرب التاریخ" ملاحظہ ہو۔

[2] "نظرۃ مؤمن واع إلی المدنیات المعاصرۃ الخ"

www.abulhasanalinadwi.org

باب ہشتم

ندوۃ العلماء کا پچاسی ۸۵ سالہ جشن تعلیمی

ندوۃ العلماء کے ایک عالمی اجلاس کا خیال

ندوۃ العلماء کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں[1]، وہ جانتے ہیں کہ اس کے قیام کے بعد سے یہ معمول رہا کہ ہندوستان کے کسی مرکزی مقام پر اس کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا، یہ اجلاس اپنے نظم و شائستگی، سنجیدگی اور افادیت و مقصدیت میں مثالی اجلاس ہوتے تھے، جن کی نظیر اس دور میں کسی تحریک یا جماعت کے جلسوں میں مشکل سے نظر آتی ہے، ان میں ممتاز علماء، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مشاہیر ملک جمع ہوتے، بلند پایہ اور معیاری تقریریں ہوتیں، جلسہ کے انتظامات اور کارروائی کی ہر چیز سے مذاقِ سلیم اور تہذیب و شائستگی کا اظہار ہوتا، یہ جلسے بہت دنوں تک کے لئے خوشگوار یادیں اور ــــ روشن نقوش چھوڑ جاتے اور ندوۃ العلماء کے مقاصد کی تبلیغ و تشہیر کے ماسوا مسلمانوں کی دینی زندگی اور علمی ترقی میں ایک حرکت پیدا کر دیتے[2].

---

[1] الحمد للہ فروری ۱۹۸۴ء کو تاریخ ندوۃ العلماء دو جلدوں میں مرتب و طبع ہو کر ۲۵ رجمادی الاول ۱۴۰۴ھ ۲۸ فروری ۱۹۸۴ء کو ایک بڑے جلسہ میں جو کتب خانہ ندوۃ العلماء میں منعقد ہوا تھا پیش کر دی گئی۔

[2] ماخوذ از حیات عبدالحی ص ۱۹۵

www.abulhasanalinadwi.org

افسوس ہے کہ ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کے زور شور اور طوفان میں (جس میں کسی ٹھوس اور تعمیری چیز کے سننے کا مسلمانوں میں ذوق نہیں رہا تھا) ان سالانہ جلسوں کی روایت امرتسر کے جلسہ ۱۹۲۷ء پر ختم ہو گئی، اور ندوۃ العلماء کی تحریک ایک تعلیمی مرکز دارالعلوم اور اس کی مشغولیتوں میں محدود ہو کر رہ گئی، سیاسی مانسون جب اختتام کو پہونچا تو جلسوں کی روایت ایک داستان پارینہ بن کر رہ گئی تھی، نہ فضا سازگار معلوم ہوتی تھی، اور نہ کسی شہر اور جماعت کی طرف سے کسی گرم جوشانہ دعوت و تحریک کی نوبت آتی تھی۔

ادھر عالم عربی میں ندوۃ العلماء کے فضلاء کے دعوتی دوروں، ان کی تصنیفات کی وسیع اشاعت، عربی رسائل "البعث الاسلامی" اور "الرائد" کے اجرا اور ہندوستان کے مشرق وسطیٰ سے تازہ سیاسی، تعلیمی و ثقافتی روابط کے قائم ہو جانے سے اور زیادہ ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی کہ اسلامی ممالک کے ماہرین تعلیم، ممالک عربیہ کے فضلاء اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے کوشش کرنے والی تحریکات اور جماعتوں کے قائدین، ایک طرف ان اصلاحی و تجدیدی کوششوں و تجربوں سے واقف ہوں جو ہندوستان کی سرزمین پر انجام پائے، دوسری طرف علمائے ہند کے اس کارنامہ سے باخبر ہوں، جو انھوں نے ایک نئے ملک میں (جس کی اپنی تہذیب، مذاہب اور فلسفے تھے) اپنے ملی تشخص کی حفاظت اسلام کی تبلیغ و اشاعت نیز علوم اسلامیہ کے ذخیرہ میں اضافہ اور فکر اسلامی کی تجدید و احیاء کے میدان میں انجام دیا، تیسری طرف ندوۃ العلماء کے متوازن تعلیمی تخیل اور قدیم و جدید کی جامعیت کی کوشش سے (جس کو اس کے اہل قلم و اہل فکر الجمع بین القدیم الصالح والجدید النافع کے الفاظ سے ادا کرتے رہے ہیں)

www.abulhasanalinadwi.org

آگاہی حاصل کریں، اس کے لئے بھی ایک عالمی اجتماع کی ضرورت تھی، جس میں ممالک اسلامیہ بالخصوص بلاد عربیہ کے اہلِ نظر واہلِ فکر کو مدعو کیا جائے۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (جو بعد میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ ہوئے) کی دعوت پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جشن سیمیں (SILVER JUBILEE) دہلی میں منایا گیا، جس کا سلسلہ ۱۵ سے ۱۸ نومبر تک جاری رہا، اس کے اسٹیج پر عرصہ کے بعد لوگوں نے اتنی بڑی تعداد میں اور اتنی قد آور سیاسی، تعلیمی اور علمی وادبی شخصیتوں اور ایسے متضاد عناصر کو پہلو بہ پہلو بیٹھا ہوا دیکھا، میں بھی ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر اس اجلاس میں شریک ہوا تھا، اور میں نے اپنا مقالہ "عہد نبویؐ کا نظام تعلیم" پڑھا تھا، اس جلسہ میں میرے اندر یہ ارمان پیدا ہوا کہ ہندوستان کی دینی تعلیم کے نمائندوں کی طرف سے بھی ایک ایسا نمائندہ اور موثر جلسہ بلایا جائے جس میں علوم دینیہ کی ترقی اور اس کی تجاویز پر غور کیا جائے، ماضی کا جائزہ لیا جائے اور مستقبل کا نقشہ بنایا جائے اس کے لئے قدرتاً میرے سامنے ندوۃ العلماء ہی کا مرکز اور اسٹیج تھا، جس کا سجانا اور سنوارنا کسی قدر اپنے بس میں تھا، اور جو اس سے پہلے (کسی قدر محدود پیمانہ پر) اس مقصد کے لئے کام میں لایا جاتا تھا۔

ان دونوں محرکات کے علاوہ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ہندوستانی حکومت (جو سیکولر کردار رکھتی ہے) اور یہاں کی اکثریت اور مختلف فرقے یہ دیکھ لیں کہ مسلمان ایک عالمگیر برادری ہیں، جو ایک ملک میں محدود نہیں، انھوں نے ماضی اور حال میں ان ممالک سے جن کی زبان عربی ہے، اور جن کی تاریخ صدیوں سے علم دین کی خدمت و ترقی کی تاریخ رہی ہے، صرف لینے کا کام نہیں کیا ہے، دینے کا بھی کام کیا ہے، اور فکر اسلامی کو تازہ کار

www.abulhasanalinadwi.org

بنانے میں انھوں نے بعض اوقات قائدانہ کردار ادا کیا ہے، یہاں کے ادارے (عربی مدارس) اور ان کے فضلاء اور سربراہ ان ممالک اسلامیہ عربیہ میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور ان کو ان علمی مجلسوں کی آخری صفوں میں نہیں بلکہ اولین صفوں میں اور نشستوں پر جگہ دی جاتی ہے، اس کے جاننے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان حقائق کے سامنے آنے کے بعد ملک کے ذمہ داران دینی تعلیمی مرکزوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ان کے اس وزن اہمیت اور روابط کا بھی خیال رکھیں گے، جو ان کے ان ممالک کے ساتھ (جن سے ہندوستان کے سیاسی اور بعض اوقات اقتصادی مفادات بھی وابستہ ہوتے ہیں) قائم ہیں، اور جن کی ایک آواز پر ممالک اسلامیہ عربیہ کے اتنے چیدہ اور برگزیدہ افراد اور حکومتوں اور جامعات کے مؤقر نمائندے جمع ہو سکتے ہیں، جو اکثر اوقات حکومتوں کی دعوت پر بھی (جو ہر طرح کی سہولتیں اور انتظامات پر قدرت رکھتی ہیں) جمع نہیں ہوتے ان مقاصد، فوائد کی بناء پر یہ اجتماع صرف ایک معیّن ادارہ کے مفاد ہی میں نہیں تھا، پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کے مفاد میں تھا، اور اس سے اس میں خود شناسی وخود اعتمادی پیدا ہونے کی بھی امید تھی جس کی تقسیم ملک کے بعد خاص طور پر ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

تحریک کا آغاز

اس عالمی اجتماع کا تقاضا تو ندوۃ العلماء کے کارکنوں کے دل ودماغ پر کئی سال سے تھا، اور ۱۹۶۳ء سے یہ بات زبان وقلم پر آنے لگی تھی، لیکن بات اس سے زیادہ آگے نہ بڑھی، اصلاً اس کا فیصلہ ندوۃ العلماء کے جلسۂ انتظامی منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء

www.abulhasanalinadwi.org

میں ہوا، جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی صدارت میں خاتون منزل واقع گولہ گنج لکھنؤ کی اسی عمارت میں ہوا جس میں دارالعلوم کا ابتدائی وجود عمل میں آیا تھا، اور جس میں اس کے نامورترین فضلاء (مولانا سید سلیمان ندویؒ وغیرہ) نے تعلیم حاصل کی تھی، اس جلسہ میں طے پایا کہ اس پچاسی سالہ جشن تعلیمی کا انعقاد ماہ نومبر ۱۹۷۵ء میں کیا جائے، ساتھ ہی میری تحریک پر یہ بھی منظور کیا گیا کہ اجلاس کے انتظامات کی عملی ذمہ داری مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی کے سپرد کی جائے، جو فضلائے ندوہ میں اپنی انتظامی صلاحیت، مستعدی اور بیدار مغزی میں امتیاز خاص رکھتے ہیں، اسی کے ساتھ دارالعلوم کی عمارت میں اس کے لئے ایک دفتر قائم کر دیا گیا۔

ایک مشکل مسئلہ صدارت کا تھا، اتنے اہم اجلاس، ندوۃ العلماء کے مقام، اور اس کی دعوت، ہندوستانی مسلمانوں بالخصوص علماء کے مزاج و معیار اور ہندوستان کی نزاکتوں کو دیکھتے ہوئے کوئی موزوں شخصیت نظر نہیں آتی تھی، کسی میں علمی بلندی محسوس ہوتی تھی (جو ایسے اہم اجلاس کے لئے ضروری ہے) تو اس شرعی صورت کا فقدان اور اسلامی شعائر کی کمی (جس کے دیکھنے کے ہندوستانی مسلمان خاص طور پر یہاں کا دینی طبقہ عادی ہے) کھٹکتی تھی، ممالک اسلامیہ کے سربرآوردہ شخصیتوں پر نظر ڈالی گئی، بعض لوگ ان شرطوں پر پورے اترتے تھے، لیکن ان کے ساتھ ایک سیاسی تاریخ وابستہ تھی، جو ان کے ہندوستان آنے میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔

اچانک حج کے موقعہ پر رابطہ عالم اسلامی کی منیٰ والی عمارت میں جامع ازہر کے شیخ الاستاذ الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود پر نظر پڑی اور ان سے ملاقات اور صحبتیں رہیں، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے جو اس موقعہ پر موجود تھے، اشارہ کیا کہ صدارت کا مسئلہ

www.abulhasanalinadwi.org

حل ہوگیا، شیخ الازہر ہر طرح سے اس اجلاس کی صدارت کے لئے موزوں ہیں، صورتاً وہ ہندوستان کے مقتدر علماء کے صف میں بیٹھنے کے قابل ہیں، سیرتاً صالح، صوفی المذاق، اور عالم باعمل ہیں، علم فضل کے لحاظ سے نہ صرف وہ عالم اسلام کی سب سے بڑی دینی دانشگاہ جامع ازہر کے شیخ ہیں بلکہ صاحب تصنیف و تحقیق عالم بھی ہیں، فندق شبرا میں میں نے ان کو یہ دعوت پیش کی، انھوں نے اس کو منظور فرمایا، اور مشورہ دیا کہ اس سلسلہ میں ان کی حکومت (مصر) سے رابطہ قائم کیا جائے۔

۱۹۷۴ء ہی میں ناظم ندوۃ العلماء نے اس اجلاس کی سب سے پہلی دعوت رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ محمد صالح قزاز کی خدمت میں پیش کی جن کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے حرم مکی اور مسجد نبوی کی تعمیر و توسیع کا وہ عظیم الشان زندۂ جاوید کام انجام دیا اور وہ سعادت حاصل کی جو بڑے بلند طالع و خوش نصیب مسلمان ہی کے حصہ میں آسکتی ہے، انھوں نے دعوت قبول کی اور وعدہ کیا کہ رابطہ کا ایک وفد اس کے لئے بھیجا جائے گا، اس وفد میں جو ان سے گفتگو کر رہا تھا، راقم سطور، عزیز گرامی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، عزیز القدر محمد الحسنی شامل تھے، یہ گفتگو حرم شریف سے متصل دفتر تعمیرات میں ہوئی جہاں طواف وسعی کی، آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں، اور حرم شریف کا دل فریب اور ایمان افروز منظر سامنے تھا۔ "وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ"

اسی سال رابطہ کے اجلاس میں عراق کے مشہور داعی و مجاہد شیخ محمد محمود الصواف نے اس اجلاس کی بڑی قوت کے ساتھ وکالت کی اور انھیں سے شرکاء اجلاس کو اس کی اطلاع ملی۔

www.abulhasanalinadwi.org

پچاسی سالہ جشن تعلیمی کی تاریخیں ۳۱ر اکتوبر تا ۲ر نومبر ۱۹۷۵ء طے ہوئی تھیں، جس وقت ان تاریخوں کا تعیّن ہوا تھا، اس وقت یہ خیال نہیں تھا کہ ملک میں ایمرجنسی لگ جائے گی، اور صورت حال یکسر بدل جائے گی، جون ۱۹۷۵ء میں اچانک ایمرجنسی کا نفاذ ہوا، لیکن اجلاس کا اعلان اتنے وسیع پیمانہ پر ہو چکا تھا اور لوگوں میں اس کا ایسا اشتیاق و انتظار پیدا ہو چکا تھا کہ اس کا التواء مناسب نہیں معلوم ہوا، بیرونی ممالک بالخصوص ممالک عربیہ کے فضلاء، ماہرین تعلیم، جامعات کے ذمہ داروں اور اہلِ فکر واہلِ قلم کو اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی جا چکی تھی، عرب حکومتوں، جامعات اور اداروں سے بھی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔

چند آزمائشی مرحلے

۱۔ بیرونی ممالک سے مہمانوں کے آنے کا انحصار ہندوستانی سفارت خانہ سے ویزے کے حصول پر منحصر ہے اور اس اندیشہ کے معقول وجوہ موجود تھے کہ ایمرجنسی اور اس سے پیدا ہونے والی غیر معمولی صورت حال کی بناء پر حکومت ہند کو اتنی بڑی تعداد میں ایسے مؤقر مہمانوں کی آمد کی اجازت دینے میں پس و پیش ہو، جن کو آنے کے بعد اظہار خیال اور اپنے ملک واپس جانے کے بعد اظہار تاثرات سے روکا نہیں جا سکتا، اس اندیشہ کو اس سے اور تقویت ملی کہ دعوت نامے بھیجنے کے عرصہ بعد تک دعوت کے قبول کرنے اور شرکت کی آمادگی کی اطلاع نہیں ملی، اسی عرصہ میں دہلی کے ایک ایسے ادارہ کے ایک ذمہ دار دارالعلوم آئے جو اس قسم کی مجالس اور تقریبات کرتے رہتے تھے، اور انھوں نے دارالعلوم کے بعض ذمہ داروں سے کہا کہ آپ لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہیں،

www.abulhasanalinadwi.org

میں نے عرب ملکوں کے سفارت خانوں میں جا کر پوچھا کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں آپ کے یہاں کے مندوبین آرہے ہیں تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم کو اپنے ملک سے اس قسم کی کوئی اطلاع نہیں ملی، انھوں نے کہا کہ اس کا امکان ہے کہ حکومت ہند کی وزارت خارجہ کی طرف سے لال جھنڈی دکھا دی گئی ہو، اور اس کا اشارہ دے دیا گیا ہو کہ یہاں آنے کے خواہش مندوں کو (ایمرجنسی کی وجہ سے) ویزے نہ دیئے جائیں، یہ روایت "درایتاً" بھی قابل یقین تھی اور پھر ؎

عشق است وہزار بدگمانی

ہم لوگوں کو بڑی فکر ہوئی کہ اگر باہر سے مہمان معتد بہ تعداد میں نہ آئے تو بڑی سُبکی اور بے اعتمادی ہوگی، اور تقریب بالکل پھیکی رہ جائے گی، اس پریشانی میں میں نے ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کو جو اجلاس کے انتظامات کے لئے آئے ہوئے تھے، مخفی طریقہ پر دہلی بھیجا، اور ان سے کہا کہ آپ وزارت خارجہ کے کسی ذمہ دار سے مل کر اس کا اندازہ لگائیں کہ کیا اس قسم کی کوئی ہدایت ہندوستانی سفارت خانوں کو بھیجی گئی ہے؟ میں نے ان کو تاکید کی کہ وہ مجھ کو ذاتی طور پر ٹیلی فون پر بلائیں، اگر اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے تو کہیں کہ مریض کا حال اچھا ہے، اور اگر ہے تو کہیں کہ مریض کا حال اچھا نہیں ہے، ان کے جانے کے بعد بے چینی سے ان کے جواب کا انتظار رہا، عصر بعد ان کا ٹیلی فون آیا، انھوں نے کہا کہ مریض کا حال اچھا ہے، ہم نے خدا کا شکر ادا کیا، اور اس کی طرف سے قدرے اطمینان ہوا۔

۲۔ دوسرا آزمائشی مرحلہ یہ تھا کہ ایک ایسے عالمی اجتماع میں جس میں متعدد سربراہانِ مملکت کے پیغامات پڑھ کر سنائے جائیں گے، اور ان کی نمائندگی کرنے والے بھی

www.abulhasanalinadwi.org

اجلاس میں شریک ہوں گے، کثیر التعداد مسلم و عرب ممالک کی ممتاز شخصیتیں اور بعض وزراء بھی شرکت کریں گے، اپنے ملک و بیرونی ممالک کا پریس اجلاس کی کارروائی کی نشر واشاعت میں اور اجلاس میں پیش کیے جانے والے خیالات و جذبات کی نقل و روایت میں سرگرمی سے حصہ لے گا، صدر مملکت (جو اتفاق سے اس وقت مسلمان اور باوقار شخصیت کے مالک بھی تھے[۱]) کو اجلاس کے افتتاح کی دعوت نہ دینا ایک حقیقت و ضرورت کو نظر انداز کرنے کے مرادف اور اجلاس و منتظمین کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہوگا، جو خاص طور پر اس ایمرجنسی کے زمانہ میں عمیق اور دوررس نتائج کا حامل ہوگا۔

دوسری طرف دقت یہ تھی کہ صدر جمہوریہ کے آنے پر ان سب آداب و روایات اور ضوابط (PROTOCOL) کی پابندی ضروری ہوگی، جو صدر کی آمد کے موقعہ پر ضروری ہے اس موقعہ پر ہندوستان کا قومی ترانہ "جن من گن" بھی گایا جائے گا، جس کے لئے نمائندگان حرم، علمائے عرب اور ان سب حضرات کو کھڑا ہونا پڑے گا جو مجالس میلاد میں بھی قیام کے قائل نہیں ہیں، ان وجوہ و مضمرات کی بناء پر صدر محترم کی شخصیت کے احترام اور اپنے ملک کی محبت و عزت کے باوجود جو ہم سب کے دلوں میں تھی، ذمہ داروں کی خواہش ہوئی کہ کسی بدنمائی و بدگمانی کے بغیر وہ اس مشکل سے بچ جائیں، اس بارے میں اجلاس کی تاریخوں کے قرب اور صدر محترم کی نیک نفسی نے مدد کی جن کا پروگرام ہفتوں مہینوں پہلے بن جایا کرتا ہے، اور حکومت ہند اس کے لئے خاص انتظامات کرتی ہے، صدر محترم نے اپنا پیغام بھیجنے پر اکتفا کی جس کو اجلاس میں جناب یونس سلیم صاحب (نائب وزیر ریلوے و اوقاف) نے

---

[۱] اس وقت جناب فخر الدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ تھے جن کا ہندوستان کے دینی حلقہ سے رابطہ بھی تھا، اور وہ علماء کا احترام کرتے تھے، اور خود ناظم ندوۃ العلماء کو بھی ان سے ذاتی تعارف حاصل تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

پڑھ کر سنایا، اور بات خوش اسلوبی کے ساتھ نبھ گئی۔

۳۔ منتظمین کے لئے تیسری آزمائش یہ بھی کہ ندوۃ العلماء کے ذمہ دار اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ اس اجلاس پر کسی قسم کی سرکاری چھاپ نہ لگنے پائے، اور عوام کو اس بدگمانی کا موقعہ نہ ملے کہ اس میں مرکزی حکومت یا صوبہ کی حکومت کی امداد و اعانت شامل ہے، اور ان کو اس کے انعقاد سے خاص دلچسپی وہمدردی ہے۔

اس مسئلہ میں مزید نزاکت اور دشواری اس وجہ سے اور پیدا ہوگئی تھی کہ اس زمانہ میں اترپردیش کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا جی تھے، انھوں نے اپنے اخلاق اور وسیع النظری سے ندوۃ العلماء کے کارکنوں بالخصوص ناظم ندوۃ العلماء سے دوستانہ تعلقات قائم کرلئے تھے، وہ کئی بار بطور خود دار العلوم آئے تھے، اور ان کی کوششوں سے دار العلوم کو وہ زمین بھی (بقیمت) مل گئی تھی، جس کے حصول کی برسوں سے کوشش کی جارہی تھی، اور ناکام رہی تھی[1]، انھوں نے ایک سال صوبہ کے بجٹ میں ندوۃ العلماء کے لئے ایک لاکھ کی امدادی رقم کا اعلان بھی کیا تھا جس کو قبول کرنے سے ناظم ندوۃ العلماء نے ایک فوری خط کے ذریعہ معذرت کردی تھی، انھوں نے اس اجلاس کے سلسلہ میں حکومت یو۔پی کی طرف سے ہر طرح کے تعاون کی پیش کش کی، اور اس پر اصرار کیا کہ حکومت ہند کے ضابطہ کے ماتحت بیرونی ممالک کے معزز مہمان، خاص طور پر وزراء اور اعلیٰ عہدہ دار حکومت کے مہمان ہوں گے، لیکن سوائے ندوۃ العلماء آنے والی سڑک کی درستگی اور پانی کے انتظام کے (جو حکومت ہی کے کرنے کے کام ہیں) ہر پیش کش کے قبول کرنے سے معذرت کی گئی، اتفاق سے اس زمانہ میں حکومت یو۔پی کے چیف سکریٹری بھی

---

[1] یہ وہ زمین ہے جس پر اب رواق اطہر کی سہ منزلہ شاندار عمارت طلبہ کا ہوسٹل ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مسلمان تھے[1]، اکثر یہ پیغامات انھیں کے ذریعہ آتے تھے، آخر میں بہوگنا صاحب نے اس پر اصرار کیا کہ حمل و نقل کے ذرائع اور سواریوں کی سہولت مہیا کرنے کی اجازت دی جائے کہ اتنی کاروں اور بسوں کا انتظام جو مہمانوں کو ہوائی اڈہ سے ہوٹل تک اور ہوٹل سے اجلاس تک لانے کا کام کریں، ایک قومی ادارہ کے لئے مشکل ہے، انھوں نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ حکومت جو سواریاں مہیا کرے گی ان پر کوئی سرکاری نشان (FLAGS) وغیرہ نہیں ہوں گے، اس سے بھی یہ کہہ کر معذرت کر دی گئی کہ ہمارے ان احباب نے جو ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے مالک ہیں، اور جن کے پاس اپنی گاڑیاں ہیں اس پر اصرار کیا ہے کہ اس موقعہ پر ان کو خدمت کا موقعہ دیا جائے[2]، اگر ہم حکومت کی پیش کش کو منظور کرتے ہیں تو یہ ان کے خلوص اور جذبۂ خدمت کی ناقدری ہوگی، اور یہ مناسب نہیں، ذہین و فہیم وزیر اعلیٰ یہ سن کر خاموش ہوگئے لیکن سڑک کی درستی اور صفائی، روشنی کا انتظام اور آب رسانی میں انھوں نے کوئی کمی نہیں کی، وہ اپنے کابینہ کے بعض دوسرے رفقاء کے ساتھ مختلف وقتوں میں معائنہ کے لئے آتے رہے، اور اجلاس میں بھی شرکت کے لئے سب سے پہلے پہونچے، اس سب سے بڑھ کر (یہ جیسا کہ بعد میں آئے گا) انھوں نے تمام مہمانوں کے لئے اپنی طرف سے ضیافت کا سامان کیا، اور رات کے کھانے پر جس کا وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا گیا تھا سب کو مدعو کیا۔

۴۔ ایک آزمائشی مرحلہ یہ پیش آیا کہ اجلاس کی صدارت کے لئے شیخ الازہر کے نام کا سارے ہندوستان میں چرچا ہو گیا تھا، اور یہ بات یقینی سمجھی جاتی تھی لیکن ابھی تک منتظمین کے

---

[1] محمود بٹ صاحب اس وقت حکومت اتر پردیش کے چیف سکریٹری تھے۔

[2] اس خدمت و انتظام میں ہمارے مخلص دوست شاہد علی صدیقی صاحب مرحوم مالک یونیورسل ٹرانسپورٹ پیش پیش تھے، جزاہ اللہ خیراً۔

www.abulhasanalinadwi.org

پاس ان کی طرف سے یا حکومت مصر کی طرف سے آنے کی متعیّن اطلاع نہیں آئی تھی، جس سے معلوم ہو کہ وہ کس دن اور کس وقت پہونچ رہے ہیں، یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز واقعہ ہے کہ میں ذاتی طور پر سخت کشمکش اور اضطراب میں تھا کہ میں نے ہی ان کو دعوت دی، اور میرے ہی ذریعہ اس کی شہرت ہوئی تھی، اب اجلاس کو صرف ایک ہفتہ باقی تھا جمعہ کا دن تھا[1]، اور میں ایک علیحدہ گوشہ میں بیٹھا ہوا اجلاس کے لئے لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا تھا، میں نے عبدالرزاق صاحب رائے بریلوی سے جو کہ میرے ساتھ رہتے ہیں کہا کہ فلاں وقت میں آؤں گا، غسل کرنے کے بعد ٹیلہ کی مسجد جانا ہے رکشہ کا انتظام رہے، میرا معمول تھا کہ ان دنوں میں اکثر ٹیلہ کی مسجد چلا جاتا جہاں تنہائی اور خاموشی ہوتی، وہاں اجلاس کی کامیابی کے لئے صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتا اور دعا کرتا، میں وقت مقررہ پر باہر آیا تو عزیزی محمد رابع سلمہ، نے مجھے بتایا کہ شیخ الازہر کا تار آیا ہے کہ وہ اگلی جمعرات کو صبح کی فلائٹ سے لکھنؤ پہونچ رہے ہیں، اس وقت معًا یہ خیال آیا کہ اب ٹیلہ کی مسجد جانا ملتوی کیا جائے کہ مقصد حاصل ہو گیا، پھر شرم آئی میں نے کہا کہ رکشا منگواؤ مسجد جائیں گے، اور دعا کریں گے، میرا خیال ہے کہ شاید اللہ کو یہ بات ناپسند ہوتی کہ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد نماز و دعا کی ضرورت نہیں سمجھی "وَلِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔"

۵۔ میرے لئے ایک ذاتی آزمائش یہ تھی کہ میری نظر اس وقت اتنی کمزور تھی کہ میں بہت ہی قریب کی چیزوں کو دیکھ سکتا تھا، مختلف الحیثیت مہمانوں کا استقبال، ان سے حسب مراتب مخاطب ہونا اور توجہ کرنا، ہوائی اڈہ پر ان کا استقبال، اجلاس کی جگہ تک پہونچنا، اور صورت حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر سمجھنا، سب مشکل ہو رہا تھا، لیکن اللہ تعالےٰ کی کارسازی کہ یہ سب

---

[1] اگلے دن جمعہ ۳۱ اکتوبر سے اجلاس شروع ہو رہا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

منزلیں آسان ہوگئیں، عزیزوں نے اس سلسلہ میں پوری رفاقت کی، اور کوئی نامناسب شرمندہ کرنے والی بات پیش نہیں آئی۔

حقیقی تیاریاں اور انتظامات

اجلاس کے سلسلہ میں ہر طرح کے انتظامات ہو رہے تھے، اہل شہر سے رابطہ قائم تھا، دارالعلوم کے وسیع احاطہ اور عمارتوں کی صفائی و آراستگی، چمن بندی، پنڈال اور اسٹیج کی تیاری اور سجاوٹ، یہ سب کام بڑی مستعدی اور سرگرمی سے انجام پا رہے تھے، اس کے لئے مولوی شبیر ندوی سلطانپوری جن کو ان کاموں کا تجربہ اور سلیقہ ہے، جامعہ ملیہ سے اسی غرض کے لئے آئے ہوئے تھے، مولانا عمران خاں صاحب ندوی کی تربیت یافتہ رفقاء کی ٹیم بھوپال سے آئی ہوئی تھی، اور وہ سب دن رات منہمک تھے۔

معزز بیرونی مہمانوں کے لئے کلارک ہوٹل میں قیام کا انتظام تھا، جو بلند پیمانہ کا تھری اسٹار (THREE STAR) ہوٹل ہونے کے علاوہ دارالعلوم سے بہت قریب ہے، ہوٹل کے ذمہ داروں اور عملے نے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ وزیر اعلیٰ صاحب کو خاص دلچسپی ہے، مزید مستعدی اور تعاون کا اظہار کیا، محبی اقتدار علی خانصاحب انجینیر اور محترمی سید اطہر حسین صاحب آئی، اے، ایس نے بھی خاص طور پر اس کی فکر رکھی، گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس، گلمرگ امین آباد، اور دارالعلوم کے مدرسہ ثانویہ میں بھی مختلف طبقوں کے مہمانوں کے قیام کا انتظام تھا، نئی حاصل شدہ زمین پر بھی ابنائے قدیم کے لئے شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔

لیکن حقیقی تیاری دعاؤں اور معتکفین کی ایک جماعت کا انتخاب تھا، جو اجلاس کی آخری ساعت تک اجلاس کی کامیابی اور مقاصد کے حصول کے لئے دعا اور ذکر میں مشغول رہے،

www.abulhasanalinadwi.org

یہ نظام مولانا انعام الحسن صاحب امیر جماعت تبلیغ کی ہدایت و مشورہ، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کے ایماء پر بنایا گیا تھا کہ "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ" اس کے لئے لکھنؤ رائے بریلی کے ان احباب کا انتخاب کیا گیا تھا، جن کا صلاح، ذوق عبادت معلوم تھا، اجلاس کے پورے دنوں میں پوری فضا پر جو سکینت چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور جس کا احساس کم وبیش سب کو تھا وہ غالباً اسی دعا و ذکر کا نتیجہ تھا، مولانا انعام الحسن صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بغیر میرے کہے بچیوں نے اجلاس کی کامیابی کے لئے ختم کا اہتمام کیا، ہمارے گھر تکیہ پر بھی ختم و دعا کا برابر اہتمام رہا، اس سب سے بڑھ کر حضرت شیخ الحدیث ہمہ تن اس اجلاس کی کامیابی اور قبولیت کے لئے دعا کی طرف متوجہ تھے لکھنؤ سے جو جاتا اس سے سب سے پہلے اجلاس کا حال پوچھتے اور بعض مرتبہ سوتے میں اجلاس کا تذکرہ کرتے اور ہدایات دیتے سنا گیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ اجلاس کی عام طور پر عربی میں کارروائی ہوتی اور طویل عربی کی تقریریں ہوتیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہوتا "کأنّ علی رؤسھم الطیر" (گویا سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں، ذرا سی حرکت سے اڑ جائیں گی) بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کہ جو اس جلسہ میں موجود تھے، لوگ ایسی یکسوئی و خاموشی کے ساتھ یہ عربی تقریریں سن رہے تھے جیسے جمعہ کا خطبہ سنتے ہیں، اجلاس سے واپس جا کر رابطہ عالم اسلامی کے شعبۂ صحافت کے نگراں و مہتمم استاذ محمد الحافظ نے اجلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سامعین کرسیوں پر ایسے بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے "کأنّھم سمّروا بالمسامیر" (گویا وہ کیلوں سے جڑ دیئے گئے ہیں) بعض معزز لوگوں کو دیکھا گیا کہ جب ان کو سگریٹ پینے کی ضرورت پیش آئی اور شدید تقاضا ہوا تو وہ اس تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے اس طرح اجلاس سے باہر گئے جیسے مسجد سے باہر جاتے ہیں، کسی نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ایسے اجلاس میں

www.abulhasanalinadwi.org

سگریٹ پینا بے ادبی ہے۔

مہمانوں کی آمد

معزز اور ممتاز مہمانوں کا پہلا قافلہ پنجشنبہ کی صبح ۳۰ر اکتوبر کو شیخ الازہر الاستاذ الاکبر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی قیادت میں پہونچا جن کے ساتھ مصر کے وزیر اوقاف، سکریٹری جنرل "مجمع البحوث الاسلامیۃ" اور رابطہ کا پورا وفد، متعدد نامور مصری علماء اور بعض اہم ہندوستانی مہمان تھے، اس سے پہلے بحرین کا وفد رشتنیہ اور الجزائر اور یوگنڈا کے وفود چہارشنبہ کو پہونچ چکے تھے، لکھنؤ میں اس دن عید کا منظر نظر آتا تھا، ایسی خوشی مجھے اپنی عمر میں اس شہر میں اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی[1] تیس[3] بسوں کا طویل کارواں شہر کے مختلف حصوں سے لکھنؤ کے مسلمانوں کو لے کر ہوائی اڈہ پر پہونچا تھا، پرائیوٹ گاڑیاں، کاریں، موٹر، ٹرک اس کے علاوہ تھے، استقبال کرنے والوں کا مجمع پولیس کا گھیرا توڑ کر آگے بڑھ گیا، فضا نعرۂ تکبیر سے گونج رہی تھی، جمعہ کی صبح کو مزید وفود آئے اور متوقع مہمانوں کی تعداد تقریباً مکمل ہوگئی، اہل شہر نے جابجا پھاٹک نصب کئے تھے، اور دارالعلوم آنے والی سڑک پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجدد الف ثانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام کے گیٹ تھے۔

اجلاس

جلسہ گاہ میں دس ہزار کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا، اسٹیج پر بھی معزز مہمانوں

---

[1] ان مناظر و تفصیلات کے لئے "روداد چمن" کا مضمون ملاحظہ ہو جس کا عنوان ہے "دن گنے جاتے تھے جس دن کے لئے" صفحہ ۶۸ — ۷۰

www.abulhasanalinadwi.org

کے لئے کرسیوں کی بڑی تعداد تھی، پریس کے لئے مخصوص نشست گاہ تھی، مندوبین کے آنے کے لئے جو پہلا گیٹ تھا وہ اتحاد اسلامی کے داعی ــ ملک فیصل شہید کے نام سے موسوم تھا۔[1]

اجلاس کا نقشہ "روداد چمن" کے ادیب مصنّف نے اس طرح کھینچا ہے :۔

"اس تختی برّ اعظم کی تاریخ میں شاید پہلا موقعہ تھا جب علم و فضل اور جمال و کمال کی یہ کہکشاں یہاں دیکھی گئی، تنہا جامعات اسلامیہ کے نمائندے، ان کے سربراہ اور ذمہ دار آج جس طرح شانہ بشانہ اور قطار اندر قطار یہاں نظر آرہے تھے، اور دل فریب منظر پیش کر رہے تھے، وہ تاریخ کی ایک ایسی امانت ہے، جس کو کوئی مؤرخ اور وقائع نگار نظر انداز نہیں کرسکتا، ایسا معلوم ہوتا تھا، یہ ڈائس نہیں عالمِ اسلام کا حسین و جمیل گلدستہ ہے، جس میں اس کے وسیع قلم رو سے ہر رنگ کے پھول اکٹھا کر کے بہت خوبصورتی اور خوش ذوقی کے ساتھ سجا دیئے گئے ہیں۔"[2]

اس اجلاس میں ممالک عربیہ کے فاضل نمائندوں کی تعداد چھپن[56] تھی، جو اس سے پہلے کسی سرکاری و غیر سرکاری تقریب میں دیکھنے میں نہیں آئی (ان میں ان ناموں کو خارج کر دیا گیا ہے، جو اصلاً ہندوستانی وطنیت رکھتے تھے) ممالک عربیہ کے علاوہ یوگنڈا، روس ایران، تھائی لینڈ، نیپال، مشرقی افریقہ اور بنگلہ دیش کے نمائندے اور وہاں سے آنے والے مہمان بھی تھے، مہمان اپنی کیفیت (مرتبہ) کے لحاظ سے اپنی کمیّت (تعداد) پر فوقیت رکھتے تھے، جن میں متعدد عالم عربی اور عالم اسلامی کی چیدہ و برگزیدہ شخصیتیں تھیں،[3]

---

[1] ملک مرحوم کی شہادت اجلاس سے چھ ماہ پیشتر ربیع الاول ۱۳۹۵ھ۔ اپریل ۱۹۷۵ء کو پیش آئی تھی، جو عالم اسلام کا بڑا سانحہ تھا۔ [2] ملاحظہ ہو روداد چمن ص ۷۹-۸۰ [3] مفصل فہرست ملاحظہ ہو "روداد چمن" ص ۸۳-۸۸

www.abulhasanalinadwi.org

ہندوستان کی ممتاز شخصیتیں، رہنما علمائے دین، اہل فکر و نظر اور مؤقر و مستند دینی اداروں، مدارس عربیہ اور جامعات (یونیورسٹیز) کے سربراہ الگ تھے[1]

خطبۂ استقبالیہ

اس اجلاس کا خطبۂ استقبالیہ مصنف نے اصلاً عربی زبان میں تیار کیا تھا، (جو اجلاس کی سرکاری زبان قرار پائی تھی) اس کا ترجمہ محمد میاں مصنف "روداد چمن" نے ایسا رواں اور شگفتہ کیا تھا کہ اس میں ترجمہ کی شان کہیں نظر نہیں آتی تھی، استقبالیہ خطبوں کے روایتی انداز اسلوب سے ہٹ کر یہ خطبہ ایک تاریخی مطالعۂ ہندوستان کے اسلامی دور کے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں ایک علمی جائزہ و تجزیہ اور دعوت فکر و عمل کی حیثیت رکھتا تھا، اس کی بڑی خصوصیت (جو محض توفیق الٰہی کا نتیجہ تھی) یہ تھی کہ اس میں معزز ترین عرب مہمانوں اور عالم اسلام کے اہل فکر کو ایک ایسے داعی کی بلند سطح سے خطاب کیا گیا تھا، جو ان کی سیاسی، اقتصادی حیثیت ان کے وسیع مالی وسائل سے بے نیاز ہو کر اور ان سے بالکل صرف نظر کر کے ان سے خطاب کر رہا ہے، اور ان سے فائدہ اٹھانے اور رہنمائی حاصل کرنے سے زیادہ ان کی خدمت کرنے، ان کے جذبۂ اسلامی اور غیرت ملی کو بیدار کرنے اور ان کو ہندوستانی مسلمانوں کے تجربے، دینی غیرت اور اس ملت کے مصلحین و مجددین کی بصیرت و للّٰہیت سے فائدہ پہونچانے اور ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کا خواہش مند ہے، اس کے ثبوت کے لئے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"اگر اجازت دی جائے تو میں بڑے ادب کے ساتھ ایک بات اور عرض کروں گا،

---

[1] ملاحظہ ہو "روداد چمن" ص۸۸-۹۲

www.abulhasanalinadwi.org

وہ یہ کہ ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں، وہ اسلام کے اولین و حقیقی سرچشموں کتاب و سنت اور اسلام کے اولین علمبرداروں کی سیرت و کردار، ان کی قربانی و ایثار اور ان کی اولوالعزمی و حوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں، انھوں نے اپنا عقیدہ وایمان، اپنا حال و مآل، اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے، مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ابھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کرکے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں ہیں، نہ انھوں نے ان میں سے کسی کی اسلام کے ساتھ وفاشعاری کو اپنی وفاشعاری کی شرط قرار دی ہے، انھوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم (عرب ہو یا عجم) اس سے بے تعلقی یا رُوگردانی اختیار کرے، اگر عرب یا دوسرے ممالک کے مسلمان اپنی پرانی تہذیبوں اور قدیم فلسفوں کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اور ان کا دم بھرنے لگتے ہیں، تو ہم انشاء اللہ وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلکِ زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر اپنی اس اصول پسندی اور وفاشعاری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، ہمیں بہت سے ان منافع و مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی، جو ہوا کے رخ پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اکرم سے

www.abulhasanalinadwi.org

راضی ہے اور ہم خلوص و فہم کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم ہیں تو ہمارے لئے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں محرومی نہیں لکھی ہے اس لئے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات ارادۂ الٰہی کے تابع ہے اور اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا، ہمارا مسلک اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ؎

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت! ہزار میخانے

حضرات! ان سب وجوہ کی بناء پر شاید اس سرزمین کو بہت سے دوسرے اسلامی ملکوں سے اس کا زیادہ حق ہے کہ اس کو ایسے مایۂ ناز اور منتخب روزگار علماء، ارباب فکر و نظر، ماہرین تعلیم اور اساتذہ و مصلحین کی میزبانی کا شرف حاصل ہو، اور وہ خود یہاں تشریف لاکر اپنی آنکھوں سے ان کوششوں کے نتائج کو دیکھ سکیں، جو ایک بے سروسامان اور بے نوا ملت نے اپنے دین کی خدمت اور علوم اسلامیہ کی ترقی و اشاعت کے سلسلہ میں کی ہیں، اور یہ دیکھیں کہ ابھی اس کو کتنی طویل مسافت طے کرنی ہے، اور وہ اس سفر میں اس کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں؟[1]

اجلاس کا آغاز اس طرح ہوا کہ پہلے قاری وودالحی صاحب ندوی نے سورہ فاطر کی اُن آیات کی تلاوت کی جن میں حاملین دین اور نائبین رسول ﷺ کے لئے رہنمائی بھی تھی، بشارت بھی، اور آگاہی اور انتباہ بھی، اور جن کا آغاز "وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ" سے ہوتا تھا، اور جن کا اختتام "ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ

---

[1] ملاحظہ ہو "روداد چمن" ص ۱۱۷-۱۱۸

عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ

قاری وودود الحق صاحب ندوی کی اس وجد انگیز تلاوت کے بعد جس سے عبرت وموعظت کا ایک سماں بندھ گیا اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں، مولوی سید محمد ثانی کا کہا ہوا ترانۂ ندوہ پڑھا گیا، جس کا مطلع ہے ؎

ہم نازشِ ملک و ملت ہیں، ہم سے ہے درخشاں صبحِ وطن
ہم تابشِ دیں، ہم نورِ یقیں، ہم حسنِ عمل، ہم خلقِ حسن

اس ترانہ نے بھی جلسہ میں ایک کیفیت پیدا کردی، اور ندوہ کے فضلاء اور منتسبین میں تشکر اور مسرت، خود شناسی، خود اعتمادی کی ایک لہر دوڑ گئی، ترانہ کے بعد صدر جمہوریہ ہند اور سربراہان مملکت، اور اہم اداروں کے پیغامات پڑھے گئے، خطبۂ استقبالیہ ہوا (جس کا عربی متن میرے ضعف بصارت کی وجہ سے مولوی سید محمد واضح ندوی نے اور اردو متن ناظم اجلاس مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی نے پڑھا) خطبۂ استقبالیہ کے بعد شیخ الازہر کا خطبۂ صدارت ہوا۔

اس کارروائی میں جمعہ کی نماز کا وقت آگیا، اس وقت تک حاضرین کی تعداد قریب قریب ساٹھ ہزار تک پہونچ چکی تھی، شیخ الازہر نے نماز پڑھائی اور بڑا مؤثر اور جاندار خطبہ دیا، شام کو اجلاس کی علمی و تعلیمی نمائش کا افتتاح ڈاکٹر محمد حسین الذہبی وزیر اوقاف مصر نے کیا، مغرب کے بعد دوسری نشست ہوئی جس میں مولانا عبد السلام قدوائی ندوی معتمد تعلیم دار العلوم نے ندوۃ العلماء کی پچاسی سالہ رپورٹ اور آئندہ کے منصوبوں کی تفصیل پیش کی، باوجود اس کے کہ ایسے وسیع اور عمومی جلسوں میں بالعموم طویل رپورٹیں

www.abulhasanalinadwi.org

بے دلی کے ساتھ سُنی جاتی ہیں، یہ رپورٹ توجہ اور دلچسپی سے سنی گئی، چند ممتاز مندوبین نے جن میں مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر ذہبی وزارت اوقاف کویت کے ڈائرکٹر شیخ عبدالرحمن الفارس، ابوظبی کے رئیس القضاۃ شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک تھے، تقریریں کیں، اسی رات کو وزیر اعلیٰ اترپردیش مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا کی طرف سے ان معزز مہمانوں اور نمائندگان خصوصی کے اعزاز میں ایک شاندار اور پُرتکلف عشائیہ دیا گیا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

اجلاس کے چار دن کے اہم واقعات[1] میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام"، کا تعارفی جلسہ، تعلیم پر خطبات و مقالات، روسی نمائندہ میر شرف الدین محمدوف کی اردو میں تقریر، طلبائے ندوہ کی یونین جمعیۃ الاصلاح کا استقبالیہ، صحافتی و ادبی نمائش، دینی تعلیمی کونسل کا عشائیہ، اہل شہر کی طرف سے مہمانوں کا کلارک ہوٹل میں شاندار استقبالیہ اور جمعیۃ علمائے ہند کا کلمرگ ہوٹل میں استقبالیہ اور عشائیہ تھا۔

سب سے زیادہ پُراثر و بابرکت تقریب ۳ نومبر (بوقت صبح) ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی مجوزہ نئی عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب تھی، جو ابوظبی کے رئیس القضاۃ شیخ احمد عبدالعزیز آل مبارک کے ہاتھوں انجام پائی، سنگ بنیاد رکھنے کے بعد شیخ احمد نے ایک ایسی رقت انگیز و اشک ریز دعا کی جس کی یاد شریک ہونے والوں کو مدت دراز تک رہے گی، خود ان کے آنسو رواں تھے، حاضرین کی آنکھیں بھی پُرنم تھیں[2]، اس دن کا اجلاس

---

[1] تفصیل "روداد چمن" میں ملاحظہ ہو۔ [2] الحمد للہ کتب خانہ کی یہ عمارت بعض تعمیری مقامی مصالح کی بناء پر اس جگہ سے کچھ فاصلہ پر بن کر تیار ہوگئی، ۲۸ فروری ۱۹۸۴ء کو اس کے افتتاح کی تقریب بھی عمل میں آئی، جس کی صدارت بانی ندوۃ العلماء مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ارجمند مولانا سید منت اللہ صاحبؒ (امیر شریعت بہار، اڑیسہ) نے کی اور اسی میں تاریخ ندوۃ العلماء کا جو دو جلدوں میں تیار ہو چکی ہے، اجراء کیا گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

برکۃ العصر، ریحانۃ الشام شیخ حسن حبنکہ کی پُراثر دعا پر بخیر و خوبی ختم ہوا۔

کسی جمشید کا ساغر نہیں ہیں

اجلاس کا چونکہ سب سے نمایاں وصف ان عرب ملکوں کے نمائندوں کی کثیر تعداد میں شرکت تھی، جن کے قدرتی وسائل اور تموّل کے قصے زبان زد خلائق ہیں، اور جو اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے ہندوستان کی کسی تقریب میں شریک نہیں ہوئے تھے، اس لئے قدرتاً لوگوں کو خیال تھا کہ اس موقعہ سے اس قومی ادارہ کے مالی استحکام کا فائدہ بھی اٹھایا جائے گا، جو ہندوستان کے غریب مسلمانوں کی اعانت سے چل رہا ہے کہ اس کے لئے اس سے بہتر موقعہ آنا مشکل ہے لیکن ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور اس اجلاس کا منصوبہ تیار کرنے والوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اس پورے اجلاس میں کہیں چندہ کا نام نہیں آنے پائے گا، اور عرب مہمانوں سے جن کے ذریعہ اس ملک کے لوگوں کو خدا شناسی اور حقیقی انسانیت کی پہلی بار نعمت ملی، مادی فائدہ اٹھانے کے خیال کو قریب نہیں آنے دیا جائے گا، ناظم ندوۃ العلماء نے ایک نشست کے بھرے اجلاس میں صفائی سے کہا کہ:۔

"مدتوں سے یہ آرزو تھی کہ خدا ایک ایسا موقعہ لائے کہ عرب فضلاء، اسلام کے داعی اور ہمارے محسن ہمارے گھر آئیں، ہم اپنے سینے کے داغ ان کو دکھائیں اور بتائیں کہ ہندی مسلمانوں نے ایمان و اسلام کی اس دولت کو (جو ان سے حاصل ہوئی تھی) کس طرح سے سینہ سے لگائے رکھا ہے، جو سبق انھوں نے ہم کو پڑھایا تھا، وہ ہمیں اب بھی یاد ہے، ہمارا آموختہ سن لیجئے، حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہم ان کے سامنے دست سوال دراز کریں گے، ہم نے ان کو

www.abulhasanalinadwi.org

خود ان کے ملکوں میں جاکر ہمیشہ ان کا (داعیانہ و قائدانہ) مقام یاد دلایا، اور میں صفائی سے کہتا ہوں کہ میں نے اس بارے میں ان کو بڑا عالی ظرف پایا، ہم نے ان کو یہاں اس لئے بلایا کہ ہم ان کو اپنے اسلاف کرام کی تجدیدی و تربیتی کوششوں کے نتائج دکھائیں، اور اس سے ان کو بھی کچھ فائدہ پہونچے، نہ یہ کہ اُن کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کریں، میں نے سب سے دولت مند اور سب سے زیادہ قابل احترام عرب ملک کے ایک عالی مرتبت سفیر کے سامنے ان کی آمد کے موقعہ پر اقبال کے یہ شعر پڑھے تھے، اور آج بھی ہمارا اسی اصول پر ایمان ہے ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

حضرات! یہ سونے کی سب چڑیاں اُڑ جائیں گی، ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو چھٹی مل گئی، ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، ہمارے مدرسے آپ ہی کے چار چار، آٹھ آٹھ آنے پر چل رہے ہیں، آپ کے چار آنے اور آٹھ آنے ہم کو زیادہ عزیز ہیں، اس لئے کہ آپ ایثار کر کے دیتے ہیں، آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ہم نے ان لوگوں کو اس لئے بلایا ہے کہ ہم اپنا دامن بھر لیں"[۱]

بعض عرب مہمانوں کے استفسار پر ہمارے بعض ندوی فضلاء نے عربی میں اس تقریر کا خلاصہ ان کو سنایا، میں خود جب تقریر کر کے بیٹھا تو شیخ الازہر نے مجھ سے پوچھا، تم نے اتنی دیر تک کیا کہا؟ میں نے ان کو بھی ماحصل سنایا، میں نے اپنی تقریر میں اس بدگمانی

---

[۱] پوری تقریر "روداد چمن" میں دیکھی جا سکتی ہے ص ۲۳۹ - ۲۴۶

www.abulhasanalinadwi.org

کو بھی رفع کرنے کی کوشش کی کہ اجلاس کے منتظمین کی طرف سے مندوبین پر کوئی پابندی عائد کی گئی تھی کہ وہ کسی ملکی یا ملّی مسئلہ کا ذکر نہ کریں اور ان کی تقریروں میں اس صورت حال کی کوئی جھلک نہ پائی جائے، جو اس وقت ملک میں پائی جاتی تھی، اس کے برخلاف بعض مقررین نے ان گرفتاریوں پر احتجاج بھی کیا جو وسیع پیمانہ پر عمل میں آئی تھیں، اور ان کو اس کے نہ کہنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا۔

نماز فجر کے بعد کی دعوتی تقریریں

اس تعلیمی اجلاس کا ایک مفید سلسلہ یہ تھا کہ اس خیال سے کہ عرب مندوبین اور بیرونی ممالک کے فضلاء کے علاوہ خود ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک طرح کا جوہر (CREEM) یہاں آگیا ہے، اس میں ملت کے قائدین بھی ہیں، دینی و تعلیمی اداروں کے سربراہ بھی، مساجد کے ائمہ و خطباء بھی، تبلیغی اور دوسری اصلاحی جماعتوں کے سرگرم کارکن بھی، یونیورسٹیوں، کالجوں کے اساتذہ اور طلباء بھی، اس لئے ایسی تقریروں کی بھی ضرورت ہے جو ہندوستان میں رہ کر دین کی حفاظت اور ملت کے تشخص کو برقرار رکھنے، اور اس ملّت کی اہمیت و نافعیت کو ثابت کرنے کا راستہ متعین کریں، اور جن سے یہاں کے وہ صدہا سامعین جو خلوص اور دینی جذبہ کے ساتھ یہاں آئے ہیں، اپنے اپنے گھر کوئی پیغام لے کر جائیں، یہ تقریریں ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت نظم و ترتیب کے ساتھ دار العلوم کی وسیع مسجد میں نماز فجر کے بعد اجلاس کے دنوں میں کی گئیں، ان کا سلسلہ اجلاس سے ایک روز پیشتر شروع ہو گیا تھا، ان میں دین کی حقیقت و مطالبہ کی وضاحت کی گئی، اجتماعی ذہن اور ملّت کے لئے قربانی و ایثار کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی [illegible] سے پرہیز اور

www.abulhasanalinadwi.org

حقیقت پسندی کی دعوت دی گئی اور بتایا گیا کہ اس ملک میں کام کا صحیح راستہ کیا ہے؟ آخری تقریر میں دعوت کی خاصیت پر روشنی ڈالی گئی اور اس کی دعوت دی گئی کہ صفات میں تغیر پیدا کیا جائے کہ خدا کا معاملہ (ملل و افراد کے ساتھ) صفات پر ہے' ذات پر نہیں' اور بتایا گیا کہ ہندوستان میں ہمیں کس طرح رہنا ہے' اور ہم کس طرح محبوبیت کا مقام حاصل کر سکتے ہیں' اور اس ملک کو صحیح انسانیت کا پیام دے سکتے ہیں[۱]۔

۳ر نومبر (جس میں اکثر عرب مہمان واپس چلے گئے تھے) کی شب کی آخری نشست کی صدارت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے کی جس میں زیادہ تر پروگرام اردو میں ہوئے' ایک دو تقریریں عربی اور انگریزی میں بھی ہوئیں' مدارس عربیہ کے سلسلہ میں کچھ تعارفی مقالات بھی پڑھے گئے' اور مولوی سعید الرحمٰن اعظمی مدیر "البعث الاسلامی" نے "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" کے موضوع پر عربی میں مقالہ پیش کیا' آخر میں صدر اجلاس نے مختصر لیکن پر اثر تقریر کی اور انھیں کی دعا پر یہ پچاسی سالہ جشن تعلیمی جو چار روز جاری رہا سکون و طمانینت' باہمی اعتماد اور جذبۂ اخوت میں ختم ہوا[۲]۔

---

[۱] دو تقریریں جو کیسٹ سے نقل کی گئیں "روداد چمن" میں پڑھی جا سکتی ہیں ص ۲۰۴-۲۳۴

[۲] اس تاریخی اجلاس کی مفصل روداد محمد میاں کے قلم سے "روداد چمن" کے نام سے مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے شائع کی جس کی ضخامت ۲۹۲ صفحات ہے' اور وہ (غیر ذی روح) تصویروں اور نقشوں سے آراستہ ہے شاید کسی اجلاس و اجتماع کی روداد اتنی جاندار و مؤثر شائع ہوئی ہو کہ اس کو جلسہ کی بولتی ہوئی تصویر کہنا صحیح ہوگا' ادیب کبیر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے جو ان دنوں علالت کی وجہ سے کتابوں پر تبصرہ نہیں کر رہے تھے لکھا کہ مصنف نے پروپیگنڈہ کو ادب بنا دیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

ہمشیرامۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا انتقال

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ کامیاب تاریخی جشن سے فارغ ہوکر جب اپنے وطن رائے بریلی واپس آیا اور گھر میں قدم رکھا تو سب سے پہلے میری چھوٹی ہمشیر (مجھ سے بڑی) امۃ اللہ تسنیم صاحبہ جو کچھ دنوں سے علیل تھیں بڑھ کر سامنے آئیں اور انھوں نے بڑی مسرت کے ساتھ اس عظیم تاریخی اجلاس کی کامیابی پر مبارکباد دی جس کی کامیابی اور میری سرخ روئی کے لئے انھوں نے بڑی دعائیں کی تھیں، اور ختم پڑھے تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ صرف دو مہینے کے فصل سے ان کی جدائی کا وہ واقعہ پیش آئے گا، جو صرف یہی نہیں کہ اس مسرت کو حزن سے بدل دے گا بلکہ سالہا سال کے لئے دل پر ایک نقش چھوڑ جائے گا، والدہ صاحبہ مرحومہ کے بعد وہی ہمارے گھر کی برکت و رونق اور ہمارے لئے دن رات دعا کرنے والی تھیں، ۷ا رجنوری ۱۹۷۶ء کو مجھے ناگپور، اورنگ آباد اور پونا وغیرہ کے دورہ پر روانہ ہونا تھا، ان دنوں علاج کے لئے وہ لکھنؤ آئی ہوئی تھیں، میں شام کو دارالعلوم سے گھر آیا کہ ان کو سلام کرتا اور ان سے دعا لیتا سفر پر روانہ ہوں، اس وقت کوئی علامت خطرہ اور فوری تشویش کی نہیں تھی، میں دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا، چلتے وقت مجھے حسب معمول رخصت کیا اور والدہ مرحومہ کی عادت کے مطابق "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَادُّکَ اِلٰی مَعَادٍ" پڑھ کر اللہ کی حفاظت میں دیا، کیا معلوم تھا کہ شعور اور ہوش کی حالت میں ان سے یہ آخری ملاقات ہے، دوران سفر میں مجھ پر واپسی کا ایسا شدید تقاضا ہوا کہ اپنے مزاج و عادت کے خلاف کسی کا اصرار غالب نہ آیا، اور آگے کا سارا پروگرام ملتوی کر کے اورنگ آباد سے دہلی بذریعہ ہوائی جہاز اور دہلی سے کانپور بذریعہ ٹرین، اور کانپور سے

www.abulhasanalinadwi.org

بذریعہ کار ۵ ؍ جنوری کو بعد مغرب لکھنؤ پہونچا، موٹر سے قدم رکھتے ہی یہ خبر بجلی بن کر گری کہ وہ بالکل بے ہوش ہیں، کئی مریضوں کا حال دیکھ چکا ہوں اور ایک طبی گھرانہ سے تعلق ہے، اس لئے اس کے آخری نتائج بجلی کی طرح آنکھوں کے سامنے آگئے، یہ دو تین دن کیسے گذرے اس کو تفصیل سے سنانے کا یارا نہیں، زندگی کے سخت ترین دنوں میں شمار ہیں، انسان کی بے بسی، زندگی کی بے حقیقتی، دنیا کی بے ثباتی، اللہ کے ارادہ کی قاہری اور فرمانروائی سب حقیقتیں منکشف ہوگئیں، بالآخر ۸ ؍ جنوری ۱۹۷۶ء کو ۱۰ بجے صبح اسی گھر میں جس میں انھوں نے باپ اور بھائی کے سایہ میں بچپن سے جوانی اور کہولت، اور غم و خوشی کے بہت سے دن گذارے تھے، جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اور جگر کا یہ مصرعہ حسب حال ہوا۔ ؏

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

ہمشیرہ صاحبہ صالحہ، عابدہ تھیں، صاحب تصنیف اور اہل قلم تھیں، شریف گھرانوں میں خواتین کی جو خوبیاں اور کمالات سمجھے جاتے ہیں، سب میں ان کو تفوق و امتیاز حاصل تھا[1]، وہ "زاد سفر" جیسی مقبول کتاب کی مصنفہ ہیں، جس کو حجاز کے ریڈیو اسٹیشن سے کئی بار نشر کیا گیا اور غالباً اس شرف میں کوئی ہندوستانی خاتون ان کی شریک نہیں، ہمارے حضورؐ، بچوں کی قصص الانبیاءؑ اور کئی مفید رسائل و کتابچوں کی مصنف تھیں، ہمارے خاندان میں عورتوں میں تبلیغی اجتماع و دعوت کی بنیاد انھیں نے ڈالی، جو الحمد للہ ابھی تک جاری اور اس سے بڑا نفع پہونچ رہا ہے۔

جہاں تک اس ناچیز کا تعلق ہے، میرا ان کا ساتھ ایسا رہا کہ کم بھائی بہنوں کا

---

[1] "پرانے چراغ" حصہ دوم ص ۳۶۵

www.abulhasanalinadwi.org

ہوتا ہے، مجھ میں ان میں صرف چھ سال چھوٹائی بڑائی تھی، ہم ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، میرے علمی، ادبی ذوق کے نشو ونما اور ترقی میں ان کا بھی حصہ ہے کہ انھیں کی وجہ سے سیرت، تاریخ اور نعت کے مجموعوں اور شعر وادب کی بہت سی کتابوں سے واقفیت ہوئی، اور ان کی معیت اور نگرانی میں پڑھا اور لطف لیا، ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں حج کا ساتھ تھا، جس میں نو۔ دس مہینے کی رفاقت رہی اور اس میں ان کی سیرت اور فطرت کے بہت سے تابناک گوشے اور کمالات سامنے آئے۔

لیکن ان کی کتاب زندگی کا سب سے قیمتی ورق اور سب سے نورانی عنوان ان کا دردِ دل، ذوقِ دعا، ان کے دل کی بے تابی، اور ان کی آنکھوں کی اشکباری، اور ان کے دن رات کی آہ وزاری تھی، جو ظاہراً تو ان کی خصوصی زندگی کا نتیجہ تھی، لیکن حقیقتاً ان کے اظہار بندگی کے لئے سامان غیبی، اور ان کی ترقی اور رفع درجات کا بہانہ تھا[1]، یہاں پر دو شعر لکھے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا ؎

کب سے لئے کھڑی ہوں میں کاسۂ گدائی　　اب تک ملا نہ مجھ کو اور شام ہونے آئی

بندہ نواز میری منت کی لاج رکھ لے　　میری نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے

اس موقعہ پر نامناسب نہ ہوگا کہ سعید الملک نواب سر حافظ احمد سعید خاں معروف بہ نواب چھتاری کا ایک خط نقل کر دیا جائے، جو انھوں نے ان اشعار سے متاثر ہو کر مجھے لکھا تھا۔

---

[1] "پرانے چراغ" حصہ دوم میں مرحومہ پر جو مفصل مضمون ہے (صفحہ ۳۴۰-۳۶۹) اس میں اشعار کا کچھ نمونہ دیکھا جا سکتا ہے، ان کے اشعار کا مجموعہ "بابِ کرم" کے نام سے مکتبۂ اسلام لکھنؤ نے شائع کر دیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

"جناب کا عطیہ "پرانے چراغ" تو عرصہ ہوا میں ختم کر چکا ہوں، اور اب "تاریخ دعوت و عزیمت" قریب ختم ہے، یوں تو "پرانے چراغ" اردو ادب کے جواہر سے بھری ہوئی ہے لیکن مجھے جتنا روحانی نفع آپ کی ہمشیر صاحبہ مرحومہ کے تذکرہ سے ملا وہ میرے لئے بڑی نعمت ہے، اور مجھے اس سے بارگاہ الٰہی میں التجا کرنے کا طریقہ آگیا، خاص کر چند اشعار جو تذکرہ کے آخر میں ہیں، وہ ایک زخمی دل کی آہ ہیں، کہ جس سے دریائے رحمت جوش میں آتا ہے، وہی قلب محزون کی آواز ہیں کہ جس سے باب رحمت کھلتا ہے، اور وہی وہ فریاد ہے کہ جس کے واسطے "اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید" میری دراز عمر میں مجھے کئی ایسے موقعے آئے ہیں کہ باری تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے راہ ہدایت دکھائی ہے، کبھی انتہائی شفقت کے ساتھ، ایک بار جبکہ میں لندن میں تھا ایسی تنبیہہ فرمائی کہ مجھے اس خواب کی حالت میں یقین کامل تھا کہ وہ لمحہ میری زندگی کا آخری لمحہ تھا، میرا تمام جسم پسینہ میں بھیگ گیا تھا، اور میں کانپ رہا تھا، آپ کا وقت ان پرانی کیفیات کی تفصیل لکھ کر ضائع کرنا نہیں چاہتا، لیکن میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے "پرانے چراغ" بھیج کر مجھے دعا کرنا سکھا دیا۔ جزاک اللہ۔"[1]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"جناب والا کی ہمشیرہ مرحومہ کی مناجات کا وہ شعر کہ جس میں یہ کہا گیا ہے،

---

[1] یکم فروری ۱۹۸۱ء راحت منزل علی گڑھ۔

www.abulhasanalinadwi.org

کہ دعاؤں کی لاج نہیں تو اپنی رحمت کی لاج رکھ لے، مجھے دعا کے وقت یاد آجاتا ہے، خدا اپنے کرم سے باوجود میرے گناہوں کے میری لاج دنیا اور آخرت میں رکھ لے۔ آمین

آپ کا نیازمند

احمد سعید

۱۷ر مارچ ۱۹۸۱ء

www.abulhasanalinadwi.org

بابِ نہم ۹

ایمرجنسی کے زمانہ میں شریمتی اندرا گاندھی (وزیر اعظم ہند) سے ملاقات
اور
ایک تاریخی خط اور بعض اہم واقعات

ایمرجنسی کے نفاذ کا پس منظر

اکثر قارئین کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کی موجودہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۹۶۷ء سے پارلیمنٹ کا الیکشن لڑنے کے لئے رائے بریلی کا حلقہ منتخب کیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے شوہر آنجہانی فیروز گاندھی اسی حلقہ سے پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوئے تھے، اور ان کے نام پر یہاں فیروز گاندھی ڈگری کالج قائم ہے، ۱۹۶۷ء کے جنرل الیکشن میں انھوں نے آسانی سے کامیابی حاصل کرلی، اور یہ سمجھا جانے لگا کہ ان کی سیٹ اس حلقہ سے محفوظ ہے لیکن وزارت عظمٰی کے اس پنج سالہ دور میں لوگوں کی وہ بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں جو انھوں نے کانگریس گورنمنٹ اور اس شخصیت سے وابستہ کر رکھی تھیں، جو نہرو خاندان کی روایات کی وارث اور فراخ دلی، وسیع النظری، اور حب الوطنی کا رمز (SYMBOL) بن گئی تھی، گرانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی، ملک کا انتظامیہ روز بروز ڈھیلا، فرض ناشناس اور ملوث (CORRUPT) ہوتا جا رہا تھا، کانگریس کا عوام سے رابطہ

www.abulhasanalinadwi.org

کمزور ہوتا بلکہ ٹوٹتا جارہا تھا، اور کانگریس کی تاریخ ساز تحریک جس کے سر ملک کی آزادی کا سہرا تھا، ایک پارٹی کی گورنمنٹ میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی جس کے حصہ میں وہ سب شکایتیں اور ملامتیں آرہی تھیں، جو جائز اور ناجائز طریقہ پر حکومت اور انتظامیہ (ADMINISTRATION) سے عوام اور اہل معاملہ کو ہوتی ہیں، مزید برآں ۱۹۷۱ء کے جنرل الیکشن سے پہلے خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) اور اس کے حصول کے ذریعہ (نس بندی) کا قانون نافذ کر دیا گیا تھا، اور اس پر عمل درآمد سختی سے شروع ہو گیا تھا، اس صورت حال کی بناء پر جب ۱۹۷۱ء کے عام انتخابات کا وقت آیا تو ملک اور خود حلقۂ انتخاب کے حالات واحساسات قدرے بدل گئے تھے، پھر بھی رائے بریلی میں ان کی کامیابی کے امکانات روشن تھے۔

۱۹۷۱ء کے جنرل الیکشن میں رائے بریلی کی سیٹ سے ان کے مقابلہ میں مسٹر راج نرائن کھڑے ہوئے جو ان کے پرانے مخالف اور حریف تھے اگرچہ وہ ان کے پایہ کے نہ تھے، اور ان میں سنجیدگی اور وقار کی کمی تھی، لیکن انھوں نے سخت مقابلہ کیا، پھر بھی اندرا جی ایک لاکھ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئیں، جمہوریت بلکہ عصر حاضر کے عظیم ترین مغالطوں میں سے ایک یہ مغالطہ ہے کہ امیدوار کی کامیابی، اس کی عوامی مقبولیت اس کو اپنے حریف پر کھلی ترجیح حاصل ہونے اور رائے دہندگان کے بے لاگ فیصلہ اور ان کی آزادانہ رائے کا نتیجہ ہوتی ہے، سب جانتے ہیں کہ الیکشن میں امیدوار کی ہار جیت خود اس کے الیکشن کے فن (TECHNIC) میں مہارت، الیکشن کرانے کے تجربے اور سلیقے اور اکثر سرمایہ کی کمی وزیادتی پر منحصر ہوتی ہے، اس الیکشن میں بھی سرکاری مشنری آزادی کے ساتھ استعمال کی گئی، یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ اگر حکومت کے موجودہ سربراہ کی جیت ہوگی تو رائے دہندگان اور حلقۂ انتخاب کو اس سے پورا فائدہ

www.abulhasanalinadwi.org

اٹھانے کا موقعہ ملے گا۔

عام حالات میں اگر اس الیکشن کو چیلنج نہ کیا جائے تو حالات معمول کے مطابق چلتے رہتے ہیں اور حکومت آسانی کے ساتھ پارلیمانی مدت پوری کر لیتی ہے اور اس انتخاب میں ایسی کی توقع تھی لیکن خلاف توقع مسٹر راج نرائن نے (جو کچھ ضدی بھی واقع ہوئے تھے) الہ آباد کی عدالت عالیہ میں مسز گاندھی کے الیکشن کو چیلنج کر دیا، ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اس الیکشن میں مرکز کے اثرات، سرکاری افسران اور خاص طور پر اتر پردیش گورنمنٹ کے وسائل آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے گئے، اور انھوں نے عوام کی رائے پر نہ صرف اثر ڈالا بلکہ ان کو مجبور کیا کہ وہ موجودہ وزیر اعظم کو ووٹ دیں۔[1]

ہندوستان کی عدالتوں کی سست کاری یا حکومت کے اثرات اور ترکیبوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۷۱ء میں اس الیکشن کے خلاف راج نرائن صاحب کی طرف سے جو پٹیشن داخل کیا گیا تھا، اس کی بحث و سماعت میں اتنی دیر لگی، یا لگائی گئی کہ پورے چار سال گزر گئے لیکن راج نرائن صاحب کی خوش قسمتی تھی، یا اندرا جی کے لئے سوء اتفاق کہ یہ مقدمہ الہ آباد ہائی کورٹ کے فاضل جج جسٹس جگ موہن لال سنہا کی عدالت میں پیش تھا، جنھوں نے (اپنی افتاد طبع اخلاقی جرأت اور خاص طرح کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں، یا کسی اور سیاسی یا جماعتی وجہ سے جس کا علم نہیں ہو سکا) یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کسی اثر و دباؤ یا ترغیب سے متاثر ہوئے بغیر ان دلائل اور شہادتوں کے مطابق فیصلہ کریں گے جو مدعی کی طرف سے پیش کی گئی ہیں، یہ آزادی ہند کے بعد

---

[1] ان اثرات اور وسائل کی تفصیل کے لئے جن کی اس پٹیشن میں نشاندہی کی گئی اور ان میں سے متعدد کو فاضل جج نے تسلیم کیا، ہندوستان کے مشہور صحافی کلدیپ نیر کی کتاب (THE JUDGEMENT-STORY OF THE EMERGENCY IN INDIA) کا ص ۳۳ ملاحظہ ہو۔

www.abulhasanalinadwi.org

کی عدالتی تاریخ میں ایک نیا تجربہ اور واقعہ تھا، جس نے سارے ملک کو بلکہ دنیا کے پریس اور سیاسی حلقوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

جسٹس جگ موہن لال کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کو ایسا فیصلہ دینے سے باز رکھنے کی ترغیب و ترہیب کے ذریعہ ہر طرح کی کوشش کی جائے گی، حکومتی و کانگریسی حلقوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا فیصلہ اندرا جی کے خلاف ہوگا، پہلے یو۔پی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے ذریعہ ان پر اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی، جب یہ کوشش ناکام ہوئی تو یہ التماس کی گئی کہ اس کو مؤخر کر دیا جائے، یہاں تک کہ پرائم منسٹر اپنا مجوزہ غیر ملکی دورہ پورا کر لیں، ایک ممبر پارلیمنٹ کے ذریعہ ان کو پانچ لاکھ روپے کی رقم کی پیش کش بھی کی گئی، امریکہ کے سپریم کورٹ کی ججی کا بھی وعدہ کیا گیا، لیکن ان پر کسی بات کا اثر نہ ہوا، ان اثرات سے بچنے کے لئے انھوں نے اپنی قیام گاہ بھی تبدیل کر لی، اور ان کوششوں سے آزردہ ہو کر انھوں نے کورٹ رجسٹرار کو بلا کر ہدایت کر دی کہ وہ اعلان کر دیں کہ ۱۲ رجون فیصلہ سنانے کی تاریخ ہے، انھوں نے اتنی رعایت کی کہ ۸ رجون سے پہلے جبکہ گجرات اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے فیصلہ سنانے سے احتراز کیا تاکہ ان پر اس کا اثر نہ پڑے، ۱۲ رجون کو دہلی کے سکریٹریٹ کی طرف سے آخر آخر وقت تک کوشش جاری رہی لیکن بالآخر انھوں نے ۱۲ رجون کو ۱۰ بجے عدالت میں چانک آکر اپنے اس فیصلہ کے جو ۲۵۸ صفحات پر مشتمل تھا، منتخب صفحات پڑھے اور پھر اعلان کیا کہ پٹیشن منظور کیا جاتا ہے، ۱۰ بجکر ۲ منٹ پر U.N.I. کی مشین پر یہ (FLASH MESSAGE) آگیا کہ مسز گاندھی اپنی سیٹ سے محروم کر دی گئیں، اس کے بعد پھر یہ خبر بھی شائع کر دی گئی کہ چھ سال تک وہ انتخاب میں حصہ لینے کے حق سے بھی محروم کی جارہی ہیں۔[1]

---

[1] تفصیلات ماخوذ ہیں کلدیپ نیر کی کتاب (THE JUDGEMENT) کے باب TOWARDS — DICTATORSHIP — کے ص ۳۳ سے۔

ایمرجنسی کا نفاذ

اس فیصلہ کے بعد مسز گاندھی کے سامنے دو ہی راستے تھے، ایک یہ کہ وہ اپنے کو حکومت سے علیٰحدگی پر آمادہ کریں اور استعفا دیدیں، دوسرے یہ کہ وہ سپریم کورٹ میں اپیل کریں، انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، مخالف جماعتوں نے سپریم کورٹ میں ان کی مخالفت نہ کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن ان کا برابر یہ اصرار رہا کہ اخلاقی طور پر انھیں مستعفی ہو جانا چاہیئے صرف کمیونسٹ پارٹی استعفا کے خلاف تھی، سپریم کورٹ کے جسٹس آئر نے یہ فیصلہ دیا کہ مسز گاندھی کے خلاف کوئی اہم لاقانونیت یا اعتراض ثابت نہیں ہو سکا، انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بدستور پرائم منسٹر کی حیثیت سے کام کر سکتی ہیں، بحث و مباحثہ میں بھی حصہ لے سکتی ہیں لیکن لوک سبھا میں اس وقت تک ووٹ نہیں دے سکتیں، جب تک کہ سپریم کورٹ ان کی اپیل کو منظور نہ کرلے، اس طرح اگرچہ ان کی سیٹ اور عہدہ محفوظ رہا لیکن مخالف جماعتوں کے (جو جے پرکاش نرائن جی کی قیادت میں منظم اور متحد ہو گئی تھیں) مظاہروں اور احتجاج کا زور اور دباؤ اتنا بڑھا کہ ان کے خصوصی مشیروں اور معتمدین نے (جن میں بنگال کے چیف منسٹر MR. SIDHARTH سب سے پیش پیش تھے) انھیں مشورہ دیا کہ اب داخلی (INTERNAL) ایمرجنسی نافذ کرنے کے سوا ان کے اقتدار میں رہنے کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔[1]

چنانچہ ۲۵ رجون کو ۱۱ بج کر ۴۵ منٹ پر ایمرجنسی کے اعلان پر صدر جمہوریہ کے دستخط ہو گئے، اعلان میں کہا گیا کہ اندرونی خلفشار کے باعث ہندوستان کی

---

[1] ایضاً ص ۳۳

www.abulhasanalinadwi.org

سالمیت کو خطرہ درپیش ہے' اس اعلان کے ذریعہ حکومت کو پریس پر سنسر شپ اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے عدالتی کارروائی روکنے کے اختیارات حکومت کو دیئے گئے تھے" MISA " کا قانون پہلے ہی سے نافذ تھا، اور کسی بھی شخص کو عدالتی کارروائی کے بغیر گرفتار کرنے کا حق حاصل ہو چکا تھا، دوسرے دن (۲۶ جون) صبح کو کابینہ کا جلسہ طلب کیا گیا، جس میں کیبنیٹ کو ایمرجنسی کے نافذ ہونے کی اطلاع دی گئی' اس وقت تک جے پرکاش نرائن' مرارجی اور دوسرے کثیر التعداد مخالف لیڈروں کو گرفتار کیا جا چکا تھا، اس روز دہلی کے اکثر اخبارات شائع نہیں ہو سکے' کیونکہ ان کی بجلی رات کو کاٹ دی گئی تھی' سرکاری طور پر ۶۷۲ اشخاص کی گرفتاری کی اطلاع دی گئی، صوبوں میں بھی گرفتاریاں شروع ہو گئیں' غیر ملکی اخبارات نے عام طور پر ایمرجنسی نافذ کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، صرف روس کے اخبار "پراودا" نے اسے جمہوری طاقتوں کی فتح سے تعبیر کیا۔

اندرا جی کے چھوٹے لڑکے سنجے گاندھی (جن کی عمر کل ۲۸ سال کی تھی' اور ان کی مکمل تعلیم بھی نہیں ہوئی تھی) جو ایمرجنسی سے پہلے بھی متحرک اور سرگرم تھے' اس وقت اچانک ہندوستان کے سیاسی و انتظامی افق پر سب سے با اختیار شخصیت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے[1] سارے ملک نے یہ دیکھ لیا کہ وہی اس برصغیر کے رہنے والوں کی ایک طرح سے قسمت

---

[1] خدا کی شان بے نیازی اور تقدیر کی نیرنگی دیکھئے کہ ۲۳ جون ۱۹۸۰ء کو میں بمبئی سے لکھنؤ آرہا تھا، گاڑی غالباً اورئی کے اسٹیشن پر ٹھہری تو ہمارے فرسٹ کلاس کے ایک ہمسفر ہندو افسر کسی ضرورت سے اسٹیشن پر اترے انھوں نے واپس آکر خاموشی سے کہا کہ اسٹیشن پر چرچا ہے کہ سنجے گاندھی ہوائی جہاز کے ایک حادثے کا شکار ہو گئے ہیں' اس وقت تک ان کی موت کی کوئی قطعی خبر نہیں تھی' ہم لوگوں نے اس کا تذکرہ کرنے میں احتیاط کی ہدایت کی، اگلے اسٹیشن کالپی پر جب گاڑی رکی تو اسٹیشن کے باہر ماتمی جلوس نکل رہا تھا، جس سے واقعہ کی قطعی طور پر تصدیق ہو گئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

و عزت کے مالک بن گئے ہیں، (جن میں بڑے بڑے دانشور، ملک کے سابق رہنما اور بے لوث خادم اور اپنی اپنی جگہ صاحبِ اعتبار و اقتدار ہیں اور جن میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ بھی شامل ہیں) اور پورے ملک میں انھیں کا حکم چلتا ہے، واشنگٹن پوسٹ کے لوئیس ایم سیمون (LEWIS M. SIMONS) نے سنجے گاندھی اور ان کی ماں سے متعلق مضمون میں یہ انکشاف کیا کہ اندرا گاندھی کو اب اپنے رفیق وزراء پر اعتبار نہیں رہا جس کی وجہ سے وہ صرف سنجے گاندھی پر بھروسہ کر رہی ہیں، سنجے کے کسی فرمان کی داد فریاد نہ تھی، اندرا جی سے اگر کسی بات کی شکایت کی جاتی تو وہ کہہ دیا کرتیں کہ سنجے سے کہو۔

سنجے گاندھی کی سب سے بڑی اہلیت ان کا فوری طور پر فیصلہ کرنا اور پھر اس پر سختی سے عمل درآمد تھی، وہ اپنی نوجوانی کے جوش اور مزاجی کیفیت میں کسی رعایت، مصلحت اور رحم کے قائل نہیں تھے، اور نہ ان میں ایک سیاسی قائد یا کہنہ سال ڈکٹیٹر کی طرح کسی قسم کا تجربہ یا ممتاز ذہنی صلاحیت تھی، ان کی دل چسپی کے دو میدان تھے، شہروں کی صفائی و آراستگی اور خاندانی منصوبہ بندی پر فوری عمل درآمد جس کے لئے جبریہ نس بندی ضروری تھی، پہلی دل چسپی اور مقصد کا نشانہ اپریل ۱۹۷۶ء میں ترکمان گیٹ کا بد قسمت محلہ بنا جس میں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی تھی، عہد مغلیہ سے اس محلہ میں قدیم خاندان آباد تھے، ان میں بڑے مکانات بھی تھے، اور چھوٹے بھی، کچھ مکانات نئے طرز کے اور ایر کنڈیشن بھی تھے، لوگوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ اس علاقہ کو منہدم کر دیا جائے گا، انھوں نے اس حکم کو رکوانے کے لئے دوا دوش کی تو ان سے کہا گیا کہ اس شرط پر اس کو منظور کیا جا سکتا ہے کہ وہ نس بندی کے کچھ کیس دیں، لوگوں نے مجبوراً دو سو ایک [۲۰۱] آدمی نس بندی کے لئے دینے کا وعدہ کر لیا، لیکن ۱۹ اپریل کو چودہ [۱۴] بلڈوزروں کے ذریعہ مکانات گرانے کا سلسلہ شروع ہو گیا، عورتیں چیخ رہی تھیں،

www.abulhasanalinadwi.org

بچے رو رہے تھے، اور مردوں کو سکتہ سا ہو گیا تھا، ایک ہزار مکانات گرائے گئے، اس میں ایک سو پچاس[1] افراد مارے گئے، اور سات سو[1] افراد گرفتار ہوئے، لیکن اخبارات میں ایک لفظ بھی شائع نہیں ہوا۔[1]

دہلی کی جامع مسجد کے گرد کثیر تعداد میں مسلمانوں نے جھونپڑی نما مکانات اور دکانیں بنا رکھی تھیں، ۴ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو وہاں بھی اس اسکیم پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا گیا، کرنال، روہتک، بھیوانی اور گڑگاؤں کے کئی علاقے زمین کے برابر کر دیئے گئے، کلدیپ نیّر کا اندازہ ہے کہ صرف لکھنؤ میں دس ہزار عمارتیں ملبہ میں تبدیل کر دی گئیں،[2] شریمتی اندرا گاندھی کو شکایتیں مل رہی تھیں کہ بے گھر ہونے والے افراد سخت سردی کے زمانہ میں کھلے میدان میں پڑے ہوئے ہیں، انھوں نے محمد یونس خاں کو تفتیش حال کے لئے مقرر کیا لیکن ان کی رپورٹ پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

جہاں تک نس بندی کے قانون پر عمل درآمد کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں بھی بڑی بے رحمی اور شدت سے کام لیا گیا، مظفر نگر اور سلطان پور میں وحشیانہ طریقہ پر اس پر عمل کیا گیا، اور احتجاج کرنے والوں یا راہ فرار اختیار کرنے والوں کو اذیت پہونچائی گئی، بعض گاؤں کے لوگوں نے سردیوں کی بہت سی راتیں کھیتوں میں چھپ کر گذاریں، لوگ دہلی اور بڑے شہروں میں اس طرح جاتے ہوئے ڈرتے تھے جیسے مجرم تھانے میں، یا بدمحنت لڑکے مکتب میں، قانون کے اجراء میں عمر، صحت اور حیثیت، شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کسی چیز کی رعایت نہیں کی جاتی تھی، پوری فضا میں دہشت اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی، اور

---

[1] ترکمان گیٹ کے واقعہ کی تفصیلات ملاحظہ ہوں (THE JUDGEMENT) میں صفحہ ۱۳۸-۱۴۰

[2] ایضاً صفحہ ۸۸

www.abulhasanalinadwi.org

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزی فوجوں کے غلبہ حاصل کرنے سے ہندوستانیوں کو اپنی ذلت وغلامی اور بے بسی کا جو احساس ہوا تھا، اسی سے ملتی جلتی کیفیت اچھے پڑھے لکھوں میں پائی جاتی تھی۔

مصنّف کی اندرا جی سے ملاقات اور کھلا خط

دہشت و سراسیگی کی یہ فضا تھی جس سے تھوڑے اختلاف کے ساتھ کوئی قریہ، قصبہ، شہر مستثنیٰ نہ تھا، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۵ء کو میں اپنے چند رفقا کے ساتھ جن میں عزیزی مولوی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء قابل ذکر ہیں، عزیزگرامی مولوی عبدالغفار صاحب ندوی قیّم جماعت اسلامی لکھنؤ سے ملنے کے لئے گیا، جو ایمرجنسی میں لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں تھے، اس وقت ریفارمیٹری احاطہ میں تقریباً ۳۰۰ سیاسی قیدی تھے، اور اکثر کے اہل وعیال اور دوست احباب اس وقت ملنے آئے تھے، ۲۰ قیدی مسلم وغیر مسلم اس وقت مولوی عبدالغفار صاحب کے پاس جمع ہو گئے، اس وقت ممتاز و تعلیم یافتہ حاضرین نے جن میں بعض غیر مسلم وکلاء پیش پیش تھے، مجھے توجہ دلائی کہ ان غیر معمولی حالات میں ایک غیر جانب دار محبِّ وطن فرد کی حیثیت سے میں اندرا جی سے ملاقات کروں، اور ملک کو اس تباہی کی راہ پر چلنے سے روکوں جس پر وہ اس وقت تیزی سے جا رہا ہے۔

ان کے اس خیال کا غالباً محرک یہ تھا کہ میں ایک غیر سیاسی شخصیت ہوں، مزید برآں میرے بیرونی ممالک خاص طور پر ممالک عربیہ سے تعلقات ہیں، اور وہاں کی کئی معزز تنظیموں بالخصوص دنیائے اسلام کی سب سے مؤقر اور نمائندہ تنظیم رابطۂ عالم اسلامی کا بنیادی رکن ہوں، مزید یہ کہ میں رائے بریلی خاص کے ایک ایسے قدیم اور معزز خاندان کا فرد ہوں جس کے پورے ضلع پر دینی اثرات ہیں،

www.abulhasanalinadwi.org

اور انتخابی سیاست کے میدان کا کوئی شہسوار انتخاب پر اثر انداز ہونے والے کسی بعید سے بعید تر امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مجھے بھی ان کی بات میں وزن نظر آیا اور یہ خیال ہوا کہ اس کوشش کا نتیجہ خواہ کتنا ہی بعید از امکان ہو، مجھے ملت کے ایک صاحب ضمیر فرد، ہندوستان کے ایک صاحب شعور شہری اور پھر ایک عالم دین کی حیثیت سے اس کی ضرور کوشش کرنی چاہئے، اس سلسلہ میں اتنا اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ نس بندی کے سلسلہ میں بعض علماء سے تائیدی فتوے بھی حاصل کئے گئے، اور یہ ثابت کیا گیا کہ اس میں جو اخلاقی شناعت اور مذہبی حرمت دکھائی گئی ہے، وہ صحیح نہیں ہے، سلیقہ کے ساتھ میرے سلسلہ میں بھی کوشش کی گئی، ایک مرتبہ صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ[۱] کی طرف سے شیعہ سنی علماء کو بھی دعوت دی گئی، شہر کے ڈپٹی کمشنر صاحب نے مجھے بھی اس کی اطلاع کی اور دار العلوم میں مجھ سے مل کر ان کا پیغام پہونچایا، میں نے صدر صاحب کے نام ایک ذاتی خط لکھ کر مولانا ابو العرفان ندوی کے ذریعہ (جن سے صدر صاحب ذاتی طور پر واقف تھے) بھیجا جس میں میں نے لکھا کہ میں علیحدہ سے آپ سے مل سکتا ہوں، آپ کا احترام کرتا ہوں لیکن اس عمومی مجلس میں جس میں اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی میں اپنے شریک ہونے کا کوئی فائدہ نہیں سمجھتا، فخر الدین علی احمد صاحب کی یہ شرافت تھی کہ جب گورنر صاحب اور ذمہ داروں کی طرف سے نام لے لے کر حاضری لینی شروع ہوئی، اور میرا نام آیا تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا کا ذاتی خط میرے پاس آ چکا ہے، انھوں نے آنے کا معقول عذر ظاہر کیا ہے، اور پھر کبھی ملنے کا وعدہ کیا ہے، ایک مرتبہ

---

[۱] یاد ہے کہ مسٹر بہوگنا ایمرجنسی کے نفاذ کے چند مہینوں کے بعد اتر پردیش کی وزارت اعلیٰ کے عہدہ سے محروم کر دیئے گئے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

آل انڈیا ریڈیو کے نمائندے بھی دہلی سے لکھنؤ آئے اور انھوں نے اس مسئلہ میں میری تائید حاصل کرنی چاہی لیکن میں نے انھیں موقع نہیں دیا اور وہ ناکام واپس گئے۔

اندرا جی سے ملاقات اور خط

جیل کی گفتگو کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ وزیر اعظم صاحبہ سے خصوصی ملاقات کا وقت طلب کروں، اس کے لئے میں نے ایک دوبار ان کو ڈاک سے خط لکھا[1]، ایک مرتبہ مولوی اسحاق جلیس ندوی کو دہلی بھیجا کہ وہ محمد یونس خاں سے ملیں، جو خان عبدالغفار خاں کے تعلق کی وجہ سے اندرا جی سے قریب اور ان کے معتمد ہیں، لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اور مجھے ان کے سکریٹریٹ سے وقت کے تعین کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔

۲۳ راگست ۱۹۷۶ء کا دن تھا، میں ظہر کی نماز کے لئے گھر سے مسجد کے لئے نکلا معلوم ہوا، ایس ڈی ایم صاحب میرے انتظار میں ہیں، ملاقات پر انھوں نے بتایا کہ ان کو کلکٹر صاحب نے بھیجا ہے، ان کو دہلی سے پیغام ملا ہے کہ مولانا کو پرائم منسٹر نے کل راشٹرپتی بھون میں لنچ میں شرکت کی دعوت دی ہے، مسٹر شفیع قریشی وزیر ریلوے نے ہدایت کی ہے کہ آج ہی ان کے دہلی کے لئے سفر کا انتظام کیا جائے، ہم آپ کو یہ اطلاع دینے آئے ہیں، میں نے خیال کیا کہ وزیر اعظم صاحبہ سے ملاقات کی ایک تقریب پیدا ہو گئی ہے، مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، اور ان سے گفتگو کے لئے علیحدہ وقت لینا چاہیئے، مجھے اس کے آگے پیچھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس دعوت کی تقریب کیا ہے، میں نے ان سے کہا کہ میں بیمار آدمی ہوں، تنہا سفر نہیں کر سکتا (یہ آنکھ کے آپریشن سے پہلے کا واقعہ ہے)، میں ضعفِ بصارت کی وجہ سے

---

[1] ۱۹۷۶ء کے آغاز میں مجھے سعودی عرب اور مراکش کا سفر پیش آ گیا، جس سے واپسی مئی کے مہینے میں ہوئی، اس لئے وزیر اعظم صاحبہ سے ملاقات کی کوشش جون کے مہینے سے شروع کی گئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

کوئی قریبی سفر بھی تنہا نہیں کر سکتا تھا) میرے لئے دو رفیق ضروری ہیں ایک عبدالرزاق جو میری دواؤں اور معمولات سے واقف ہیں، دوسرے میرے بھانجے مولوی سید محمد رابع ندوی جو میرے معاون و مشیر ہیں، انھوں نے اس کو منظور کیا اور سفر کے انتظام کے لئے چلے گئے۔

خوش قسمتی سے مجھے چند روز پہلے اچانک اس کا خیال پیدا ہوا تھا کہ ممکن ہے مجھے طلبی کی فوری اطلاع ملے، اس لئے مجھے اندرا جی کے نام ایک خط پہلے سے تیار کر لینا چاہیے میں نے تکیہ کی مسجد میں بیٹھ کر اردو میں ایک مفصل اور واضح خط لکھوایا اور انگریزی ترجمہ کے لئے لکھنؤ ڈاکٹر آصف صاحب قدوائی کے پاس بھیج دیا، مجھے بہت سی اہم شخصیتوں اور بعض اوقات سربراہان مملکت سے ملاقات کے موقع پر اس کا تجربہ اور احساس ہو گیا تھا کہ کسی اہم موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے کوئی چیز پہلے سے لکھی ہوئی تیار ہونی چاہیے جس میں اہم نکات آگئے ہوں، اس لئے کہ بعض اوقات اظہار خیال کا پورا موقعہ نہیں ملتا، اور فریق ثانی کے سامنے بھی غور اور کارروائی کرنے کے لئے کوئی منضبط تحریر ہونی چاہیے، میں نے اسی وقت لکھنؤ ٹیلی فون کروایا کہ میں شام کی جنتا ایکسپریس سے دہلی روانہ ہو رہا ہوں، ترجمہ ٹائپ شدہ مجھے اسٹیشن پر مل جانا چاہیے۔

تھوڑی دیر میں سرکاری جیپ آگئی، مجھے اس کا بھی اندیشہ تھا کہ میں شاید دہلی سے اپنے مستقر پر واپس آنے کے بجائے سرکاری مہمان بنا لیا جاؤں، اس لئے میں نے گھر والوں کو اس کا بھی اشارہ دے دیا، وہ سرکاری افسر بھی جیپ کے ساتھ آئے تھے، میں جب جیپ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر روانہ ہوا تو شہر کے بہت سے لوگوں کو اس کا خیال ہوا ہوگا کہ میں شاید حراست میں لے لیا گیا ہوں اور ایمرجنسی کی اس فضا میں یہ بات ذرا بھی بعید از قیاس نہ تھی، راستہ میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے لئے پرتاپ گڑھ کے ریلوے اسٹیشن کو ہدایت بھیج دی گئی ہے کہ

www.abulhasanalinadwi.org

فرسٹ کلاس کا ایک کمپارٹمنٹ میرے لئے ریزرو کردیا جائے، میں نے افسر متعلقہ سے کہا کہ میں عام طور پر تھرڈ کلاس تھری ٹائر سے سفر کرتا ہوں، انھوں نے کہا کہ اب نیا انتظام مشکل ہوگا، میں نے اس کے لئے اصرار کیا، اور کہا کہ یہ میرے اصول کے خلاف ہے[1] اسٹیشن کے عملہ کو اس کی اطلاع تھی، اور ریلوے کے ذمہ دار مجھے آرام سے سفر کرانے کے لئے مستعد تھے، میں نے کہا کہ اگر ریلوے کے آفیسر خود چاہیں تو تھری ٹائر میں تین نشستوں کا انتظام کچھ مشکل نہیں، چنانچہ تھوڑی دیر میں اس کا انتظام ہوگیا، اور ہم لوگ روانہ ہوئے، لکھنؤ اسٹیشن پر عزیز گرامی مولوی معین اللہ صاحب خط کے ترجمہ کے ساتھ موجود تھے، اگلے دن دہلی گاڑی پہونچی تو قریشی صاحب وزیر ریلوے کا ایک نمائندہ اسٹیشن پر موجود تھا، اس نے مجھے پرائم منسٹر کا دعوت نامہ دیا، جس سے مجھے معلوم ہوا کہ آج دوپہر کو راشٹرپتی بھون میں صدر موریطانیا مختار ولد داداصاحب کے اعزاز میں وزیر اعظم صاحبہ کی طرف سے لنچ ہے، شاید عربی دانی اور میرے اسلامی ممالک کے دوروں کی مناسبت سے اس میں شرکت کے لئے مجھے بھی دعوت دی گئی، یا ممکن ہے اس کے ذریعہ مجھے قریب ومانوس کرنا مقصود ہو۔

میرا قیام حسب معمول اپنے چچازاد بھائی مولوی سید ابوبکر حسنی ایم، اے اسسٹنٹ پروفیسر نہرو یونیورسٹی دہلی کے یہاں رہا، میں عزیزی محمد رابع کو لے کر ٹھیک وقت پر راشٹرپتی بھون پہونچ گیا، میں راشٹرپتی بھون میں داخل ہوا تو اندرا جی اس وقت تک نہیں آئی تھیں، میں ایک خالی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا، معلوم ہوا کہ میرے قریب تر ہم نشیں

---

[1] بعد میں ریلوے کی بدانتظامی اور اپنی معذوریوں کی بناء پر کبھی سفر بھی عام حالات میں فرسٹ کلاس سے کرنے لگا ہوں۔

www.abulhasanalinadwi.org

صدر کانگریس بروا صاحب (DEV KANT BAROOAH) ہیں، میں ان سے باتوں میں مشغول تھا، میری نظر بھی کمزور تھی کہ اچانک عزیزی رابع نے مجھے یہ کہہ کر متوجہ کیا کہ ماموں جی! پرائم منسٹر آپ کے سامنے کھڑی ہیں، میں نے آداب کیا اور ان کی طرف متوجہ ہوا، میں نے ان سے کہا کہ میں نے آپ کو کئی خط رجسٹری سے بھیجے جن میں میں نے ملاقات کا وقت مانگا تھا، انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا، میں نے کہا اب سہی! آپ مجھے ملاقات کا وقت دے دیں مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، انھوں نے کہا کہ آپ کل تک ٹھہریں گے؟ میں نے کہا کہ اس کام کے لئے ٹھہر سکتا ہوں، رمضان شروع ہونے میں دو دن باقی تھے[1] لیکن میں نے قیام ضروری سمجھا، انھوں نے دہلی میں میرا پتہ پوچھا اور ٹیلی فون نمبر معلوم کیا اور کہا کہ آپ کو آج ہی ملاقات کا وقت بتلا دیا جائے گا۔

اتفاق سے مجلس میں عربی جاننے والا کوئی نہیں تھا، اور صدر صاحب موریٹانیا عربی کے علاوہ غالباً فرنچ ہی جانتے تھے، اندرا جی نے کسی کو اشارہ کیا کہ مجھے ان کے پاس بٹھائیں، میں نے جب عربی میں گفتگو شروع کی تو وہ بہت مانوس ہوئے اور انھوں نے مجھے موریٹانیا[2] آنے کی دعوت دی۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب میں قیام گاہ پہونچا تو چند منٹ بعد ہی سکریٹریٹ سے ٹیلی فون آیا کہ پرائم منسٹر نے کل ۳ بجے کا وقت آپ کو اپنے دفتر میں ملاقات کرنے کے لئے دیا ہے، میں وقت مقررہ پر پہونچ گیا، اپنے دفتر میں وہ بالکل تنہا تھیں، گفتگو کا آغاز ہوا، میں نے خط ان کے سامنے رکھا، انھوں نے کہا کہ میں دیکھ لوں گی، مجھے اس کا

---

[1] ۲۷ اگست کو رمضان شروع ہو گیا۔ [2] موریٹانیا شمالی افریقہ کا وہی ملک ہے جس پر شنقیط کا مردم خیز علاقہ اور نامور عرب ادباء و محدثین کا وطن شامل ہے اور جہاں کے لوگوں کا حافظہ شہرۂ آفاق ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

تجربہ تھا کہ مصروفیت کی وجہ سے ایسے وعدہ کا ایفاء ضروری نہیں[1]، اس لئے میں نے کہا اس کے پڑھنے میں چند منٹ صرف ہوں گے، آپ اسی وقت پڑھ لیں، انھوں نے وہیں خط پڑھا، پھر میری گفتگو شروع ہوئی، قبل اس کے اس گفتگو کا خلاصہ عرض کیا جائے، قارئین یہ خط پڑھ لیں، خط پڑھنے سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ کسی تحریر کے مضمون پر ہمدردانہ غور کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ مخاطب یا مکتوب الیہ کو نفسیاتی طور پر ایسی غذا بہم پہونچائی جائے، جو اس کو یہ احساس دلائے کہ تحریر یا گفتگو میں جائز حد تک مخاطب کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے، اس کی محنت و کوشش کا اعتراف ہے، اور اس سے کسی مایوسی یا بدگمانی کا اظہار نہیں کیا گیا ہے، خط کی تمہید اسی نفسیاتی اصول اور حکمتِ دعوت پر مبنی ہے، یہاں خط کا پورا متن درج کیا جاتا ہے:۔

رائے بریلی

محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ وزیر اعظم ہند

بہت عرصہ سے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جذبات و خیالات پیش کرنا چاہتا تھا، گذشتہ فروری میں میں نے اس کی مخلصانہ کوشش کی تھی کہ مجھے آپ سے دہلی میں یا جہاں آپ پسند کریں تھوڑی دیر ملاقات کا موقعہ مل جائے، اس کے لئے ایک رجسٹرڈ خط بھی آپ کی خدمت میں روانہ کیا تھا، میں اس کو ملک کے لئے مفید اور اہم ترین اخلاقی فرض سمجھتا تھا، لیکن اس کا مجھے کوئی جواب نہ ملا، اس وقت کے مقابلہ میں حالات اور زیادہ سنگین اور تشویشناک ہو گئے ہیں، اس لئے میں نے اس کے لئے

---

[1] ایک مرتبہ شاہ فیصل مرحوم کے ساتھ بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا تھا، اور انھوں نے میرے سامنے ہی میرے طویل مکتوب کو پورے طور پر پڑھا، اور اس کی روشنی میں گفتگو شروع کی۔

www.abulhasanalinadwi.org

دوبارہ کوشش کی، میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے ازراہ عنایت مجھے اس کا موقعہ مرحمت فرمایا، میں نے مناسب سمجھا کہ زبانی گفتگو کے علاوہ میں کچھ لکھ کر پیش کروں تاکہ آپ اطمینان سے اس پر نظر ڈال لیں۔

میں سب سے پہلے تو آپ کو خلوص قلب سے اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں جو آپ نے فرقہ وارانہ فسادات، بڑھتی ہوئی لاقانونیت، انارکی اور دہشت انگیزی کے ختم کرنے میں حاصل کی[1]، جو اس ملک کو ہر قسم کی ترقی کرنے، اور دنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اور جس نے ایک بے یقینی اور بے اعتمادی کی فضا پیدا کردی تھی، اس طرح سے ملک کی انتظامی مشنری میں آپ نے جو حرکت و سرعت پیدا کردی وہ بھی ایک قابل مبارک باد کامیابی ہے، اور جو عرصہ کے بعد اس ملک میں پیدا ہوئی، اگرچہ مذہب و اخلاق کے ایک پیرو، اقوام و ملل کی تاریخ کے ایک سچے طالب علم کی حیثیت سے میں اس تمنا کے اظہار کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر انتظامی حکومتی اقدامات کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے دلوں کو چھونے، ان کے اندر گہری اور مستقل تبدیلی لانے، احساس ذمہ داری پیدا کرنے، اور انسانیت کی عزت و احترام کا جذبہ پیدا کرنے اور سچی وطن دوستی کی زیادہ عمیق اور وسیع کوشش کی جاتی تو آپ کو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور دیرپا کامیابی حاصل ہوتی، جو حاصل ہوئی ہے، اس سلسلہ میں آپ کی مجبوریوں اور دشواریوں کا مجھے احساس ہے، جو آپ کو اتنے بڑے ملک کی ان نازک حالات میں قیادت و انتظام میں پیش آرہی ہیں،

---

[1] یہ پہلی وزارت عظمیٰ کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد کے واقعات ہیں، افسوس ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد جو عظیم فسادات رونما ہوئے (جن میں مرادآباد کا فساد جو عین عید کے نماز کے موقعہ پر ہوا تھا سب سے زیادہ افسوسناک تھا) ان کے سلسلہ میں اس مستعدی اور فرض شناسی کا اظہار نہیں ہوا جس کی ایک قومی حکومت سے بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن میری شروع سے یہ مخلصانہ رائے رہی ہے کہ آپ کو خدا نے جو غیر معمولی ذہنی صلاحیتیں عزم صحیح اور جلد فیصلہ کرنے کی جو قابلیت عطا کی ہے، اس سے آپ ان مشکلات پر غالب آسکتی ہیں۔

میرا شروع سے خیال رہا ہے کہ ایمرجنسی میں بڑی تعداد میں لوگوں کی گرفتاری، پریس اور اظہار رائے کی آزادی پر (جو ہندوستان کا شروع سے طرۂ امتیاز رہا ہے) پابندی عائد کرنا، آپ کے مزاج، تعلیم وتربیت، خاندانی روایات اور اصلی جذبات کے سراسر خلاف ہے، اور آپ نے اس کو بالکل وقتی طور پر شدید مجبوری سے اختیار کیا ہے، اور جس لمحہ ملک کے حالات درست ہوجائیں گے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی، آپ اسی لمحہ اس کو ختم کر دیں گی، اس کے صحیح وقت اور حد کا تعین وہی کرسکتا ہے، جو اندرونی حالات اور ملک کے حقائق سے واقف ہو، اور اس بارے میں ہم سب کو آپ پر اعتماد کرنا چاہیئے لیکن اس بات کے اظہار میں کوئی حرج نہیں کہ ہم سب کی تمنا ہے کہ وہ وقت جلد آئے حالات معتدل اور نارمل ہوں، لوگوں کو اظہار خیال کی وہ آزادی ملے جس پر ہم نے ہمیشہ باہر کے ملکوں میں فخر کیا ہے، اور زندگی کی وہ گرمی اور نرمی محسوس ہو جو ایک زندہ جسم کی خصوصیت وعلامت اور جینے کا لطف وقیمت ہے، اس سلسلہ میں اتنا کہنے کی اور اجازت چاہتا ہوں کہ آپ کے بغیر علم وارادہ کے ان گرفتاریوں میں بڑی بے احتیاطی اور ایک حد تک بڑی زیادتی ہوئی ہے، ان لوگوں نے جو شریفانہ جذبات سے عاری تھے، اور جن کی بہت سی اغراض وابستہ تھیں اس غیر معتدل صورت حال سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا، اور بہت سے ناکردہ گناہ گرفتار ہوئے، ان سے متعلق ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد ہیں، جو نانِ شبینہ کے محتاج ہوگئے، دن رات وہ فریاد کرتے ہیں،

www.abulhasanalinadwi.org

ملک جس اخلاقی پستی کے راستہ پر جا رہا تھا، اور ضمیر جتنا بے حس اور مردہ ہو گیا تھا، اس کے پیش نظر یہ بات نہ مقامی حکام سے بعید تھی، نہ عام پبلک سے، میں آپ کو اس سلسلہ میں بڑی حد تک مظلوم بھی سمجھتا ہوں کہ آپ کو انتظامیہ کے ذمہ داروں نے بالارادہ یا بلا ارادہ بہت بدنام کیا، ہندوستان کی پبلک جو ہمیشہ سے محبت کی قدردان بلکہ پرستار رہی ہے، آپ کو اس ملک کی نہ صرف سب سے بڑی با اختیار ہستی سمجھتی ہے، بلکہ آپ سے توقع رکھتی ہے کہ آپ اس کے حق میں ایک شفیق ماں بھی ثابت ہوں، اور بہت سے وجوہ سے ان کی یہ توقع حق بجانب ہے، کاش کہ آپ ان معصوم بچوں اور بے زبان عورتوں کی آہیں سن سکتیں جن کے بہت سے ناکردہ گناہ اعزہ اور سرپرست جیلوں میں ہیں، اور ان کی کوئی شنوائی نہیں۔

ادھر تقریباً ۶ مہینے سے جب سے کہ نس بندی پر عمل کرانے کی مہم شروع ہوئی ہے، صورت حال اور زیادہ خراب ہو گئی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ تک صحیح حالات و واقعات پہونچنے نہیں دیئے جاتے، ورنہ آپ اس صورت حال کو کسی طرح باقی رہنے کی اجازت نہ دیتیں، صورت یہ ہے کہ آپ کے منشاء و مقاصد کے خلاف ریاستی حکومتوں نے اس قانون کے نفاذ اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کو اپنے اقتدار کی بقا اور سرخ روئی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا ہے، اور اس میدان میں وہ ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں، اور اس سلسلہ میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو کسی زخم خوردہ انتظامی ذہنیت رکھنے والی غیر ملکی حکومت اور اس کے ایجنٹوں کے ذریعہ کسی ملک کے پُرامن شہریوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ سارا ملک ایک کیمپ میں تبدیل ہو گیا ہے، خوف و ہراس کی ایک فضا قائم ہے، لوگ اپنی مقصد براری کے لئے اور اپنا اپنا نس بندی

www.abulhasanalinadwi.org

کا کوٹہ پورا کرنے کے لئے نہایت ذلیل بلکہ وحشیانہ حرکتیں کر رہے ہیں جس طرح جنگل کے جانوروں اور چڑیوں کا شکار کھیلا جاتا ہے' اس طرح غریب مزدوری کرنے والوں' دیہاتیوں اور شاگرد پیشہ لوگوں کو پکڑا جاتا ہے' اور پیسے کی لالچ دے کر یا دھمکا کر یا پھسلا کر اپنا حساب پورا کیا جاتا ہے' تجارتوں کے لائسنس باقی رکھنے یا نئے لائسنس لینے حتیٰ کہ روزمرہ کی اشیاء کے حصول کے لئے بھی اس کی شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ دکاندار یا خریدار نس بندی کے اتنے کیس لائے' ملازمین کا طبقہ جو حکومت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے' اور جو ابھی تک مطمئن اور ملک میں سب سے زیادہ باعزت سمجھا جاتا تھا' سب سے زیادہ پریشان ہے' تعلیمی اسٹاف جو نئی نسل کی تربیت کرنے والا ہے' بے چینی اور سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہے' ہر مجلس کا یہی موضوع سخن بنا ہوا ہے' اور ہر شخص پریشان نظر آتا ہے۔

اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ وہ اخلاقی گراوٹ ہے جو لالچ یا خوف سے ایک ایسے ملک میں پیدا ہو سکتی ہے' جس میں تعلیم و تربیت کی پہلے بھی کمی تھی' اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اہل ملک اس خودداری و خوداعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے جا رہے ہیں جو آزادی کی تحریک کانگریس و خلافت کی جدوجہد' گاندھی جی' مولانا آزاد' علی برادران' نہرو خاندان اور ہمارے قابل احترام سیاسی رہنماؤں کی کوششوں سے بڑی قربانیوں سے اس ملک میں پیدا ہوئی تھی' سارا ملک اپنے کو غلام' بے بس اور ذلیل محسوس کر رہا ہے' اور اس کو شاید ہی کسی وقت یہ محسوس ہوتا ہو کہ یہ ایک آزاد جمہوری ملک ہے' جو ہر قسم کے جبر و تشدد سے محفوظ' اور جس نے اس جدوجہد کے ذریعہ جس کی نظیر دوسرے ملکوں کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے' اپنے کو بدیشی حکومت کی غلامی سے آزاد کرایا ہے' اور اب وہ اپنی مرضی کے مطابق اس ملک کا نظم و نسق چلا رہا ہے'

www.abulhasanalinadwi.org

آپ سے زیادہ اس خودداری وخود اعتمادی کی قدر کرنے والا، اس کی حفاظت کی ضرورت سمجھنے والا، اور ہر قیمت پر اس کو باقی رکھنے والا مشکل سے ملے گا، اس لئے کہ اس کے حصول میں آپ کے خاندان کا بنیادی حصہ ہے اور آپ نے اس پودے کو اپنے خون پسینہ سے سینچا ہے، آپ اپنی قیادت کے زمانہ میں اور اپنی آنکھوں کے سامنے اس پودے کو مرجھاتا اور جلتا ہوا نہیں دیکھ سکتیں، اس وقت ملک کی بہت جلد خبر لینے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر کوئی قوم بزدلانہ اور غلامانہ سیرت اختیار کرلے، اس کے اندر سے خودداری، بلند حوصلگی اور اخلاقی جرأت کے صفات نکل جائیں، وہ پیسے کی خاطر یا ڈر و دھونس سے بالکل اپنی مرضی کے خلاف ہر کام کرسکے، وہ یہ سمجھنے لگے کہ ہر قیمت پر زندہ رہنا، ملازمت، عہدہ کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور اس میں ضمیر، اصول، غیرت وخودداری کا کوئی سوال نہیں تو پھر وہ ملک خواہ سیاسی، اقتصادی، اور تعلیمی حیثیت سے کتنا ہی ترقی کرجائے خوش ہونے کی بات نہیں ہے کہ ہر ملک، قوم سے ہے، قوم ملک سے نہیں، اور قوم اپنی سیرت، اندرونی صفات، خودداری اور اخلاقی جرأت سے ہے، معیار زندگی کے بلند ہوجانے، اور وسائل معیشت کے حاصل ہوجانے سے نہیں

میں نے آپ کا بہت وقت لیا لیکن مجھے اس تڑپ نے اس پر مجبور کیا کہ عرصہ بعد ہندوستان میں ایک احد قیادت وجود میں آئی ہے، اور قدرت نے آپ کو ملک کی ترقی وتعمیر اور اس کو عزت واستحکام دینے کا ایک ایسا نادر موقعہ مہیا کیا ہے، جو شاذونادر ہی کسی کو ملتا ہے، اگر یہ موقعہ کسی طرح ضائع ہوگیا، اور اعتماد ونیک نامی، خوش آئند توقعات کے اس قیمتی ذخیرہ میں، نادان دوستوں کی دوستی سے کچھ کمی واقع ہوگئی، جو تقریباً ایک صدی کی جدوجہد نے آپ کو عطا کیا ہے، اور جس سے آپ کو بہت کام لینا ہے

www.abulhasanalinadwi.org

تو یہ ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی' اس ذخیرہ کو آپ کو بڑی احتیاط سے خرچ کرنا چاہئے کہ یہ تین پشتوں کا جمع کیا ہوا ہے' اور یہ روز روز جمع نہیں ہوتا' اس موقعہ پر آپ ہی کی قوت فیصلہ' بروقت قیادت' سچی حب الوطنی اور حالات کا صحیح و بے لاگ جائزہ ملک کو بچا سکتا ہے' اور اس کو مایوسی' شکستہ دلی' اور خوف و ہراس کے اس دلدل سے نکال سکتا ہے' جس میں وہ اس وقت دھنستا چلا جا رہا ہے۔

میں ایک بار پھر اس درازنفسی کی معافی چاہتا ہوں۔

آپ کا مخلص

ابوالحسن علی

دائرہ شاہ علم اللہ' تکیہ کلاں۔ رائے بریلی

پرائم منسٹر خط پڑھ چکیں تو میں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا' پہلے میں نے ان کے خاندان سے واقفیت کا ذکر کیا' میں نے کہا کہ میں نے آپ کے دادا پنڈت موتی لال نہرو کو بھی دیکھا ہے' اور امین آباد پارک میں ان کی تقریر سنی ہے۔

پھر میں نے ایمرجنسی نے سارے ملک میں دہشت کی جو فضا پیدا کر دی ہے' اس کا نقشہ کھینچا (جس سے یقیناً وہ ناواقف نہیں تھیں) اور اس سے کانگریس کے وقار' اس کے قائدین کی قربانیوں اور خود ان کی ساکھ کو جو نقصان پہونچ رہا ہے' اور لوگوں میں اس سے جو یاس و ہراس پیدا ہو رہا ہے' اس کا ذکر کیا' میں نے کہا کہ آزادی کی کسی تحریک' جدوجہد اور اس کے قائدین کی ناکامی کے لئے اس سے بڑی بات نہیں ہو سکتی کہ لوگ غلامی کے زمانہ کو یاد کرنے لگیں' میں نے کہا کہ ہم سب کے لئے یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ لوگ اب برملا انگریزوں کے زمانہ کو یاد کرتے ہیں' اور اس کی آرزو

www.abulhasanalinadwi.org

کرنے لگے ہیں، میں نے سلسلۂ گفتگو میں بعض معمر مسلمان قائدین کی گرفتاری کا ذکر کیا، اور کہا کہ یہ بات کس طرح باور کی جاسکتی ہے کہ وہ نھلنے اور ڈاک خانہ میں آگ لگانے کی دعوت دے رہے ہوں۔

یہ گفتگو غالباً آدھ گھنٹہ، پون گھنٹہ تک جاری رہی، انھوں نے کہا مولانا صاحب! پھر یہ بتایئے کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو جس سے ہزاروں مسائل پیدا ہوتے ہیں، کس طرح قابو میں کیا جائے؟ میں نے کہا کہ پہلے تو یہ غیر معتدل (ABNORMAL) فضا ختم کی جائے، جس میں کسی مسئلہ پر ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے غور کرنا ممکن نہیں، پھر اس مسئلہ پر ملک کے دانشوروں اور بہی خواہوں کا ایک سیمینار بلایا جائے' اور غور کیا جائے' اس عرصہ میں ان کو بعض اہم اشخاص کی آمد اور ملاقات کے وقت کی اطلاع دی گئی، انھوں نے اشارہ سے روک دیا، میں نے جب محسوس کیا کہ میں اپنی بات پوری طرح کہہ چکا ہوں، اور مزید طوالت کی ضرورت نہیں تو میں نے خود ہی ان سے اجازت لی۔

میں گفتگو ختم کرکے نظام الدین واپس آیا اور وہ رات دہلی میں گزار کر اگلے دن سہارن پور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، رمضان کی رویت ثابت نہیں ہوئی تھی، لیکن حضرت اور اکثر مہمان روزہ سے تھے، میں نے ملاقات کی، سفر کی روداد اور گفتگو کا خلاصہ سنایا جس سے شیخ مسرور ہوئے، اگلے دن جب میں سہارن پور سے لکھنؤ پہونچا اور لکھنؤ اسٹیشن پر اترا تو اچانک معلوم ہوا،

www.abulhasanalinadwi.org

کہ ہمارے دیرینہ رفیق اور ہندوستان میں قرآنیات کے ممتاز فاضل مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی (شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے جو عرصہ سے علیل چلے آرہے تھے، کل جان جان آفریں کے سپرد کی اور اس وقت مجھے اسٹیشن سے سیدھے عیش باغ (لکھنؤ کا مشہور قبرستان) جانا ہے، جہاں ان کی تدفین ہوگی، یہ رمضان المبارک کی پہلی اور اگست کی ۲۸ تاریخ تھی[1]۔

میں جب اگلے دن لکھنؤ سے رائے بریلی پہونچا تو غالباً اس کے اگلے روز محمد یونس خاں صاحب رائے بریلی پہونچے، وہ غالباً پرائم منسٹر کے ایماء سے آئے تھے، وہ بڑے اخلاق اور تپاک سے ملے، موجودہ حالات پر گفتگو بھی ہوئی، اتفاق سے اس دن سلطان پور کے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا وفد بھی آیا تھا، جو وہاں کے حکام کی زیادتی کی شکایت ساتھ لایا تھا، میں نے یونس خاں صاحب کو اس کی طرف بھی متوجہ کیا، ان کی آمد کا کوئی خاص مقصد و محرک معلوم نہیں ہوا، یہ ایک اخلاقی اور سوشل ملاقات تھی، یا اس کا کوئی سیاسی مقصد تھا، اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔

ایمرجنسی کا خاتمہ اور اس سے اخذ کردہ چند نتائج

انیس ۱۹ مہینے (۱۵ر جون ۱۹۷۵ء سے ۱۸ر جنوری ۱۹۷۷ء تک) قائم رہنے والی ایمرجنسی کے خاتمہ کا اعلان ہوا اور لوگوں نے آزادی اور اطمینان کی سانس لی، اس ایمرجنسی سے ہر صاحب نظر دو نتیجے نکال سکتا تھا۔

(۱) ہندوستان کے شہریوں میں سخت حالات، ناپسندیدہ واقعات اور پابندی و مجبوری

[1] مولانا پر میرا مفصل مضمون "پرانے چراغ" حصہ دوم میں ملاحظہ ہو ص ۲۴۶-۲۶۵

www.abulhasanalinadwi.org

کی کیفیت برداشت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے، بشرطیکہ ان کو اپنا کاروبار کرنے، کھانے کمانے کی آزادی حاصل ہو، اس ایمرجنسی کا (جو انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا) اہل ملک پر وہ ردّ عمل نہیں ہوا جس کی توقع کی جاتی تھی، اور جس سے کم درجہ کی صورت حال پر کسی دوسرے جمہوری ملک میں اگر انقلاب نہیں تو کم سے کم شدید قسم کا ہیجان اور ہنگامہ ہو سکتا تھا، اس صورت حال کے خلاف اگر کھلی بے چینی اور علانیہ ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوا، تو وہ بھی زیادہ تر مسلمان حلقوں میں جو نس بندی کو مذہبی طور پر بھی غلط اور جبریہ کارروائی سمجھتے تھے، اور ترکمان دروازہ کی خانہ ویرانی اور متعدد مقامات پر نس بندی کے سلسلہ میں زیادہ تر تشدّد کا وہی نشانہ بنے تھے، لوک دل کے رہنما چودھری چرن سنگھ نے (جو جنتا گورنمنٹ میں کچھ عرصہ تک ہندوستان کے وزیر اعظم بھی رہے) اپنی رہائی کے بعد ایک موقعہ پر اپنے ہم مذہبوں اور پارٹی والوں سے کہا کہ ہم لوگ گرفتار کئے گئے، اور تم لوگوں نے انگلی تک نہیں ہلائی تم سے زیادہ ہمت و غیرت کا ثبوت تو مسلمانوں نے دیا، ملک کی مخالف سیاسی پارٹیوں نے بھی کوئی بڑا ملک گیر مظاہرہ نہیں کیا، نہ کابینہ کے سینیر ممبران اور سرد و گرم آزمودہ ممبران پارلیمنٹ نے اس پر اس طاقت سے اظہار ناراضگی کیا جس کی توقع تھی، یہ وہ لوگ تھے جو آزادی کی جنگ میں شریک ہو چکے تھے[۱]۔

(۲) ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ انتظامیہ میں اچانک مستعدی

---

[۱] ملی کنونشن دہلی منعقدہ ۳۰؍ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے افتتاحی خطبہ میں میں نے کہا کہ "مسلمانوں کی ہمت اور قلندرانہ جرأت نے اس سیاسی صورت حال کے تبدیل کرنے میں بڑی مدد کی جو ۱۹ مہینے قائم رہی"۔

www.abulhasanalinadwi.org

اور فرض شناسی آگئی، ریلیں (جن کا معمول کے مطابق نہ چلنا معمول بن گیا تھا) وقت پر چلنے لگیں، جرائم بھی کم ہو گئے، اس سے لوگوں نے یہ تکلیف دہ اور افسوسناک نتیجہ نکالا کہ ملک کا انتظامیہ اسی حالت میں چوکس ہو سکتا ہے، اور لوگ اپنے فرائض ادا کر سکتے ہیں، جب ان کو سزا کا خوف یا کسی سخت گیر حکومت کا سامنا ہو، یہ کسی آزاد جمہوری ملک کے لئے کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہو سکتی کہ وہ صرف سخت گیری اور مطلق العنانی ہی سے نظم وضبط کا مظاہرہ کر سکتا ہے، اس میں خود احساس فرض، شہری زندگی کا شعور (CIVIC SENSE) قانون کا احترام اور اپنے ہم وطنوں کی مدد اور ہمدردی کا جذبہ نہیں ہے، جو ایک تربیت یافتہ، باشعور اور صاحبِ ضمیر ملک اور قوم کی خصوصیت ہوتی ہے۔

ان دو حقیقتوں کی کسی قدر وضاحت اور ثبوت کے لئے میں اپنا ذاتی تجربہ لکھتا ہوں، ۱۵ / جون ۱۹۷۵ء کو میں تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ لکھنؤ میں اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ محب مکرم ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے (جو ہومیو پیتھک کے ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں) آکر کہا کہ مجھے ایک پولیس آفیسر نے جو میرے زیر علاج ہیں، پرائیوٹ طور پر بتایا ہے کہ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہو گئی ہے (اس وقت تک اخبارات میں خبر نہیں آئی تھی) میرا پروگرام اس دن رائے بریلی جانے کا تھا، مجھے اپنے ساتھ وہ کتابیں بھی لے جانی تھیں جو کثیر تعداد میں مرکز کے قیام میں جمع ہو گئی تھیں، اور بلاد عربیہ کے سفر میں ہدیۃً ملی تھیں، مجھے خیال ہوا کہ ٹرین کا سفر مخدوش ہے، ممکن ہے کہیں گاڑی روک لی جائے، یا پٹری اکھاڑی جائے اور یہ قیمتی ذخیرہ تلف ہو، مجھے رائے بریلی سے جانا تھا، جو سہ پہر کو لکھنؤ سے روانہ ہوتی ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

اور وہ عرصہ سے رائے بریلی لیٹ پہونچ رہی تھی، اور لوگ اس کے عادی ہوگئے تھے، میں نے دارالعلوم کی جیپ کرایہ پر لی اور کتابوں کے ساتھ روانہ ہوا، امین آباد کے چوراہے پر پہونچا تو دیکھا کہ بالکل سناٹا ہے کوئی ہنگامہ نہیں، چارباغ ریلوے اسٹیشن پہونچا تو وہاں بھی خاموشی تھی نہ کوئی نعرہ تھا نہ جھنڈا نہ جلوس، میں نے کہا "سب خیریت ہے" رائے بریلی پہونچا تو معلوم ہوا آج ہی ٹرین صحیح وقت پر آئی، راستہ میں زنجیر کھینچے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی، جو روزانہ کا معمول بن گیا تھا، مجھے اس کا افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ زحمت اٹھائی اور زاید مصارف برداشت کئے۔

اس سے ملک و قوم کے مزاج کا اندازہ ہوگیا، صرف یہی گاڑی نہیں بلکہ مہینوں تک سب گاڑیاں وقت پر چلتی اور پہونچتی رہیں، لیکن ایمرجنسی کی مدت میں جتنی طوالت ہوتی گئی باقاعدگی اور انضباط کی یہ کیفیت کم ہوتی گئی، اور انتظامیہ اور سرکاری محکموں میں ڈھیلا پن شروع ہوگیا، عوام کے ذہن پر سے بھی ایمرجنسی کا رعب اور خوف کم ہوتا چلا گیا، اندازہ ہے کہ اگر اس مدت میں اور طوالت ہوتی تو زندگی اپنے سابقہ معمول پر آجاتی اور پھر کسی اور قسم کی ایمرجنسی لگانے یا اس شکنجہ کو اور زیادہ کسے بغیر کام نہ چلتا، یہ صورت حال اور یہ مزاجی کیفیت کسی محب وطن اور کسی حقیقت پسند کے لئے کسی حال میں اطمینان بخش اور باعث عزت نہیں ہوسکتی۔

۱۹۷۷ء کا جنرل الیکشن، اس کے نتائج اور اندراجی کی ہماری قیام گاہ پر آمد

ایمرجنسی کے خاتمہ پر جنرل الیکشن کا اعلان ہوا، اندراجی حسب معمول رائے بریلی کے حلقہ سے کھڑی ہوئیں حسب سابق راج نرائن ان کے حریف تھے، انتخاب کا نتیجہ

www.abulhasanalinadwi.org

وہی نکلا جس کی توقع کی جاتی تھی اور جو ایمرجنسی اور نس بندی کے اجراء کا قدرتی ردِ عمل تھا، جو ایک ایسی قوم میں ہونا چاہئے تھا، جو نہ اس کے لئے اخلاقی اور شعوری طور پر تیار کی گئی تھی، اور نہ یہ ملک کا حقیقی مسئلہ اور ضرورت تھی، اس جنرل الیکشن میں اندرا جی رائے بریلی کے حلقہ سے کھڑی ہوئیں اور سنجے گاندھی امیٹھی کے حلقہ سے، (۲۲ مارچ ۱۹۷۷ء کو) دونوں کو کھلی شکست کا سامنا کرنا پڑا، اور اس کے اظہار میں کوئی حرج نہیں کہ ان دونوں حلقوں کے لوگوں نے عام طور پر اس پر مسرت محسوس کی، الیکشن کے نتیجہ میں جنتا حکومت قائم ہوگئی۔

کچھ عرصہ تک اندرا جی اپنے حلقہ میں نہیں آئیں، پھر لوگوں کے مشورہ سے اپنے اس پرانے حلقہ سے رابطہ قائم کرنے، پرانے تعلق کو تازہ کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے انھوں نے رائے بریلی کے دورہ کا پروگرام بنایا، ۱۳۹۷ھ کی عید کا دوسرا دن تھا، اور غالباً ۱۶ ستمبر ۱۹۷۷ء کی تاریخ تھی، مجھ سے عید ملنے کے لئے مولانا ابواللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی[1]، مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم، اے ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مددگار ناظم دارالمصنفین آئے ہوئے تھے، میں مغرب کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ شہر کے ایک خاں صاحب جو شہر کی سیاست اور انتخابات میں نمایاں حصہ لیتے تھے، میرے پاس آئے اور کہا کہ اندرا جی آپ سے ملنے آرہی ہیں، میں نے کہا کہ اگر آپ اس پروگرام کو ملتوی کرا سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی کہ میں اس میدان کا آدمی نہیں، انھوں نے کہا کہ جب تک آپ اپنے

---

[1] اس زمانہ میں مولانا کے بجائے مولوی محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بنگلہ پہونچیں گے، وہ آچکی ہوں گی۔

یہی ہوا کہ میں جب اپنی بیٹھک میں پہونچا تو کاروں اور جیپوں کا ایک کارواں دروازہ تک آگیا تھا، میں نے ان کا استقبال کیا، پہلے مولانا ابواللیث صاحب کا تعارف کرایا جو ایمرجنسی کے زمانہ میں جیل کاٹ کر آئے تھے، سید صباح الدین صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب سے بھی تعارف ہوا، غالباً ان کو یہ توقع نہ ہوگی کہ اتنی اہم شخصیتیں اس موقعہ پر موجود ہوں گی، ان کے ساتھ کملا پتی ترپاٹھی سابق وزیر اعلیٰ یو۔پی، نرائن دت تیواری.... وزیر اعلیٰ یو۔پی اور محسنہ قدوائی صاحبہ بھی تھیں، میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک طرح سے مظلوم سمجھتا ہوں کہ لوگوں نے حقائق و واقعات کو آپ کی نظر سے اوجھل رکھا، اور آپ کو ملک کے صحیح حالات اور لوگوں کے جذبات کا علم نہ ہونے پایا اور نوبت یہاں تک پہونچی، محسنہ قدوائی صاحبہ نے کہا کہ آپ اندراجی کے لئے دعا کیجئے! میں نے کہا کہ میں ہر اس شخص کے لئے دعا کرتا ہوں جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہونچے، اور وہ اس کا بے لوث خدمت گذار ہو، میں نے چائے کی پیش کش کی تو انھوں نے کچھ تامل کیا، میں نے کہا کہ فقیروں کے یہاں جا کر کچھ کھائے پیئے بغیر واپس ہونے کا طریقہ نہیں، انھوں نے منظور کیا، تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ اور محسنہ قدوائی گھر کے اندر گئیں تاکہ مستورات کو بھی سلام کریں، ان کی آمد سن کر گرد و پیش کے مردوں اور عورتوں کا بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، ان سب نے ان کے درشن کئے، تھوڑی دیر کے بعد یہ جلوس یہاں سے واپس گیا، اس کے بعد سے تادم تحریر میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

جنتا گورنمنٹ اور اس کا خاتمہ

۱۹۷۷ء کے انتخاب کے نتیجہ میں ہندوستان میں جنتا حکومت قائم ہوئی، جو صرف سوا دو سال

www.abulhasanalinadwi.org

(اپریل ۱۹۷۷ء۔ اگست ۱۹۷۹ء) چل سکی اس حکومت نے جس کے ارکان ملک کے چیدہ رہنما اور تجربہ کار سیاست دان تھے، اور جن کے ہاتھوں میں بڑے طویل انتظار بلکہ ایک طرح کی مایوسی کے بعد ملک کی باگ ڈور آئی تھی، اور جو اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ کانگریس اب بھی ملک کی سب سے مضبوط اور عوامی پارٹی ہے، اور ذرا سی غفلت یا کمزوری سے اندراجی کے برسر اقتدار آنے کا پورا امکان ہے، اپنی موقعہ شناسی، بیدار مغزی، مستحکم اتحاد و اعتماد اور حکومت کرنے کی اہلیت کا ثبوت نہیں دیا، جو ایسے کابینہ کو دینا چاہئے تھا جس نے بڑے نازک حالات میں ملک کی زمام اقتدار سنبھالی تھی، یہ مختلف پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک معجون مرکّب تھا، جس کے اجزاء میں پیوستگی اور یکسنگی نہیں پیدا ہو سکی تھی، ان میں وزارت عظمیٰ کے لئے بھی کشمکش تھی، اقرباء نوازی (NEPOTISM) اور اپنے خاندان اور اہل تعلق کو فائدہ پہونچانے کے مرض سے بھی وہ محفوظ نہیں تھے، ان میں اُس چوکسی، جفاکشی اور مہم جوئی کی بھی کمی تھی جو عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے، انتظامیہ کو چوکس بنانے، ملک سے برائیوں کو دور کرنے اور فسادات کے سدّباب کے لئے درکار تھی، بالآخر ۱۹۸۰ء کے جنرل الیکشن میں اس حکومت کا خاتمہ ہوا اور کانگریس آئی پھر برسر اقتدار آگئی۔

جنتا پارٹی کے چند رہنماؤں سے میری ایک دلچسپ گفتگو

جنتا پارٹی کے چند چوٹی کے لیڈر، (جن میں سے بعض اہم وزارتوں پر بھی فائز رہ چکے تھے) کسی خوش فہمی کی بناء پر ایک مرتبہ چارٹر پلین سے لکھنؤ مجھ سے ملنے آئے ان میں سے بعض نے اپنے زمانہ حکومت میں اپنی حقیقت پسندی اور اس فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا،

www.abulhasanalinadwi.org

جس کی ان سے اپنی پارٹی سے تعلق اور اس کے سابقہ تجربات کی بناء پر امید نہیں تھی، میں نے ان کو اس کی داد دی، لیکن میں نے ان کو الف لیلہ (ARABIAN NIGHTS) کا وہ قصہ یاد دلایا جس میں بغداد کے ایک ذہین اور ماہر نفسیات قاضی نے ایک ایسے شخص کو اس کا مال دلا دیا تھا جس سے وہ شخص (جس کے پاس وہ امانتہً رکھا گیا تھا) صاف انکار کر چکا تھا، قصہ یہ ہے کہ بغداد کے ایک شخص نے محاذ جنگ پر جاتے ہوئے اپنا عمر بھر کا اندوختہ بغداد کے ایک معزز و معتبر شخص کے پاس امانتہً رکھ دیا اور کہا کہ اگر میں زندہ سلامت واپس آیا تو خود لے لوں گا، ورنہ میرے ورثا کو پہونچا دیا جائے، وہ جب کچھ عرصہ بعد صحیح سلامت واپس آیا تو ان صاحب کے پاس گیا اور اپنا تعارف کرایا اور امانت واپس لینی چاہی، انھوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور کہا کب اور کس نے امانت رکھوائی تھی، مجھے یاد نہیں، اگر کوئی گواہ یا تحریری ثبوت ہو تو پیش کیا جائے، رقم کے مالک نے صرف اعتبار پر اس میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، وہ اپنا سا منہ لے کر واپس آیا، اور قاضی صاحب کے پاس گیا، قاضی صاحب نے کہا تھوڑا صبر کرو میں انتظام کرتا ہوں۔

قاضی صاحب نے کسی مجلس میں اس کا تذکرہ کیا کہ فلاں صاحب کو دربار خلافت سے ایک بڑا عہدہ ملنے والا ہے، دستور کے مطابق یہ بات راز میں نہ رہ سکی اور شہر میں چرچا ہو گیا، چند دن کے بعد قاضی صاحب نے رقم کے مالک سے کہا اب جاؤ وہ خود ہی امانت واپس کر دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسے ہی ان معزز بزرگ کی اس پر نظر پڑی پکار کر کہا کہ اے بھائی! آپ کہاں تھے، آپ نے اپنا پتہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میں آپ کو بلاتا، آپ فلاں وقت آئے تھے، آپ کی ہانڈی اس طرح کی تھی؟ جائیے، آپ کی امانت فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے، اپنی امانت اپنی تحویل میں کر لیجئے! ان کو اپنی امانت بے کم و کاست مل گئی، انھوں نے یا کسی اور نے

www.abulhasanalinadwi.org

قاضی صاحب سے پوچھا کہ آپ نے کیا ترکیب کی کہ انھوں نے نگلا ہوا لقمہ اگل دیا؟ انھوں نے کہا جب کسی کو بڑی چیز مل جاتی ہے، یا اس پر اعتماد کیا جاتا ہے تو چھوٹی چیز اس کی نظر سے گر جاتی ہے، ان صاحب کو جب معلوم ہوا کہ مجھے اتنا بڑا عہدہ ملنے والا ہے تو اب ہانڈی اور اس کی اشرفیوں کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رہی، ان کو یہ خطرہ بھی پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں یہ خبر ان کے عہدہ پر سرفرازی میں خلل انداز نہ ہو۔

میں نے ان حضرات سے کہا کہ آپ کو جب خدا نے اتنے بڑے ملک کی حکومت دی تھی، اور قوم نے آپ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا، تو آپ کو چھوٹی چھوٹی باتوں (اعزہ پروری، اقربا نوازی، عہدوں کے لئے کشمکش اور وزارت عظمیٰ کا خواب دیکھنے) سے بلند ہو جانا چاہئے تھا، آپ کو یہ بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ آپ کی حریف جماعت ہر وقت آپ کو اقتدار سے محروم کرنے کی کوشش میں ہے، اور اس کی جڑیں ملک میں گہری اور پھیلی ہوئی ہیں، آپ نے ایک بڑے زرّیں موقعہ کو کھو دیا، اور اس ملک کی خدمت اور اس کو ان خرابیوں اور ان کمزوریوں سے محفوظ کرنے کی فرصت ضائع کر دی جن کی آپ کو اور ملک کے دانشوروں کو سابقہ حکومت سے شکایت تھی، انھوں نے میری اس بات کا جواب نہیں دیا، غالباً ان کے ضمیر نے اس بات کو تسلیم کیا کہ میری بات کسی حد تک واقعیت پر مبنی ہے، یہ حضرات دو بار مجھ سے ملے، اور میں نے بے تکلف اپنے تاثرات واحساسات کا اظہار کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب دہم[۱]

مغربِ اقصیٰ (مراکش) اور نئی دنیا (امریکا) کے سفر

جدّہ سے رباط

عجیب اتفاق ہے کہ بدنامی کی حد تک میری جہاں نوردی اور سیاحی کے باوجود اور اس حال میں کہ ۱۹۶۳ء میں (جیسا کہ کتاب کی پہلی جلد میں گذر چکا ہے) اسپین کے سفر کی بھی سعادت نصیب ہوئی، افریقہ کی شمالی و مغربی پٹی جو طرابلس (لیبیا) سے شروع ہو کر طنجہ تک چلی جاتی ہے ہمیشہ چھُٹی رہی، ملک حسن ثانی شاہ مراکش نے ایک مرتبہ بڑے اصرار سے مراکش آنے اور رمضان المبارک کی ان خصوصی مجالس میں جس میں وہ خود بڑے اہتمام سے شرکت کرتے ہیں، شرکت کے لئے دعوت دی، لیکن میں نے اپنے یہاں کے رمضان کے معمول کی بناء پر معذرت کر دی، اب خدا نے اس سفر کی خود ایک مناسب تقریب پیدا کر دی، اور میرے لئے کوئی عذر نہیں رہا۔

میں کئی سال سے رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (ISLAMIC UNIVERSITIES FEDERATION) کا ممبر تھا، ۱۱، ۱۲، ۱۳ مئی ۱۹۷۶ء کی تاریخوں میں اس کا جلسہ رباط میں ہونا طے پایا، اس کے سکریٹریٹ نے مجھے اس کا دعوت نامہ ہندوستان بھیجا[۱]

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن میں اس وقت حجاز مقدس میں تھا، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ محمد صالح القزاز کے پاس بھی اس کا دعوت نامہ آیا وہ اپنی ایک دوسری مصروفیت کی بناء پر اس کی شرکت سے معذور تھے، انھوں نے مجھے اپنے بجائے اس کانفرنس میں رابطہ کا نمائندہ منتخب کردیا، اس طرح میں دوطرف سے اس میں شرکت کا پابند ہوگیا، شیخ صالح قزاز نے میرے اور میرے رفیق سفر مولوی محمد رابع ندوی کے سفر کے سب انتظامات مکمل کردیئے، اور مجھے مدینہ طیبہ اس کی اطلاع کی جہاں میں ان دنوں مقیم تھا، میرے لئے اس کا امکان تھا کہ میں قاہرہ کے راستہ یہ سفر اختیار کروں لیکن مجھے اس پٹی سے سفر کرنے کا شوق تھا، جس پر طرابلس، تونس، الجزائر کے وہ تاریخی مقامات پڑتے ہیں، جہاں میرا کبھی جانا نہیں ہوا تھا، کم سے کم راستہ سے گذرنا ہو جائے گا، اور ہوائی اڈہ اور ہوائی جہاز سے ایک "طائرانہ نظر" پڑجائیگی۔

۶ر مئی ۱۹۷۶ء کو صبح سعودی طیارہ سے الدار البیضاء (CASABLANCA) کے لئے روانگی ہوئی، اسی جہاز پر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا وفد (شیخ الجامعہ شیخ عبدالمحسن بن عباد کی قیادت میں) اور مشہور اخوانی مفکر ہمارے قدیم دوست شیخ محمد الغزالی تھے، جہاز طرابلس الغرب کے ہوائی اڈہ پر اترا، لیکن مسافروں کو اترنے کی اجازت نہیں ملی، تونس پر اترنے کی اجازت ملی، الجزائر کے ہوائی اڈہ پر بھی اجازت نہیں ملی، "الدار البیضاء" سفر کی آخری منزل تھی، یہاں ایک رات اور دن قیام رہا، یہیں ——— ایک دعوت میں اپنے فاضل استاد علامہ ڈاکٹر تقی الدین الہلالی سے اچانک ملاقات ہوگئی، یہاں کے مکتبات میں اپنی متعدد تصانیف دیکھیں، ایک مسجد میں ایک نوجوان نے خود مجھ سے پوچھا کیف الشیخ أبو الحسن الندوی میں نے کہا تم ان کو کہاں سے جانتے ہو؟

www.abulhasanalinadwi.org

اس نے کہا "ماذا اخسر العالم" کے ذریعہ! میں نے کہا تم جس سے مخاطب ہو وہی اس کتاب کا مصنّف ہے۔

۷ مئی کو جمعہ مکناس میں پڑھا، یہیں شیخ تقی الدین ہلالی صاحب کا قیام ہے،

۸ مئی کو فاس کا مردم خیز تاریخی شہر دیکھا، جس کی حیثیت اپنی علمی مرکزیت اور تاریخ کے لحاظ سے وہی ہے، جو ہندوستان میں دہلی و لکھنؤ اور پاکستان میں لاہور و ملتان کی ہے۔ اس کی بنیاد سیدی ادریس حسن ثانی نے ۱۹۲ھ میں اپنے فاس (تبر) سے ایک خط کھینچ کر ان الفاظ میں رکھی تھی کہ "اے اللہ اس کو ہمیشہ کے لئے علم و تفقہ کا مرکز بنا دے، جہاں کے باشندے ہمیشہ سنّت و جماعت کے حامل و پابند رہیں" اس لئے اس کا نام فاس پڑ گیا، اور یہ شہر تقریباً بارہ سو (۱۲۰۰) سال سے سرچشمۂ علوم و فنون بنا ہوا ہے، عالم اسلام کی قدیم ترین جامعہ جامع القرویین اسی شہر میں واقع ہے، ہر دور میں کثیر التعداد علماء اور اولیاء یہاں پیدا ہوتے رہے، ہم نے جامع القرویین اور اس کا قیمتی کتب خانہ دیکھا جہاں چھ ہزار (۶۰۰۰) نادر مخطوطات ہیں۔[1]

۱۰ مئی دوشنبہ کو دار السلطنت رباط میں آگئے، متعدد علماء کبار اور عمائد شہر سے ملاقات ہوئی جن میں استاد ابوبکر القادری، ڈاکٹر عبد الکریم خطیب، ڈاکٹر مہدی بنعبود خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اگلے دن ۱۱ مئی سے مؤتمر کا آغاز ہو گیا، جمعیۃ کے فاضل صدر استاد محمد الفاسی (جو ملک حسن کے بھی استاد ہیں) کی عالمانہ تقریر کے بعد کثیر التعداد مندوبین میں سے پانچ نے تقریر کی، ان میں سے ایک راقم سطور بھی تھا۔[2]

---

[1] اس شہر کی مختصر تاریخ اور وجہ تسمیہ مصنف کے سفرنامہ "دو ہفتہ مغرب اقصیٰ (مراکش) میں" ملاحظہ ہو۔ (ص ۲۹-۷۱) [2] مفصل تقریر سفرنامہ میں ملاحظہ ہو۔ ص ۷۵-۷۸

www.abulhasanalinadwi.org

میری تقریر کا محور شیخ سعدیؒ کا یہ شعر تھا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

میں نے عرض کیا کہ یہ معجزہ محض سلبی نہ تھا، ایجابی اور تعمیری تھا، اس نے اگرچند کتب خانوں پر (جو اپنی افادیت کھو چکے تھے) خط نسخ پھیرا تو انسانیت کو اس سے کہیں زیادہ عظیم و وسیع کتب خانے، دانش کدے اور طاقتور عالمگیر علمی تحریک عطا کی جس کی نظیر کسی امت کی تاریخ میں نہیں ملتی، پھر تفصیل سے علوم کی دنیا میں نبوت محمدیؐ نے جو انقلابی کردار ادا کیا اس پر روشنی ڈالی اور عرض کیا کہ اس کے انقلابی کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے انسانی علوم کی متفرق اور بعض اوقات متضاد اکائیوں میں وحدت اور تعاون و اشتراک کا رشتہ پیدا کیا، اس کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے علم سے اشتغال کرنے والوں کو اس ذہنی حصار سے جس میں وہ ہزاروں برس سے محصور تھے، عملی زندگی کے میدان میں نکالا اور ان کو بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی پر آمادہ کیا۔

کانفرنس کے جلسے ۱۳ رمئی تک ہوتے رہے، مندوبین کے اعزاز میں اہم جگہوں پر ضیافتیں اور استقبالیہ جلسے ہوئے، ۱۴ رمئی جمعہ کو وزارۃ الثقافۃ کی طرف سے میری تقریر کا انتظام کیا گیا، تقریر کا عنوان تھا "أزمة العالم الإسلامي الحقيقية" (عالم اسلامی کا حقیقی بحران) رباط ریڈیو نے اس کا اہتمام سے اعلان کیا، وزیر الثقافۃ خود تقریر میں موجود تھے، تعارفی مضمون میں والد صاحب مرحوم کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کا بلند الفاظ میں تذکرہ تھا، تقریر کی روح یہ تھی کہ عالم اسلامی کا اصل خلا اور بحران

www.abulhasanalinadwi.org

محض ایمانی واخلاقی ہے، ایمان سے میری مراد ایمان کا وہ کلامی واعتقادی (CRISIS) مفہوم نہیں جس سے ایک آدمی دائرۂ کفر سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے، اور اس پر اسلام کے احکام جاری ہوتے ہیں، جہاں تک ابتدائی اعتقاد اور بنیادی اسلامی حقیقتوں پر ایمان کا سوال ہے، مسلمان اب بھی دنیا کی ساری قوموں سے فائق ہیں، یہاں میری مراد ایمان کی اس حرارت، عقیدہ کی صلابت اور ایمانی کیفیات سے ہے، جن سے صحابہؓ کے سینے معمور اور ان کے دماغ مخمور تھے، اور اس ایمان سے جو ایک ایسا شعلۂ جوالہ تھا جس نے دنیا کو روشنی اور حرارت سے بھر دیا، اخلاق سے بھی میری مراد ظاہری اخلاق اور معاملات نہیں، اخلاقی استقامت، اصول پسندی اور ذاتی مفادات واغراض پر ملّی مصالح کو ترجیح دینا ہے۔

رباط سے ۱۵؍ مئی کو مراکش کو روانگی ہوئی، جو مغرب اقصیٰ کا قدیم تاریخی شہر اور اسلامی حکومتوں کا مرکز رہا ہے، اور کبھی مغرب اقصیٰ کے بجائے اسی کا نام لیا جاتا ہے، اور اس پورے علاقہ کو مراکو (MOROCCO) کہا جاتا ہے، راستہ میں الدارالبیضاء میں کچھ دیر ٹھہر کر زعیم مغرب علامہ علّال فاسی کے (جن سے قدیم زمانہ سے تعارف اور رابطہ کے جلسوں میں رفاقت رہی تھی، اور سال دو سال پہلے ہی ان کا انتقال ہوا تھا) کے تعزیتی جلسہ میں شرکت کی، میں نے پہلے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا کہ ان کی عملی زندگی کا آغاز ایک عالم دین کی حیثیت سے ہوا، وہ مغرب کے محبوب سیاسی رہنما ہونے سے پہلے جامعۃ القرویین کے فاضل استاد تھے، ان کے اور ہمارے ملک کے ان علمائ کے درمیان بڑی مماثلت پائی جاتی ہے، جنھوں نے اپنے ملک کی تحریک آزادی کی قیادت اور رہنمائی کی، ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے جدید سیاسی

www.abulhasanalinadwi.org

نظاموں اور فلسفوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، اور وہ علم اور زندگی کے قافلہ سے بچھڑنے نہیں پائے تھے، ان کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے علماء و مفکرین سے عام عرب علماء اور دانشوروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف اور باخبر تھے، خاص طور پر وہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی کے بڑے مدّاح اور قائل تھے، اور میں جب بھی ان سے ملا ان کی مجلس حجۃ اللہ البالغۃ کے تذکرہ سے خالی نہیں رہی۔

۱۶ر مئی یکشنبہ کو ہم نے مراکش کے آثار قدیمہ کی سیر کی[1]، جو ایک بڑے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں، اور عالم اسلام کی بڑی قیمتی اور اہم یادگاریں ہیں، ۱۷ر مئی کو شاہی دعوت و ملاقات کا پروگرام تھا، حسن اتفاق کہ ملک حسن ان دنوں مراکش میں مقیم تھے، قصر ملکی میں مہمان ایک مثلث دائرہ میں کھڑے کئے گئے، بادشاہ تشریف لائے اور سلام کیا، صدر جمعیۃ شیخ محمد الفاسی نے ایک ایک کا تعارف کرایا، پھر مجھ کو رفقاء کی طرف سے کہنے کا موقعہ دیا گیا۔

میں نے کہا میں آپ کو عالم اسلام کی طرف سے ایک بہت عزیز پیغام پہونچانے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، وہ یہ کہ آج دنیا کے مسلمان بے چینی سے اس کے منتظر ہیں کہ عالم اسلام کے افق سے کوئی نیا ستارہ طلوع ہو، مسلمان اس وقت ایسے غیر معمولی حالات سے گذر رہے ہیں، جن میں کوئی غیر معمولی ہی قائدانہ شخصیت ان کی مشکل کشائی کر سکتی ہے، جو غیر معمولی قوتِ ایمانی، عزم راسخ اور اخلاص کامل سے متصف ہو اور جو سیاسی اغراض و مفادات سے بلند ہو کر رضائے الٰہی اور خدمت اسلام کا عہد کرے، اس کے لئے آپ کے والد نامدار سلطان محمد الخامس پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سفرنامہ مغرب اقصیٰ ص ۹۲-۹۶-۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

لگی تھیں[1] لیکن ان کو جلد پیام رحیل آگیا، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ سے یہ کام لینا چاہتا ہو، ملک حسن نے برجستہ جوابی تقریر کی جو صحیح اور فصیح عربی میں تھی۔

مراکش سے الدارالبیضاء ایک شب ٹھہر کر ۸ ارمئی کو ہندوستان کے لئے واپسی ہوئی، میں نے وہاں کے زمانہ قیام میں "نحن الآن فی المغرب" کے عنوان سے ایک مضمون لکھنا شروع کیا تھا جس کو اس سے شروع کیا تھا کہ "مجھے سرزمین مغرب کی زیارت کا موقعہ اس وقت ملا جب زندگی کا آفتاب مائل بہ مغرب ہے" پھر وہ باتیں عرض کی گئیں جن سے مغرب اقصیٰ کی حقیقی بازیافت ہوسکتی ہے، اور نئے معرکے اور فتح مندیاں حاصل کی جاسکتی ہیں، میں نے اس مضمون میں اسلامی تمدن کی اہمیت اور زندگی و اسلامیت پر اس کے اثرات واضح کئے (جس کا بہ شدت احساس مجھے ہلٹن کے زمانۂ قیام میں ہوا) اور اس کے سلسلہ میں مغرب اقصیٰ اور اسلامی ممالک کو مجتہدانہ کردار ادا کرنے کی دعوت دی۔

امریکہ کا سفر

امریکہ کے سفر کو میں دینی، دعوتی و تصنیفی زندگی کے لئے ایک حد تک ضروری سمجھتا تھا کہ جو شخص مغربی تہذیب، مغربی معاشرہ اور مغربی نظام فکر پر شروع سے تنقید کرتا رہا ہے، اس کو وہ ملک ضرور دیکھنا چاہیئے، جہاں مغربی تہذیب، علم اور صنعتی ترقی (سائنس اور ٹکنالوجی) اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی ہے، اور جو ساری دنیا پر بلا واسطہ اور بالواسطہ اثر انداز ہو رہا ہے، امریکہ کے سفر کی تحریک کئی مرتبہ پیدا ہوئی، ایک دو سال پہلے ۱۹۷۵ء

---

[1] مغرب کے معتبر لوگوں کے ذریعہ ان کے جو حالات معلوم ہوئے ان سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ایک منفرد اسلامی شخصیت کے مالک اور ایمان و روحانیت کے حامل تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

میں شکاگو میں امام بخاریؒ کی وفات پر ہزار سال گزر جانے کے موقع پر ایک حدیث کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا، اس میں شرکت کی پرزور تحریک ہوئی تھی اور دعوت نامہ آیا تھا، لیکن وہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا، اور بعض دوسری رکاوٹیں بھی وقت پر پیش آگئیں، میں نہیں جاسکا، اب اپریل ۱۹۷۷ء میں امریکہ کی مشہور مسلم تنظیم ایم، ایس، اے M. S. A.

(MUSLIM STUDENTS ASSOCIATION OF AMERICA AND CANADA)

کی طرف سے اس کی سالانہ کانفرنس منعقدہ INDIANA (BLOOMINGTON) میں شرکت کا موقع ملا، جو ۲؍مئی ۱۹۷۷ء سے شروع ہونے والی تھی، اس دعوت نامہ کے ساتھ ایسے شدید تقاضے پر اصرار اور تاکیدی خط اور مخلصانہ سفارشیں اور تائیدیں آئیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگیا، ان میں بڑا حصہ محب عزیز و مکرم پروفیسر انیس احمد صاحب (برادر خورد پروفیسر خورشید احمد صاحب سابق وزیر پاکستان) اور مکرمی مولوی عرفان احمد خاں صاحب سہارن پوری (ایم، اے، علیگ) کے خطوط تھے۔

ادھر اس سفر کی تائید میں ایک شدید طبی ضرورت بلکہ زندگی کا ایک اہم مسئلہ دائیں آنکھ کے کٹر یکٹ کے آپریشن کا بھی تھا جس کی کامیابی پر از سر نو مطالعتی و تصنیفی زندگی کا انحصار تھا، تجربہ کار لوگ بتا چکے تھے کہ ایسے نازک آپریشن کے لئے سب سے موزوں جگہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہی ہے، محترمی مولانا ظفر احمد صاحب انصاری نے خاص طور پر اس پر زور دیا تھا، وہ کہتے تھے، امریکہ سرجری میں برطانیہ سے اتنا ہی آگے ہے، جتنا برطانیہ برصغیر ہند و پاکستان سے، اس پر مستزاد یہ کہ مخدومنا حضرت شیخ الحدیث تاکید و امر کی حد تک جلد آپریشن کرا لینے کی ہدایت فرمارہے تھے، ڈاکٹروں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ اگر اس میں مزید تاخیر کی گئی تو نئی پیچیدگیوں کا اندیشہ ہے، یہ سب چیزیں

www.abulhasanalinadwi.org

امریکہ کے سفر کے فیصلہ اور اس موزوں دعوت کے قبول کر لینے کے حق میں تھیں، اس کی بھی امید تھی کہ اس موقع پر کثیر التعداد مسلمانوں سے جو امریکہ میں مقیم ہیں، اور بظاہر ابھی وہیں رہیں گے، نیز سیکڑوں مسلم و عرب طلبہ و نوجوانوں سے[1] خطاب کرنے اور ملنے کا موقع ملے گا، اور ایک داعی کو ایسا زریں موقع ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔

ایم، ایس، اے کی کانفرنس میں

۲۸ مئی ۷۷ء کو صبح ایر انڈیا کے جہاز سے براہ بمبئی نیویارک کے لئے روانگی ہوئی، اور رات کو ۱۲½ بجے (ہندوستانی وقت کے لحاظ سے دوسرے دن کے دس بجے) نیویارک کے کینیڈی ایرپورٹ پر پہونچنا ہوا، خوش قسمتی سے ہوائی اڈہ ہی پر محمد خورشید صاحب مل گئے، جن کو سید ساجد حسین صاحب نے اس کام کے لئے تکلیف دی تھی، اور وہ ہمارے انتظار میں تھے، وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے، جہاں ہم نے چند گھنٹے آرام کیا، راستہ میں جب معلوم ہوا کہ وہ بالاکوٹ کے رہنے والے ہیں تو سفر کا آدھا تکان جاتا رہا۔

نیویارک چند گھنٹے ٹھہر کر انڈیاناپولس اور وہاں سے بلیومنگٹن روانگی ہوئی، جہاں ایک دن پہلے کانفرنس شروع ہو گئی تھی، یہ اس تنظیم کا چودھواں سالانہ کنونشن تھا، کانفرنس کا چار روزہ پروگرام تھا، ۲۸ مئی کو ساڑھے سات بجے شام کو میری تقریر ہو گئی جس کا

---

[1] اس وقت ایم، ایس، اے کے کل شمالی امریکہ میں چار ہزار ممبر تھے، اس کے اکیس شعبے تھے، صدر دفتر کے علاوہ امریکہ و کناڈا کے مختلف شہروں و علاقوں میں انجمن کی شاخیں تھیں، جن کو (CHAPTER) کہا جاتا ہے، اس وقت یہ CHAPTER ۱۶۰ کی تعداد میں تھے ۱۹۷۷ء میں انجمن کے صدر مسٹر یعقوب مرزا، نائب صدر مسٹر ناظر الدین علی حیدر آبادی اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمود رشدان اردنی تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

موضوع تھا "اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کے مابین تعلقات کی نوعیت" ایک ضمنی تقریر عزیزوں کے لئے بھی ہوئی[1]، ایک تقریر مزید تبصرہ ومشورہ کے انداز میں اور ایک دن درسِ قرآن بھی ہوا۔

شمالی امریکہ اور کنیڈا کا دورہ اور اس کی تقریریں

اس ضروری پروگرام سے فارغ ہو کر ایم، ایس، اے کے نائب صدر ناظر الدین علی صاحب، پروگرام ڈائرکٹر پروفیسر انیس احمد صاحب اور عرفان احمد خاں صاحب نے میرے لئے امریکہ کے مختلف علاقوں کے دورہ کا پروگرام بنایا جو تین ہفتوں پر مشتمل تھا اور آپریشن کا مسئلہ بھی طے کر دیا، اس میں خاص طور پر بھائی انیس احمد صاحب نے دلچسپی لی اور وقت صرف کیا، اور بالآخر دورہ کے اختتام پر فلاڈلفیا میں ڈاکٹر شئے آئی انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر شئے کے ہاتھ سے آپریشن کا ہونا طے کر دیا گیا جس کی تفصیل آگے آئیگی۔

امریکہ کے اس سفر میں شمالی امریکہ وکناڈا کے تقریباً تمام اہم شہر تہذیبی وصنعتی اور تعلیمی مرکز شامل تھے، جہاں مسلمان طلبہ وفضلاء اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ہندوستانی، پاکستانی اور عرب مسلمان معقول تعداد میں مقیم ہیں، یہ پروگرام مین ہاٹن نیویارک سٹی سے شروع ہو کر شکاگو پر ختم ہوا، شمالی امریکہ کے شہروں میں نیویارک، جرسی سٹی فلاڈلفیا، بالٹی مور، بوسٹن، شکاگو، ڈٹرائٹ، سالٹ لیک سٹی، سان فرانسسکو، سان جوزے، لاس انجلس (کیلی فورنیا) اور کناڈا میں سے مونٹریال اور ٹورنٹو دورہ میں شامل تھے، ایم، ایس، اے کے مرتب کردہ پروگرام میں صرف واشنگٹن کا

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "دو مہینے امریکہ میں" از مولوی محمد رابع ندوی ص۷۵-۷۶

www.abulhasanalinadwi.org

اضافہ ہوا، جہاں اس دورہ کے بعد جانا ہوا، اور جہاں کے اسلامی سنٹر کی تقریر اس مجموعہ میں شامل ہے۔

اس دورہ میں عمومی طور پر بیس۲۰ تقریریں ہوئیں جن میں سے اردو عربی تقریروں کی تعداد نصف نصف ہے، اس دورہ میں مصنف کو امریکہ کی پانچ مشہور یونیورسٹیوں، کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) ہارورڈ یونیورسٹی (کیمبرج) ڈٹرائٹ یونیورسٹی (آن آربر) جنوبی کیلی فورنیا یونیورسٹی (لاس انجلس) اور اوٹاہ یونیورسٹی (سالٹ لیک سٹی) میں خطاب کرنے کا موقع ملا، یونائیٹڈ نیشنز نیویارک کی عمارت کے نماز ہال اور ٹورنٹو اور ڈٹرائٹ کی جامع مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ بھی دینا پڑا، ان تقریروں میں تعلیم یافتہ مسلمانوں (اور امریکہ میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہی ہیں) اور ہندوستانی پاکستانی اور عرب نوجوانوں کی بڑی تعداد بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتی تھی، تقریروں کے آخر میں اس ملک اور زمانۂ حال کے رواج کے مطابق سامعین سوالات کرتے تھے، اور اہم درپیش مسائل کے متعلق رہنمائی چاہتے تھے، لوگ بڑی تعداد میں ان تقریروں کو ٹیپ کرتے، اپنے حلقۂ احباب میں ان کو پھیلاتے اور نشر کرتے اور ان کی نقلیں تحفۃً دوستوں کو پیش کرتے تھے۔

ان تقریروں میں سچی اور صاف باتیں کہی گئیں، بے لوث اور بے غرض مشورے دیئے گئے، اپنے مطالعہ اور تجربہ کا نچوڑ پیش کر دیا گیا، جہاں تک مغربی تہذیب اور امریکی تمدن کا تعلق ہے، ان کے بارے میں اس بلند سطح سے گفتگو کی گئی جو قرآن اور اسلام اپنے ایک پیرو اور ایک سچے طالب علم کو عطا کرتا ہے، اور جس پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے کو پرانی اور نئی دنیا ایک بے حقیقت سراب اور اس کی چمک دمک جھوٹے نگوں کی آب و تاب نظر آتی ہے، اس میں مقرر کی ذہانت و قوت مطالعہ، دور بینی اور دروں بینی کو دخل نہیں

www.abulhasanalinadwi.org

اس تعلیم اور پیغام کی تعریف ہے، جو اپنے ماننے والے کو پہاڑ کی اس چوٹی پر کھڑا کر دیتا ہے جہاں سے ساری دنیا اس کو زیرِ قدم نظر آتی ہے، اس کی آنکھوں کا زنگار دور ہو جاتا ہے اور اس کو ہر شے اپنی صحیح حقیقت میں نظر آنے لگتی ہے۔[1]

تقریروں کے خلاصے دینے کی اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ ان کا مجموعہ اردو، عربی، انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، ان تقریروں میں دو چیزوں پر خاص طور پر زور دیا گیا، ایک مغربی تہذیب پر تنقید، اس کی ناکامی اور اس کے پیدا کئے ہوئے مسائل و مشکلات کی وضاحت، دوسرے امریکہ کے مقیم مسلمانوں کو اپنے مقام اور پیغام اور شخصیت کی حفاظت کی تاکید اور اس سلسلہ میں اندیشوں اور امیدوں کا اظہار اور شورے چند عنوانات سے ان تقریروں کی روح اور مزاج کا کسی قدر اندازہ ہوگا۔

۱۔ امریکہ اور مغربی تہذیب کو سامنے رکھتے ہوئے جو تقریریں کی گئیں ان کے اہم نکات یہ تھے، امریکہ میں مشینوں کی بہار، علم وصنعت کی ترقی اور آدمیت کا زوال نظر آتا ہے۔

اس خطۂ زمین کو دینِ فطرت کی نعمت ملتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی، امریکہ بیک وقت بد قسمت اور خوش قسمت ملک ہے، خوش قسمت اس وجہ سے کہ خدا نے اس کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا، عظیم توانائیاں اور وسائل عطا فرمائے، بد قسمت اس لئے کہ اس کو دینِ صحیح کی نعمت نہیں ملی، اور جس طرح اس نے مادیات کی طرف توجہ کی اخلاقیات کی طرف توجہ نہیں کی، اس موقعہ پر کہا گیا کہ اگر سوال کیا جائے کہ مغرب کے لئے مناسب ترین

---

[1] اس دورہ کی مفصل روئیداد اور دلچسپ اور پُراز معلومات سفرنامہ مصنف کے خواہرزادہ اور رفیقِ سفر مولوی سید محمد رابع ندوی کے قلم سے "دو مہینے نئی دنیا (امریکہ) میں" میں ملاحظہ ہو جو "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مذہب کون سا تھا اور نامناسب ترین مذہب کون سا' تو اس کا حقیقت پسندانہ اور بےلاگ جواب یہ تھا کہ اس کے لئے مناسب ترین مذہب اسلام تھا اور نامناسب ترین عیسائیت' لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ اس نے اس مذہب کا انتخاب کیا جو بتاتا ہے کہ انسان پیدائشی گنہگار ہے' وہ انسان کے اندر مایوسی پیدا کرتا ہے' اس کی انسانیت پر دھبہ لگاتا ہے' جس مذہب کی تاریخ میں بہت جلد رہبانیت اور ترک دنیا کا رجحان پیدا ہو گیا، اور کلیسا نے علم و عقل کی راہ روکی اور احتساب کی عدالتیں (INQUISITIONS) قائم کیں' جن کا نشانہ بننے والوں کی تعداد گذشتہ جنگ عظیم کے مقتولین کی تعداد سے کم نہیں ہے' اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پوری دنیا کا رخ یکسر مادیات کی طرف ہو گیا، اور اس کے اندر ایک مذہب سے نہیں بلکہ مطلق مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور ایک طرح کا کینہ اور انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا، یہ بھی بتایا گیا کہ مغربی تہذیب نے اپنا عمل پورا کر لیا ہے' اور اس کا زوال شروع ہو گیا ہے' یہ بھی کہا گیا، امریکہ کی کوششیں اور فیاضیاں ضائع ہو رہی ہیں' اور وہ سخت خطروں سے دوچار ہے' اس لئے کہ جن قوموں اور ملکوں کی مدد کرتا ہے' وہ اس کے نہ مخلص ہیں نہ شکرگذار بلکہ اس کے مصائب سے خوش ہوتے ہیں' اس لئے کہ یہ امداد اور فیاضی خلوص سے خالی اور سوداگری ہے۔

امریکہ کے مقیم مسلمانوں سے جو خطابات ہوئے اس میں کہا گیا کہ اس سے خبردار رہئے کہ کوئی امریکی یا یورپی اسلام پیدا ہو جائے' تقریریں بتایا گیا کہ اسلام کو ایک خاص موسم' آب و ہوا اور متعین درجۂ حرارت و برودت (TEMPERATURE) کی بھی ضرورت ہے' اسلام بیک وقت عقیدہ و عمل' معاملات و اخلاق' جذبہ و شعور کا حامل ہے' اور ایک خاص طرح کا ذوق بھی ہے' ایسا ذوق جو انسان کا احاطہ کر لیتا ہے' اور اُسے

www.abulhasanalinadwi.org

ایک نئے طرز میں ڈھال دیتا ہے۔

امریکہ میں قیام کرنے والے دوستوں سے کہا گیا کہ ہر ترقی پر ایمان کی سلامتی کو ترجیح دیجئے اور اپنی آئندہ نسل کے ایمان کی طرف سے اطمینان حاصل کیجئے، اگر وہ خطرہ میں ہو تو آپ کے لئے ایک دن یہاں رہنا جائز نہیں، اگر آپ کو یہ اطمینان ہے کہ آپ یہاں اپنی زندگی اللہ کے منشا کے مطابق گذار سکتے ہیں، اور آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ اپنا ایمان بھی بچا رہے ہیں، اور اپنے بچوں کا مستقبل بھی، تو آپ کا یہاں رہنا نہ صرف جائز بلکہ مفید و مبارک بھی ہو سکتا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے حوالہ سے ایمان پر زندگی اور موت کی قیمت اور اس سے محرومی پر وعیدیں اور خطرات کا صفائی سے ذکر کیا گیا، بچوں کی دینی تعلیم و تربیت، اس کے لئے مکاتب و مدارس اور مناسب ماحول کے قیام پر زور دیا گیا، اپنی حفاظت اور ترقی کے لئے رضائے الٰہی کو اصل قرار دینے، اپنے دل کی بیٹری کو چارج کرتے رہنے، نماز و دعا کے اہتمام، سلف صالحین سے حسن ظن رکھنے اور حسب مراتب ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی اور بتایا گیا کہ امریکہ کی اس یاجوجی فضا میں بھی ولایت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے، اور بڑے سے بڑے روحانی مرتبہ پر پہونچا جا سکتا ہے۔

خواتین کو بھی جن کی مردوں سے علیحدہ نشست کا انتظام کیا جاتا تھا مخلصانہ مشورے دیئے گئے۔ ان کو امکانی حد تک اسلامی معاشرت اختیار کرنے اور اسلامی زندگی کے آداب اور حدود کی حفاظت کرنے کی تاکید کی گئی، اور بتایا گیا کہ ازدواجی و خانگی زندگی بھی اسلام کی نظر میں ایک عبادت ہے، یہ بھی کہا گیا کہ مغربی تہذیب کو پر سکون خانگی زندگی کی تلاش ہے، آپ اس ملک میں اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرت کا

www.abulhasanalinadwi.org

ایسا نمونہ پیش کرسکتی ہیں، جو یہاں کی سوسائٹی کے لئے جو زندگی سے عاجز آچکی ہے، جس کا خاندانی شیرازہ بکھر رہا ہے، اور عائلی نظام احتضار کی کیفیت سے دوچار ہے دل کش ثابت ہوسکتا ہے، اور ان کے لئے اسلام کی طرف باعث کشش ہوسکتا ہے۔

ان تقریروں کا مجموعہ "نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں" جب چھپا اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے (جو مستقل طور پر مدینہ طیبہ میں مقیم تھے) یہ تقریریں پڑھواکر سنیں تو مجھے خط لکھا کہ:۔

"آپ کی امریکہ کی تقریریں بہت پسند آئیں بڑے غور سے سنا، مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اہل امریکہ کے اس سے متاثر ہونے کی کیا صورت ہے، آپ نے لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کردی اور نیازمندوں نے چند نسخے چھاپ دیئے، میری تو رائے ہے کہ جتنی زیادہ سے زیادہ اس کی انگریزی، عربی میں طباعت کی صورت ہوسکے بہتر ہے، اس کی اشاعت کی بہت زیادہ ضرورت ہے، اگر آپ کے ذہن میں اس کی کوئی صورت ہو تو ضرور لکھیں، میرا تو یہ خیال ہے کہ اہل خیر کو متوجہ کرکے ایک لاکھ کے قریب نسخے انگریزی، عربی، اردو کے خوب تقسیم کئے جائیں، اگر لکھنؤ میں اردو میں چھپے تو ایک ہزار میرے ہیں[1]، جو پڑتے ہوں وہ بھیج دوں گا۔"

حضرت شیخ کی جو نہ صرف اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء و محدثین میں تھے، بلکہ بلند پایہ صاحب باطن و صاحب نظر بزرگوں میں بھی تھے، یہ پسندیدگی ایک سند کا درجہ رکھتی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر اور تقریریں کس درجہ میں مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔

---

[1] دوسرے مکتوب میں جو ۲۱ رمئی ۱۹۷۸ء کا لکھا ہوا ہے، مطلوبہ نسخوں کی تعداد دو ہزار کردی گئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

آنکھ کے آپریشن کے بارے میں تردد اور بالآخر فیصلہ

امریکہ میں اس وقت آنکھ کے دو ممتاز ترین آئی سرجن تھے، ان میں سے ایک ڈاکٹر مامنی DR. MAMANY بالٹی مور میں، دوسرا ڈاکٹر شئے DR. SCHEIE فلاڈلفیا میں، اول الذکر یہودی تھے اور ثانی الذکر عیسائی اور مذہبیت پسند، دوستوں کی رائے آپریشن کے لئے اسی ثانی الذکر سرجن سے ہوئی[1]، انھوں نے آنکھ کا معائنہ کرنے کے بعد یکم جولائی کی تاریخ مقرر کی، میں جب اپنے دورہ سے واپس آیا اور عزیزی ڈاکٹر احمد مطیع صدیقی کے مکان "ندوہ ووڈ میر نیویارک" میں جون کی آخری تاریخوں میں قیام رہا تو آپریشن کے بارے میں اتنا سخت تردد پیدا ہوا جو زندگی کے کم مسائل میں کبھی پیدا ہوا ہوگا، وجہ یہ تھی کہ سارا انحصار اسی دائیں آنکھ پر تھا، خیال ہوتا تھا کہ اگرچہ ماہر سرجن نے معائنہ کے بعد اطمینان ظاہر کیا ہے، لیکن بہرحال انسان کا اندازہ صحیح بھی ہو سکتا ہے غلط بھی، اگر خدانخواستہ دوسری شکل پیش آئی تو امریکہ سے ہندوستان تک کا سفر کس طرح ہو سکے گا، اور تنہا محمد رابع سلمہ اپنے نابینا ساتھی کو کس طرح وطن پہونچا سکیں گے، شاید کسی مسئلہ میں عمر بھر استخارہ کی اتنی نمازیں نہ پڑھی ہوں گی جتنی اس بارے میں، ایک طے شدہ معاملہ کو منسوخ کرانا بھی جبکہ اسپتال کو تحریر بھی دی جا چکی تھی کہ مریض سارے نتائج برداشت کرنے کے لئے تیار ہے، آسان نہ تھا، آخر میں یہ صورت سمجھ میں آئی کہ ٹیلی فون کے ذریعہ حضرت شیخ سے رجوع کیا جائے جو اس وقت کرمیں مقیم تھے؛

---

[1] ہندوستان سے روانگی کے موقعہ پر متعدد دوستوں نے جن میں مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کسی یہودی سرجن سے آپریشن کرانے سے سختی سے منع کیا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اوران سے اپنا یہ تردُّد اور واپسی کی مشکلات بتائی جائیں، غالباً وہ آپریشن کو ملتوی رکھنے کا مشورہ دیں گے اور مجھے ایک عذر ہاتھ آ جائے گا۔

لیکن اس آپریشن کا ہونا عند اللہ مقدّر تھا، اور مبارک بھی، اس لئے بڑی کوششوں کے باوجود بھی حجاز سے ٹیلی فونی رابطہ قائم نہ ہوسکا، ڈاکٹر مطیع نے بتایا کہ تین لائنیں ہیں، آج پہلی مرتبہ رابطہ قائم کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی، بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت شیخ نے خود ہی یہ خیال کرکے کہ آپریشن کے معاً بعد ہندوستان کا سفر ہوگا اور اس میں احتیاط مشکل ہے، گرامی نامہ تحریر فرمادیا تھا کہ اب میری رائے امریکہ میں آپریشن کرانے کی نہیں، لیکن بالکل تقدیری بات تھی کہ وہ خط اس علم کے باوجود کہ میں امریکہ میں ہوں، کسی خادم نے لکھنؤ کے پتہ پر بھیج دیا، مجھے آپریشن کے بعد ہندوستان پہونچ کر ملا، میرے تردد کے باوجود محبی انیس احمد صاحب کا (جن کے حصہ میں یہ ثواب لکھا ہوا تھا) اصرار تھا کہ آپریشن ضرور کرالیا جائے، ڈاکٹر مطیع کی بھی رائے تھی، اچانک فلاڈلفیا کے سفر (۲۸ رجون) سے ایک دن پہلے قلب میں اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگئی، اور میں نے آپریشن کا فیصلہ کرلیا۔

کامیاب آپریشن

فلاڈلفیا کے اسٹیشن پر پروفیسر انیس احمد صاحب مل گئے، ۲۹ رجون کو آئی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ ہوگیا، آپریشن کے انتظامات اور صحت کے مختلف امتحانات ہوئے اور یکم جولائی کو بنام خدا آپریشن کرالیا گیا، ڈاکٹر شے جس کو من جانب اللہ غریب الوطن مریض سے خاص ہمدردی اور ایک طرح کی دلچسپی پیدا ہوگئی، آپریشن کے نتیجہ سے بہت مطمئن

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، یہ بھی تقدیری بات تھی کہ آپریشن کا فیصلہ کرنے کے بعد میں نے رابطہ عالم اسلامی کے دفتر کے ذریعہ حضرت شیخ کو اپنے آپریشن کی تاریخ کی اطلاع اور دعا کی درخواست کا جو ٹیلیکس بھیجا وہ حضرت کو اس وقت ملا جب مجھے آپریشن تھیٹر میں لے جا رہے تھے، اس وقت مکہ معظمہ میں عشاء کے بعد کا وقت تھا، حضرت شیخ خود بھی دعا کی طرف متوجہ ہو گئے، اور خدام کو اسی وقت حرم شریف بھیج دیا، دوسری طرف لکھنؤ دار العلوم میں آپریشن کی کامیابی کے لئے عزیزی مولوی معین اللہ صاحب نے ختم کا خاص اہتمام کیا تھا، مرکز تبلیغ نظام الدین دہلی میں بھی دعا کا خاص اہتمام کیا گیا، یہ سب خدا کا خاص فضل تھا۔

آپریشن کے موقعہ پر سید ساجد حسین صاحب مقیم نیویارک (فرزند سید ہدایت حسین صاحب سابق ریونیو سکریٹری حکومت یو۔پی وحال معتمد مال ندوۃ العلماء) اور محبی انیس احمد صاحب اسپتال میں موجود تھے، اسپتال میں چھ دن رہنا ضروری تھا، لیکن ڈاکٹر شے نے چھ دن کا مزید اضافہ کیا، اس عرصہ میں ایک عراقی نژاد امریکی دوست استاذ مجدی فوزی خطیب، اور جموں وکشمیر کے جناب عبد الوحید صاحب نے بڑی محبت و رفاقت کا ثبوت دیا، بارہ ۱۲ روز کے قیام کے بعد دوسرے محبین بھی عیادت و خبر گیری کرتے رہے، نیویارک سے سید مظہر حسین صاحب، شکاگو سے عزیزی نشاط صاحب، قاضی افضل بیابانی صاحب، اور فصیح صاحب لکھنوی بذریعہ کار آٹھ سو میل کا فاصلہ طے کر کے آئے، نیویارک سے محمد خورشید صاحب، نیوجرسی سے عزیزی مزمل حسین صدیقی ندوی اور ان کے والد صاحب اور ٹورنٹو سے (جو کینیڈا میں ہے) سمیع اللہ صاحب معہ اپنے صاحبزادگان کے عیادت کے لئے

www.abulhasanalinadwi.org

آئے، یہ من جانب اللہ بات تھی کہ کرے کے پڑوسیوں کو بھی ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا، ایک امریکی خاتون نے اتوار کے روز مجھ سے کہا کہ مسٹر نادوی[1] ہم نے تمہارے لئے آج چرچ میں دعا کی تھی۔

۱۳ر جولائی کو ہسپتال سے چھٹی ملی اور ٹمپل یونیورسٹی کے پاس پارک ٹاؤن نامی بلڈنگ میں سید صفوت علی صاحب خیر آبادی حال پاکستانی کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے یہیں استادی ماسٹر محمد سمیع صاحب صدیقی اپنے دونوں صاحبزادوں ڈاکٹر احمد مطیع اور محمد رضی کے ساتھ آئے۔

شکاگو میں

ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر شے نے آنکھ کا معائنہ کیا، ٹانکے کاٹے، اور میں عزیزی رابع کے ساتھ آرام کا وقفہ گذارنے کے لئے جو دو ہفتے کا تھا، ۲۲ر جولائی کو بذریعہ طیارہ شکاگو گیا، اور وہاں اپنے مخلص دوست سید عظمت اللہ صاحب قادری کے مکان پر قیام کیا، جہاں اپنے گھر کا سا سکون و آرام نصیب ہوا، یہاں محبان گرامی ڈاکٹر عبدالسلام صاحب انصاری، عرفان احمد خاں صاحب، نشاط صاحب، قاضی بیابانی صاحب کی موجودگی نے مسافرت اور مرض کی نقاہت کا احساس نہیں ہونے دیا، یہیں اچانک ایک دن جب میں فجر کی نماز کا وضو کر رہا تھا، نیویارک سے کال آئی، میں نے رسیور کان سے لگایا یہ عزیزی حسن عسکری طارق صاحب کی آواز تھی، انھوں نے بتایا کہ چند گھنٹے پہلے مدینہ طیبہ سے وہ نیویارک پہونچے ہیں، اور

---

[1] امریکن NADWI کا عام طور پر تلفظ اسی طرح کرتے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

چند دن میرے ساتھ رہنے اور رابع سلمہ کی مدد کے لئے پہلی فلائٹ سے شکاگو پہونچ رہے ہیں، اس عزیز و مانوس آواز سے جس میں محبت و خلوص کی گرمی اور مدینہ طیبہ کے ہوا کی عطر بیزی شامل تھی، دل باغ باغ ہوگیا، تھوڑی دیر میں طارق صاحب آگئے اور پھر واپسی کے سفر میں لندن ایرپورٹ تک ساتھ رہے، جہاں سے ان کو اپنی ڈیوٹی پر مدینہ طیبہ پہونچنا تھا[1]، انھیں سے پہلی مرتبہ مولانا محمد سلیم صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کی وفات کی اطلاع ملی" رحمہ اللہ ورفع درجاتہ[2]"

۲ر اگست کو شکاگو سے فلاڈلفیا بذریعہ ہوائی جہاز جانا ہوا، ڈاکٹر شئے نے بقیہ تین ٹانکے نکالے، آپریشن کی کامیابی پر مبارک باد دی، اور ہندوستان واپسی کی اجازت دے دی، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر شئے نے اپنے آپریشن کی فیس نہیں لی، اور اسپتال کے اخراجات میں بھی ممکن رعایت کی، نیویارک میں جہاں چوتھی بار آنا ہوا تھا، دو روز نیویارک ٹھہر کر ۶ر اگست کو ہندوستان کی واپسی کا سفر شروع ہوا اس آپریشن کے انتظامات اور اس کے لئے آمد و رفت میں پروفیسر انیس احمد صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے، انھوں نے جو کچھ کیا وہ ایم، ایس، اے کی طرف سے ان کے مفوضہ فرائض سے بہت زیادہ تھا، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

مراجعت وطن

ایرانڈیا کی نیویارک سے بمبئی تک کی پرواز صرف سترہ گھنٹے کی ہے، راستہ میں

---

[1] طارق صاحب مدینہ طیبہ میں ٹیلی فون انجینیر ہیں۔

[2] مولانا پر مستقل مضمون "پرانے چراغ جلد اول" میں ملاحظہ ہو۔

www.abulhasanalinadwi.org

صرف لندن میں اسٹاپ تھا، لندن ایرپورٹ پر ٹرانزٹ سے ٹیلی فون پر عزیزان محمد سرور لکھنوی، مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی، اور ضیاء بن مولوی عبداللہ عباس ندوی سے بات ہوئی، ساڑھے بارہ بجے ۱۲½ شب میں بمبئی پہونچے، صوفی عبدالرحمٰن صاحب بھائی اسمٰعیل منصوری صاحب، حاجی یعقوب صاحب اور مولوی عبداللہ سورتی ہوائی اڈہ پر آئے، ہم کنکٹنگ فلائٹ سے صبح دہلی پہونچے، اس پُر مسرّت اور بخیریت سفر کی خوشی میں دہلی پہونچ کر صرف اتنا ہی فرق پڑا کہ اپنے حقیقی پھوپھی زاد بھائی سید محمد یامین حسنی کے انتقال کی خبر سنی، امریکہ میں ٹیلی فون سے دنیا کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک بلا تردد بات کی جا سکتی تھی، اور کبھی نہیں سنا کہ لائن خراب ہے، لیکن دہلی میں لکھنؤ سے باوجود کوشش کے رابطہ قائم نہ ہو سکا، شام کی ٹرین سے لکھنؤ روانہ ہوئے اور سہ شنبہ ۹ اگست ۱۹۷۷ء کو بخیر لکھنؤ پہونچے اور یہ دعوتی وطبی سفر کامیابی کے ساتھ ختم ہوا، اور میں نہ صرف آزادی کے ساتھ نقل و حرکت اور سفر بلکہ براہ راست مطالعہ و تحریر کے قابل ہو گیا، اور تقریباً ۱۳-۱۴ سال کے بعد دہلی کے آل انڈیا ملّی کنونشن میں جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منعقد ہوا، میں نے اپنا افتتاحی خطبہ جو تحریری شکل میں تھا، خود پڑھا، اور دوستوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور مبارک باد دی: وللّٰہ الحمد فی الأولیٰ والآخرۃ؛

www.abulhasanalinadwi.org

باب یازدہم

پاکستان کا سفر، اور دو اہم حادثے

رابطہ کی ایشیائی کانفرنس اور پاکستان کا سفر

میرے پاکستان کے سفروں کا سلسلہ (جو مرشد محترم حضرت رائے پوریؒ کے سفر و قیام پاکستان کی وجہ سے کئی سال تک مسلسل ہوتا رہا) ۶۲ء کے بعد[1] سے موقوف ہو گیا، درمیان میں ایک بار ۱۹۶۴ء میں جنیوا سے واپسی پر ڈیڑھ دو دن کراچی قیام رہا، ورنہ عام طور پر سعودی عرب یا یورپ جاتے ہوئے کراچی کے ہوائی اڈہ پر کراچی کے احباب واعزہ سے ملاقات ہو جاتی تھی، اس طرح پاکستان کے سفر میں حقیقت میں ۱۶ برس کا وقفہ ہوا، یہ طویل وقفہ ایک ایسے شخص کے لئے جس کو سال میں دو دو تین تین بار حجاز اور بلاد عربیہ کے دورہ کا اتفاق ہوتا اور جو اس عرصہ میں ۳-۴ بار یورپ اور ایک بار امریکہ کا طویل سفر کر چکا تھا، ایک غیر معمولی اور کسی حد تک غیر متوقع اور خلاف قیاس بات تھی، جس پر پاکستان کے دوستوں اور عزیزوں کو شکایت کا موقعہ اور ناواقف دوستوں کو غیر ضروری

---

[1] ۱۶/اگست ۱۹۶۲ء کو حضرت رائے پوریؒ کی وفات کا واقعہ لاہور میں پیش آیا، یہ سفر جو حضرت کی خدمت میں حاضری کے لئے کئے جاتے تھے، مغربی پاکستان کے چند شہروں تک محدود تھے، کراچی بھی جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

احتیاط کا گمان ہوسکتا تھا، جس شخص نے جزیرۃ العرب، مصر، شام، کویت، ایران، مغرب اقصیٰ اور آخر میں یورپ اور امریکہ کو براہ راست مخاطب کرکے شکوہ و شکایت کا دفتر کھولا، ان کا دینی احتساب کیا، اور ان کو بے لاگ اور بے لوث طریقہ پر مشورے دیئے[1] اس کا پاکستان اور پاکستان کے رہنے والوں کو (جن سے دین، نسل اور تہذیب و معاشرت کے گہرے رشتے ہیں، اور جو بعض حیثیتوں سے سب سے بڑی مسلم مملکت ہے) مسلسل نظر انداز کرنا، یا اس کے لئے وقت نہ نکال سکنا ایک طرح کی ناانصافی اور بے مروتی اور دعوتی و اسلامی نقطۂ نظر سے ایک طرح کی تقصیر اور فرض ناشناسی تھی، لیکن حالات و واقعات اسی طرح پیش آتے رہے، اور یہ سفر ٹلتا رہا، حالانکہ بہت سے ان عرب اور مسلم ممالک کے مقابلہ میں جن کے سامنے مصنف نے بارہا تقریروں میں کلیجہ نکال کر رکھ دیا، اور خون جگر سے لکھی ہوئی تحریریں تصنیفات و رسائل کی شکل میں بار بار پیش کیں، یہ عظیم اسلامی ملک (جس میں ملت اسلامیہ کا عددی حیثیت سے اور اس سے زیادہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے سب سے بڑا خاندان آباد ہے) سیاسی و تہذیبی میدان میں قائدانہ کردار ادا کرسکتا ہے، اور اگر وہ ایک صحیح مسلم معاشرہ اور صحیح اسلامی مملکت کا نمونہ پیش کرے تو نہ صرف دنیا کے حالات پر اثر انداز ہوسکتا ہے بلکہ ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکتا اور باعثِ تقویت بن سکتا ہے۔

---

[1] یہ تقریریں عام طور پر "اسمعی" (سُن) کے عنوان سے عربی میں اور "صاف صاف باتیں" کے عنوان سے اردو اور انگریزی میں شائع ہوئیں، مثلاً اسمعی یا مصر، اسمعی یا سوریا، اسمعی یا زھرۃ الصحراء (کویت) اسمعی یا ایران، حدیث مع الغرب، احادیث صریحۃ فی امریکہ، احادیث صریحۃ مع اخواننا العرب والمسلمین، (خلیج کی عرب ریاستوں کی تقریروں کا مجموعہ)

www.abulhasanalinadwi.org

عربی کی اس قدیم مثل کا کہ کل أمر مرهون بوقته (ہر کام اپنے وقت کے ساتھ اس طرح مربوط و مشروط ہے جیسے رہن رکھا ہوا سامان) پھر ایک بار تجربہ ہوا کہ جون ۱۹۷۸ء کے آخر میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے پہلی ایشیائی کانفرنس کا دعوت نامہ پہونچا، جو ۱۶ جولائی ۱۹۷۸ء سے کراچی میں منعقد ہو رہی تھی، رابطہ کی مجلس تاسیسی کے رکن اور ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے جو پاکستان کا قریبی پڑوسی ہے میری شرکت ہر طرح سے ضروری اور قرین قیاس تھی، خوش قسمتی سے رابطہ کے سکریٹریٹ نے رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے علاوہ جو مجلس تاسیسی کے رکن ہیں، میرے دو عزیز رفیقوں سید محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" اور مولوی اسحاق جلیس ندوی مدیر "تعمیر حیات" کو بھی مدعو کیا۔ مجھے اس سے پہلے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس استشاری میں شرکت کرنی تھی، اس سفر کے رفیق عزیز مولوی معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء تھے مجلس استشاری سے فارغ ہو کر مجھے براہ راست حجاز سے کراچی جانا تھا، میں مولوی معین اللہ صاحب ندوی اور عزیز خلیل الرحمٰن سجاد (فرزند مولانا محمد منظور نعمانی) کی معیت میں جدہ سے کراچی کے لئے روانہ ہوا، اسی جہاز میں شیخ عبدالمحسن بن عباد نائب رئیس جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بھی تھے، کراچی میں رابطہ کے ارکان و مندوبین کا استقبال حکومتی سطح پر ہوا اور انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے، کچھ وقفہ سے مولانا منظور صاحب اور عزیزی محمد میاں بھی پہونچے۔

مولوی اسحاق جلیس ندوی جو اصلاً ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے، اور جن کے پاکستان میں خاندانی روابط اور صحافتی تعارف تھا، ہمارے پہونچنے سے کئی دن پہلے وہاں پہونچ گئے تھے، تاکہ ہمارے اس سفر کو جو عرصۂ دراز کے بعد ہو رہا تھا، اور اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے

www.abulhasanalinadwi.org

جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے اس ملک کی زمام کار ہاتھ میں لی تھی، اور اس کی وجہ سے ملک کو عرصہ کے بعد ایک نیا دینی، اخلاقی اور حقیقت پسندانہ رخ دینے کا موقعہ آیا تھا، زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جا سکے، اور پہلے سے خطابات، مجالس اور دورہ کے وہ پروگرام بنالئے جائیں جن سے تھوڑے وقت میں پاکستان کے مختلف صاحب فکر، با مقصد اور سنجیدہ حلقوں تک بات پہونچائی جا سکے، اور اسلامی رشتہ، مطالعہ و تجربہ، اور بے غرض، شریفانہ جوار و اخوت کا حق ادا کیا جا سکے، مولوی اسحاق صاحب نے جن کو اللہ تعالیٰ نے ممتاز ذہنی صلاحیت عطا فرمائی تھی، کراچی کے عزیزوں اور دوستوں کے مشورے اور تعاون سے بڑی خوبی کے ساتھ یہ فرض انجام دیا، اور جب ہم کانفرنس کے عین آغاز کے موقعہ پر کراچی پہونچے تو یہ پروگرام مرتب اور اخباروں میں شائع ہو چکا تھا۔

رابطہ کی اس کانفرنس کا جو اس کی پہلی ایشیائی کانفرنس تھی، صدر مملکت جنرل ضیاء الحق نے افتتاح کیا، مسٹر اے، کے بروہی جو اس وقت پاکستان کے وزیر قانون و اسلامی امور تھے، میزبان حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے صدر کانفرنس منتخب ہوئے، رابطہ کے سکریٹریٹ کی طرف سے مجھے اور انڈونیشیائی نمائندہ پروفیسر ڈاکٹر رشدی اور فلپائن کے ابوبکر صاحب کو نائب صدر منتخب کیا گیا، عالم اسلام کے مختلف حصوں سے موقر شخصیتیں اور مجلس تاسیسی کے تقریباً تمام اہم ارکان شرکت کے لئے آئے تھے، ہندوستان سے مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب صدر مجلس مشاورت، مولانا محمد اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند اور مولوی محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند بعض اسلامی جرائد کے مدیر اور چند دوسرے علماء ہندوستان سے آئے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

کانفرنس پرسکون فضا اور سنجیدہ ماحول میں منعقد ہوئی، آخری اجلاس کی آخری تقریر میرے سپرد ہوئی، میں نے تقریر کا آغاز ایک عربی، ایک فارسی اور ایک اردو شعر سے کیا، جس میں شرکاء کے مختلف عناصر، ثقافتوں اور زبانوں کا لحاظ تھا، عربی شعر تھا ؎

حمامۃ جرعی حومۃ الجندل اسجعی

فانت بمرأیً من سعاد ومسمع

(اے حومۃ الجندل کے ریگ زار کے کبوتر! اس سے بہتر چہکنے کا کوئی موقعہ نہیں اس لئے کہ سعاد (محبوبہ) قریب ہے وہ دیکھ بھی رہی ہے۔)

میں نے کہا کہ آپ سب اس محفل کے "سعاد" ہی نہیں شعداء ہیں۔

فارسی میں میں نے اقبال کا اور اردو میں امیر مینائی کا شعر پڑھا، اقبال کا شعر تھا ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

امیر مینائی کا شعر تھا ؎

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے

پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

پھر میں نے عرض کیا کہ اس پورے اجلاس کا حاصل اور وہ پیغام جو معزز شرکاء یہاں سے لے کر جائیں گے، اور جو ان کو اپنے اپنے ملک وحالات میں ان کی قائدانہ ذمہ داری اور بحیثیت جانشین رسولؐ (العلماء ورثۃ الأنبیاء) ان کا فرض ان کو یاد دلاتا رہے گا، اس جملہ سے بہتر نہیں ہو سکتا جو فتنۂ ارتداد کے موقعہ پر رسولؐ کے جانشین اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زبان پر جاری ہوا تھا، اور جو ان کے خلافت نبوت کی ذمہ داری کے

www.abulhasanalinadwi.org

احساس کا آئینہ دار اور ان کی غیرت ایمانی اور صدیقیت کا مظہر اور ترجمان تھا، اور جس نے تاریخ کے دھارے کو ایسا بدلا کہ فتنۂ ارتداد کا دھارا فتح و تسخیر بلاد کے سیلاب میں تبدیل ہو گیا، وہ جملہ تھا "أینقص الدین وأنا حیٌّ" (کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی قطع و برید ہو سکتی ہے؟)[1]

عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات

رابطہ کے اجلاس سے فارغ ہو کر جو ۹ جولائی کو ختم ہوا، میں مولوی معین اللہ صاحب اور محمد میاں کے ساتھ قاری رشید الحسن صاحب خطیب جامع مسجد نیوٹاؤن (نبیرۂ نواب سید نور الحسن خاں مرحوم) کے مکان میں منتقل ہو گیا، جو دار العلوم نیوٹاؤن کے احاطہ میں واقع ہے، قاری صاحب میرے بھانجی داماد ہیں، ان کے یہاں گھر کی سی بے تکلفی اور راحت تھی، کراچی چند ہی روز قیام کرنا تھا، ہمارے خاندان کا تقریباً دو تہائی حصہ جس میں زیادہ تر ٹونک اور بھوپال کے اعزّہ ہیں، کراچی میں سکونت پذیر ہے، کراچی کے فاصلے مشہور ہیں، ان میں سے بعض عزیزوں سے ملے ہوئے کئی کئی برس ہو چکے تھے، کراچی کے اس مختصر قیام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی، اور ان اعزّہ، بزرگوں اور بھائیوں سے ملاقات کی گئی، ان میں سے بہت سے عزیزوں نے محمد میاں کا نام ہی نام سنا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا، اس لئے ان سے مل کر عزیزوں کو اور زیادہ خوشی ہوئی۔

قدیم رفیقوں اور دوستوں میں مولانا محمد ناظم صاحب ندوی خاص طور پر

---

[1] اس جملہ میں ان دعویداران نبوت اور علمبرداران ارتداد کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے زکوٰۃ کی فرضیت یا اس کے اسلامی بیت المال میں داخل کرنے سے انکار کیا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

قابلِ ذکر ہیں کہ سالہا سال شب و روز ان کے ساتھ معیت و رفاقت رہی، اور ہم دونوں نے ساتھ پڑھا پڑھایا اور علمی و دینی کام کئے، ان کے علاوہ برادر محترم سید محمد جمیل صاحب سابق اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان بھی عزیزوں سے کم نہیں تھے، اور میرا اس سے پہلے کراچی میں ہمیشہ قیام انھیں کے مکان پر رہا، لکھنؤ کے اور دوسرے احباب و اعزہ کو بھی ہماری موجودگی کا جب علم ہوا (کہ میری رابطہ کی آخری تقریر ٹیلی ویژن پر بھی آئی تھی) تو بڑے شوق و محبت سے نیو ٹاؤن آتے رہے اور ملتے رہے۔

خطابات و مجالس

رابطہ کی کانفرنس سے فراغت کے بعد ان مجالس اور صحبتوں سے خطاب کا سلسلہ شروع ہوا، جن کا پہلے سے پروگرام بن گیا تھا، یا وقت پر ان کی تحریک ہوئی، ان میں پاکستانی قومی اتحاد کے سکریٹری جنرل پروفیسر غفور احمد (وفاقی وزیر صنعت و پیداوار حکومت پاکستان) کی طرف سے دیئے ہوئے ایک استقبالیہ کی تقریر (۹ر جولائی ۱۹۷۸ء) کراچی یونیورسٹی کی تقریر (۱۱ر جولائی ۱۹۷۸ء) دار العلوم کورنگی کراچی (۱۲ر جولائی ۱۹۷۸ء) مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی (۱۳ر جولائی ۱۹۷۸ء) ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر حکیم محمد سعید صاحب کی دعوت پر شام ہمدرد کے جلسہ منعقدہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل (۱۳ر جولائی ۱۹۷۸ء) اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کی طرف سے مقرر کے اعزاز میں منعقد کئے ہوئے ایک استقبالیہ (اسلام آباد ہوٹل) (۱۸ر جولائی ۱۹۷۸ء) جس کی صدارت سپریم کورٹ پاکستان کے چیف جسٹس انوار الحق صاحب نے کی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (۱۸ر جولائی ۱۹۷۸ء) دار العلوم حقانیہ

www.abulhasanalinadwi.org

اکوڑہ خٹک[1] (۱۹ جولائی ۱۹۷۸ء) زرعی یونیورسٹی فیصل آباد (۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء)
جامعہ تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد (۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء) اسلامی جمعیۃ الطلبہ
پنجاب یونیورسٹی لاہور (۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء) قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور،
(۲۶ جولائی ۱۹۷۸ء) محکمۂ اوقاف کے صدر دفتر (۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء) کی تقریریں
شامل ہیں۔[2]

ان تقریروں میں جن میں ممتاز شہریوں، دانشوروں، ماہرین تعلیم، علمائے کبار، صحافیوں، اور سوشل کام کرنے والوں کی بڑی تعداد بالعموم شریک ہوئی، اسلامی تاریخ کے مطالعہ، زندگی کے تجربوں، اپنے محدود فکر و نظر اور اپنے حقیر خلوص کا عطر رکھ دیا گیا، جس کے پیچھے نہ کوئی سیاسی غرض تھی، نہ کسی اچھے بُرے ردّ عمل کی فکر، بقول غالب (ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ)۔

نہ ستائش کی تمنا نہ گلہ کی پروا

ان میں سامعین کے سامنے وہ حقائق رکھے گئے، جن کا ادراک بعض اوقات باہر کا رہنے والا گھر میں رہنے والوں اور ہر وقت کے دیکھنے والوں سے زیادہ کر سکتا ہے کہ ایک خاص روشنی اور ایک خاص درجۂ حرارت و برودت میں رہنے والے اس ماحول کے

---

[1] یہ وہ مقام ہے جہاں سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا عملی آغاز ہوا، اور وہاں ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء) کو مجاہدین اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لشکر کے درمیان پہلی جنگ ہوئی جس میں مجاہدین کو فتح مبین حاصل ہوئی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سیرت سید احمد شہیدؒ" حصہ اول ص ۵۰۰-۵۰۸

[2] ان تقریروں کا مجموعہ "حدیث پاکستان" کے نام سے مجلس نشریات اسلام، کراچی کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہو گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

عادی ہو جاتے ہیں، اور اسی کے زاویہ نظر سے دیکھتے اور سنتے ہیں، ان میں قدر مشترک پاکستانی بھائیوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلانا اور اس بڑے اعلان اور دعوے کی نزاکت اور عظمت کو یاد دلانا تھا جس پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا، اور اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں، اور اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، اس میں اسلامی تاریخ کا یہ مطالعہ اور ملتوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی داستان سے اخذ کیا ہوا یہ نتیجہ خاص طور پر جھلکتا تھا کہ مسلمان طاقتوں، حکومتوں اور معاشروں کو سب سے زیادہ نقصان مسلمان اقتدار پسندوں اور طالع آزماؤں کی نفسانیت اور جاہ طلبی نے پہونچایا ہے ؂

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم
کہ با من انچہ کرد آں آشنا کرد

اس سلسلہ کی سب سے اہم تقریر میں جو پروفیسر غفور صاحب کے دولت خانہ پر اس استقبالیہ میں کی گئی جس میں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما، دینی، تعلیمی، سماجی حلقوں کی نمائندہ شخصیتیں، ممتاز ادیب اور صحافی، اور علمی و دینی حلقہ کے معروف اصحاب کی معتد بہ تعداد موجود تھی، کہا گیا:۔

"آپ کو تین طرح کی قربانیاں دینی ہیں، ہماری ہر قربانی کے لئے ہماری تاریخ میں ایک امام موجود ہے ایک قربانی وہ ہے جو سیدنا خالد بن الولید نے یرموک میں دی تھی کہ ان کو عین میدان جنگ میں معزول کر دیا گیا، لیکن ان کی پیشانی پر شکن نہ آئی، اور انھوں نے کہا کہ اگر میں عمرؓ کے لئے لڑتا تھا، تو اب نہیں لڑوں گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتا تھا تو میرے جوش اور سرگرمی میں

www.abulhasanalinadwi.org

کوئی فرق نہیں آئے گا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کے جوش جہاد اور شوقِ شہادت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دوسری قربانی وہ ہے جو نواسۂ رسولؐ حضرت حسن بن علیؓ نے حضرت معاویہ کے مقابلہ میں خلافت سے دست بردار ہو کر امت کے انتشار کو ختم کرنے کے لئے دی تھی۔

تیسری قربانی وہ ہے جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسلامی مملکت اور معاشرہ کو اسلامی زندگی اور اسلامی سیرت کی راہ پر لگانے کے لئے اپنی زندگی کو بدل کر اور اپنے خاندان کے مفاد سے آنکھیں بند کر کے دی تھی، اب یہ تینوں قربانیاں پاکستان کی ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں۔"

آخر میں کہا گیا کہ موجودہ صدی کو کسی معتصم[۱] کی تلاش ہے، جو اس کی طرح حمیت دینی اور وحدت اسلامی کا مظاہرہ کرے، آپ پورے عالم اسلام بلکہ دنیائے انسانیت کے لئے حق و انصاف اور عدل و مساوات کے لئے پشت پناہ ثابت ہوں، اور دنیا کے کسی گوشہ میں آپ کے اخلاقی اثر اور آپ کے احترام میں کسی پر ظلم نہ ہونے پائے۔

شام ہمدرد کے جلسہ میں جو ایک نہایت شستہ اور شائستہ جلسہ تھا اور لوگ تقریر سننے کے لئے دور و دراز کا سفر کر کے آئے تھے، بتایا گیا کہ مطلق وحدت ملت و انسانیت کی چارہ سازی کے لئے کافی نہیں، اصل چیز وہ نقطۂ اتحاد اور وہ مقصد ہے

---

[۱] خلیفہ معتصم باللہ عباسی (فرزند خلیفہ ہارون الرشید) جس نے یہ اطلاع پاکر کہ ایک مسلمان عورت نے جس پر عیسائی ملک میں ظلم ہوا تھا، اس کے نام کی دہائی دی، اجاجایا دربار چھوڑ کر، اور وصیت نامہ لکھ کر اس کی دادرسی کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس پر یہ وحدت قائم ہوتی ہے، دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ صرف وحشتیں وحشتوں سے نہیں ٹکراتیں، وحدتیں بھی وحدتوں سے ٹکراتی ہیں، اور ان وحدتوں نے جو لسانی، ثقافی، تہذیبی، نسلی، اور وطنی یا سیاسی بنیادوں پر قائم ہوئی ہیں، اب تک زیادہ تر تعمیر کے بجائے تخریب کا کام کیا ہے، اس لئے محض وحدت کوئی معنویت اور افادیت نہیں رکھتی، ابھی تک جس وحدت کا سب سے بہتر تجربہ ہوا ہے، وہ اسلام کی وہ وحدت ہے، جس کی بنیاد اللہ کی وحدانیت کے عقیدہ، نوع انسانی کے احترام، عدل ومساوات کے اصول اور انسانوں کی بے لوث خدمت کے عزم وارادہ پر تھی، پھر اقبال کے اشعار کو کوٹ کرتے ہوئے بتایا کہ احساس برتری اور نشۂ قوت سے انسانیت کی قبا کتنی بار چاک ہوئی، اور عقل ونظر، علم وہنر کس طرح خس وخاشاک کی طرح بہے، آپ کو اپنی وحدت سے تعمیر انسانیت کا کام لینا ہے، اس عصبیّت جاہلیہ سے بچنا ہے جو کبھی زبان یا قدیم تہذیب کے احیاء کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، اور جس میں اسلامی دور سے پہلے کے عظماء (HEROES) اور تہذیب وثقافت کو زندہ کرنے کا نعرہ دیا جاتا ہے اور جس کا پاکستان میں بھی خطرہ ہے، وہ اس ملک کو پارہ پارہ کرکے رکھ دے گا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں عرض کیا گیا کہ عالم اسلام ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے جس شاخ پر ملک وقوم کا نشیمن ہے، وہ شاخ معاشرہ، ملک کی عام زندگی اور شہریوں کا اخلاق اور ان کا کردار ہے، اگر یہ شاخ اس نشیمن کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تو وہ نشیمن ہوا میں معلّق ہے، اور اس کا کوئی اعتبار نہیں، معاشرہ زمین ہے، اور باقی سب باغ وعمارات، اگر یہ زمین قرآن کے الفاظ میں ”کَثِیْباً مَّهِیْلاً“ (ریت کا ٹیلہ) ہے، جو ہر وقت کھسکتا رہتا ہے، اور ہماری سوسائٹی ریگ رواں کی طرح ہے تو پھر

www.abulhasanalinadwi.org

پورا ملک، حکومت، ادارہ، ترقی و تہذیب نقش برآب ہے۔

محکمۂ اوقاف کی تقریر میں کہا گیا کہ دنیا ایک مقدس وقف ہے، اور مسلمان اس کے متولی، خدا کی بستی دکان نہیں ہے، نہ کوئی قمار خانہ ہے، نہ طاقتوروں کی شکارگاہ۔

جامعات کی تقریروں میں مسلم ممالک کے تعلیمی نظام اور تعلیمی مسائل پر گفتگو کی گئی اور بتایا گیا کہ عالم اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منہاج کیا ہونا چاہئے، نظام تعلیم اور دانشگاہوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ امت کو جو عقائد، حقائق و اقدار عزیز ہیں، اور جو ذخیرہ اس کو اپنے اسلاف سے ملا ہے، اس کو وہ قوم کی نئی نسل کی طرف نہ صرف منتقل کرے بلکہ اس کو اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں کر دے، اور اس کو علمی و ذہنی طور پر اس کے لئے قابل قبول بنا دے، اور قلب و دماغ دونوں اس پر مطمئن ہو جائیں، نیز وہ سیرت سازی کا فرض انجام دیں، اور علم آموزی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے "سوز حیات ابدی" بخشیں، اور نسل اسلامی کے ادیبوں، حکیموں اور دانشوروں کو "ضرب کلیمی" عطا کریں، کہ اس کے بغیر نہ سنگ خارا آب ہو سکتا ہے، نہ دریا پایاب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کی تقریر میں اسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی، اور بتایا گیا کہ موجودہ نظام تعلیم نے ملت اسلامیہ کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے، جو نہ صرف ایک دوسرے سے بیگانہ بلکہ نبرد آزما ہیں، اور یہی ان ممالک کی بے چینی، آئے دن کے انقلابات اور حکمراں طبقہ کی توانائیوں کے ضائع ہونے اور بے محل صرف ہونے کا سبب ہے، جو ملت کے سینہ کے ایمانی آبشار سے بجلی اور توانائی پیدا کرنے کے بجائے ہر وقت اس کو روکنے اور سینہ میں گھٹے اور بھچے رہنے پر اصرار کرتا رہتا ہے،

ایک تقریر ادارہ تحقیقات اسلامی (مجمع البحوث الاسلامیہ) اسلام آباد میں

www.abulhasanalinadwi.org

ائمۂ اربعہ اور علمائے سلف کی فقہی و اجتہادی کوششوں اور دنیا کے تمام مشاغل اور دلچسپیوں سے یکسو ہو کر استنباط مسائل اور مذاہب فقہیہ کی تدوین پر اپنی توجہ مرکوز کرنے پر کی گئی، یہ تقریر عربی میں تھی، اس موقعہ پر ادارہ کے کارکن اور ممتاز علماء موجود تھے۔

مدارس عربیہ کی تقریروں میں بتایا گیا کہ عہد حاضر کا چیلنج کیا ہے اور علماء کے کیا فرائض ہیں، سب سے بڑا چیلنج مادیت ہے، اور اس پر غالب آنے کے لئے جو قوت درکار ہے وہ ایمان راسخ، علم عمیق، زہد و قناعت، خودداری و خود اعتمادی ہے، اور یہی وہ ہتھیار ہیں، جن سے اپنے اپنے زمانہ کے علماء نے اپنی عظمت کا سکہ معاشرہ پر بٹھایا، اور بڑے بڑے جبّاروں کی گردن ان کے سامنے جھک گئی، آج بھی ان بوریہ نشینوں کی ضرورت ہے، جو ان صفات سے متّصف ہوں، اس خلا کو جو ہمارے معاشرہ میں اس عنصر کے نہ ہونے سے پیدا ہو گیا ہے، اور جس سے معاشرہ انتشار اور دانشور طبقہ جوع البقر میں مبتلا ہے، ان نائبین رسول ﷺ کے سوا کوئی پُر نہیں کر سکتا جو کتاب و حکمت کے ساتھ "تزکیۂ نفس" کے بھی حامل ہوں، علوم دینیہ کے طلبہ و فضلاء سے کہا گیا کہ انقلاب زمانہ کا شکوہ بے کار ہے، سنن الٰہیہ ناقابل تبدیل ہیں، ان میں ایک نافعیت کا احترام و اعتراف اور نافع کی تلاش و طلب ہے، نافعیت اور صلاحیت و افادیت میں خدا نے تسخیر کی قوت اور مقناطیس کی کشش رکھی ہے، آپ کسی علم میں امتیاز و اختصاص پیدا کریں آنکھوں کا تارا بن جائیں گے۔ ع

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

www.abulhasanalinadwi.org

اخلاص واختصاص (مہارت خصوصی) وہ دو شہپر ہیں جن سے آپ بلند سے بلند فضاؤں میں پرواز کر سکتے ہیں، یہ بھی بتایا گیا کہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے، کوئی ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے، علماء کے طبقہ کو علمی تبحّر، بیدار مغزی قوتِ عمل اور قربانی کی طاقت ہی زندہ رکھ سکتی ہے۔

پاکستان کے اس سفر میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ عزیزی مولوی فضل ربّی ندوی کی کوشش و توجہ سے جنھوں نے ہماری تصنیفات کی اشاعت کے لئے پاکستان میں "نشریات اسلام" کے نام سے ناظم آباد کراچی میں مستقل ادارہ اور مکتبہ ایک ہی دو سال پہلے قائم کیا تھا، میری تصنیفات پاکستان میں خوب پھیل گئی ہیں، اور اہلِ ذوق نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، اکثر جلسوں میں حاضرین خاص طور پر نوجوان کوئی نہ کوئی کتاب لئے کھڑے ہوتے تھے، اور اس پر دستخط کرنے کی فرمائش کرتے تھے، ایک داعی اور خاص فکر و مقصد رکھنے والے مصنف کے لئے یہ بات باعث مسرت ہے، اور مجھے فطری طور پر یہ دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ ان کتابوں کی اشاعت اس ملک میں اتنے وسیع پیمانہ پر ہوئی جتنی شاید ہندوستان میں بھی نہیں ہوئی۔

اہم ملاقاتیں اور ذیلی سفر

پاکستان کے اس دورہ میں خاص طور پر جن حضرات کی معیت و رفاقت رہی اور انھوں نے اس آمد سے جو بہت طویل وقفہ کے بعد ہوئی تھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، ان میں جسٹس افضل چیمہ صاحب (صدر نظریاتی کونسل) مولانا ظفر احمد صاحب انصاری، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب، مولانا سید سباح الدین صاحب کاکاخیل،

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا سمیع الحق صاحب (اکوڑہ خٹک) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک روز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ خاص حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہ نے بھی شرف ملاقات سے نوازا۔

لاہور میں قیام ڈاکٹر منیر صاحب کے مکان پر رہا، ایک روز جسٹس مشتاق صاحب[1] چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ نے بار ایسوسی ایشن میں دعوت دی اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان اور ممتاز قانون دانوں سے نظام شرعی کے اجراء اور اس کی ضرورتوں اور دقتوں پر تبادلۂ خیال ہوا، لاہور کے قیام میں جمعہ کا دن پڑا، اور میں نے اپنے رفقاء کے ساتھ اپنی پرانی درسگاہ اور مرکز عقیدت شیرانوالہ دروازہ کی لائن والی مسجد میں جمعہ ادا کیا، جو حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے درس قرآن اور افادۂ عام کا مرکز رہ چکی ہے، حضرت کے صاحبزادہ مولانا عبیداللہ انور صاحب نے برادرانہ اور محبانہ معاملہ کیا اور ضیافت سے نوازا، اپنے متعدد قدیم دوستوں اور کرم فرماؤں حاجی عبدالواحد صاحب ایم۔ اے، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور مولانا ظفر اقبال صاحب وغیرہ سے ملاقاتیں کرکے پچھلے زمانہ کی یاد تازہ کی، جب مہینوں لاہور رہنا ہوتا تھا، لاہور پہونچکر احساس بھی ہوا اس نے دل میں چٹکی لی کہ عالموں ادیبوں اور دانشوروں کی اس نسل کے (جس سے ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان تعارف ہوا تھا) اکثر افراد حیات مستعار کی مدت پوری کرکے راہی ملک بقا ہوئے۔

بقول عرب شاعر ؎

---

[1] جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے سلسلہ میں وہ تاریخی فیصلہ دیا تھا جس کی گونج پاکستان، ہندوستان میں عرصہ تک سنائی دیتی رہی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اذا زرت ارضا بعد طول اجتنابها

فقدت صدیقی والبلاد کما ھیا [1]

شاہی مسجد، جہانگیر کا قلعہ، علامہ اقبال کے مدفن اور شاہدرہ (جہانگیر کا مقبرہ) جا کر پرانی یادیں تازہ کیں، زبان حال گویا تھی ؎

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ

ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

ایک دن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اصرار پر ان کے دعوتی مرکز ماڈل ٹاؤن میں قرآنیات کے طالب علموں اور شہر کے اہل ذوق کو خطاب کیا، سب سے زیادہ خوشی اپنے دور افتادہ قریبی بھائیوں، برادران عزیز سید احمد الحسنی اور سید ابراہیم حسنی و سید اسحٰق حسنی [2] سے مل کر ہوئی، جو گویا ایک گھر کے افراد تھے، اور جو رائے بریلی اور لکھنؤ میں برسوں ساتھ رہے۔

لاہور آکر وہاں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی سے ان کی بین الاقوامی شخصیت اور ان قدیم روابط کی بناء پر جو ہم دونوں کے درمیان تھے، نہ ملنا میرے مزاج کے خلاف تھا، میں نقی نواب صاحب کے ذریعہ جنھوں نے میرے فیصل آباد سے لاہور آنے کا انتظام کیا تھا، مولانا سے خصوصی ملاقات کا وقت طلب کیا، مولانا نے

---

[1] (جب کسی شہر میں مدت دراز کے بعد آنے کی نوبت آئی تو دیکھا کہ دوست تو ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے اور شہر اسی طرح سے اپنی جگہ پر ہے)   [2] ہمارے خاندان میں حضرت سید احمد شہیدؒ سے نسبی نسبت رکھنے میں یہ تینوں بھائی (سلمہم اللہ تعالیٰ) سب سے بڑھے ہوئے ہیں، ان کے دادا سید اسحٰق صاحب مرحوم سید صاحب کے حقیقی نواسہ تھے، وہ میرے والد صاحب مرحوم کے پھوپھا اور خاندان کے معزز ترین فرد تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

۹-۱۰ بجے دن کا وقت دیا، ہم دونوں تپاک اور گرم جوشی سے ملے، مولانا اپنے گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے نقل و حرکت سے معذور تھے، گفتگو میں جنرل ضیاء الحق صاحب کا ذکر آیا، مولانا نے کہا کہ ان کو کسی طرح ناکام نہیں ہونے دینا چاہئے، میں نے اپنی تحریک "پیام انسانیت" کا تعارف کرایا، جس کو ہم لوگ ہندوستان میں چلا رہے ہیں تو فرمایا کہ (اصلاح معاشرہ کے لئے) اس کی پاکستان میں بھی ضرورت ہے۔

مشہور امریکن نو مسلم فاضلہ اور اہل قلم مریم جمیلہ صاحبہ سے بھی ان کے مکان پر ملاقات کی، ہم دونوں تصنیفات کے ذریعہ ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے، اور ہمارے ان کے بہت سے خیالات میں توارد بھی پایا جاتا تھا، اس مجلس میں ان کے شوہر محمد یوسف خاں صاحب اور ان کے بچے بھی موجود تھے۔

اس دورہ کا سب سے ضروری اور محبوب سفر اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری کے وطن و مدفن ڈھڈیاں ضلع سرگودھا کی حاضری تھی، وہاں دو دن قیام رہا، جو اس پورے سفر کے سب سے خوشگوار اور پُر سکون اور بابرکت دن تھے، برادران گرامی قدر مولانا عبدالجلیل صاحب (برادر زادہ حضرت رائے پوریؒ) اور مولانا حافظ عبدالوحید صاحب (خواہر زادہ حضرت رائے پوریؒ) نے برادرانہ و عزیزانہ برتاؤ کیا، اہل تعلق و اہل سلسلہ بھی برابر آتے رہے، اور ہم لوگ اپنا گھر سمجھ کر بے تکلف رہے، رفقاء میں سے خاص طور پر محمد میاں (محمد الحسنی) مرحوم ان خوشگوار لمحات کو بہت یاد کرتے تھے، جو وہاں گزرے۔

کراچی میں عربی زبان کے محقق و ادیب علامہ عبدالعزیز میمن کی خدمت میں حاضری ہوئی، وہ ملاقات کے خود ہی منتظر و مشتاق تھے، میں نے ان سے جرأت کرکے پوچھا کہ آپ کو

www.abulhasanalinadwi.org

عربی کے کتنے اشعار یاد ہوں گے، چند سکنڈ کے توقف سے فرمایا کہ ۵، ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان۔

چونکہ رمضان مبارک میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا، اس لئے اس دورہ کو مختصر کرکے ہندوستان واپس آنا پڑا، اس سفر میں پشاور جہاں سے ندوی احباب لینے آئے تھے، اور بالاکوٹ نہ جاسکنے کا افسوس رہا، جہاں احباب، خاندان سید احمد شہیدؒ کے نام لیواؤں کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے۔

پاکستان کے قیام کے دوران ہی وہاں کے رہنے والوں کو جن سے دین، نسل، تہذیب و معاشرت کے دوہرے دوہرے اور گہرے گہرے رشتے تھے، اور جن کے صحیح طریق کار اختیار کرنے اور ملک کی سلامت روی سے خود ہندوستانی مسلمانوں کی بہت کچھ عزت و تحفظ وابستہ تھا، اور بحیثیت ایک مسلم مملکت کے بھی اس میں معتدل حالات کا رہنا ضروری تھا، صحیح مشورہ دینے اور ان کے سامنے دین و زندگی کے حقائق رکھنے پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ وہاں سے آنے کے بعد بھی اس کا سلسلہ جاری رہا، خاص طور پر عزیزی محمد میاں نے وہاں کے حالات کے مطالعہ اور واقفیت کی روشنی میں بڑے پُرزور اور فکر انگیز مضامین لکھے جو اکثر "تعمیر حیات" اور "ندائے ملت" میں شائع ہوئے، اور بعض موقر پاکستانی اخبار ول نے بھی نقل کئے، ان کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ پاکستان کے حالات میں اس وقت استقرار قائم رہنا اور دین پسند طبقہ کو ملک کی اصلاح کا موقعہ دینا سب سے ضروری کام ہے، ہر قیمت پر انتشار انگیزی، عجلت و بے صبری اور "کل جدید لذیذ" کے اس فلسفہ سے بچا جائے، جو اکثر مسلمان ملکوں کا مزاج بن گیا ہے، نیز اس نام نہاد جمہوریت اور بار بار انتخابات کا تجربہ نہ کیا جائے، جس کے نتیجہ میں معاشرہ کی مریضانہ ذہنیت، عرصۂ دراز سے قائم شدہ

www.abulhasanalinadwi.org

فاسد نظام تعلیم اور مفسد ذرائع ابلاغ کے اثر سے کسی صالح جماعت کے برسر اقتدار آنے کی امید نہیں کی جا سکتی، اور اس دور کے واپس آجانے کا پورا خطرہ ہے جس سے بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کیا گیا، ان کے ان مضامین کا مجموعہ "نشریات اسلام" ناظم آباد کراچی نے "پاکستان امیدوں اور اندیشوں کے سایہ میں" کے نام سے شائع کر دیا۔

ایک سخت خاندانی حادثہ اور امتحان

سفر پاکستان سے واپسی پر پورا ایک سال نہیں گزرا تھا کہ ۱۴ جون ۱۹۷۹ء کو وہ عظیم حادثہ پیش آیا جس نے دل و دماغ و اعصاب اور ایک چھوٹے سے گھرانہ کی محدود زندگی ہی کو نہیں، میری تمام فکری، علمی اور دعوتی زندگی، کام کے منصوبوں اور مستقبل کے خوابوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا، یہ میرے صحیح معنی میں چشم و چراغ محمد الحسنی عرف محمد میاں کی وفات کا حادثہ تھا، جس کی نوعیت وہی تھی، جو ان کے والد ماجد اور میرے مربی و جانشین پدر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبد العلی صاحبؒ کی وفات کے موقعہ پر پیش آئی، قرآن مجید نے حضرت موسیٰؑ کی دعا نقل کی ہے،

"وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝"[1] (اور دے مجھ کو ایک کام بٹانے والا میرے گھر کا، ہارون میرا بھائی، اس سے بندھا میری کمر، اور شریک کر اس کو میرے کام کا)

لیکن یہ دعائے مقالی تھی جو اللہ نے قبول کی، میری دعائے حالی اور حقیقۃ الامر أخی کے بجائے واجعل لی وزیرا من اهلی محمد بن أخی کہی جا سکتی ہے، میرے ان کے درمیان فکر و ذوق، مزاج و طبیعت، خیالات و افکار، شان تحریر و خط، اسلوب تحریر میں اتنی مماثلت و شباہت تھی، جس کا زیادہ سے زیادہ دو ہستیوں میں کم سے کم میں نے مشاہدہ کیا، غالباً اس کا نتیجہ تھا کہ میں نے لکھنؤ سے سیکڑوں میل دور بمبئی میں جہاں

[1] طٰہٰ - ۲۹-۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

ایک سفر سے واپسی پر میرا قیام تھا، اس رات کو جس کے اگلے دن ان کا انتقال ہوا، خواب دیکھا کہ لکھنؤ کے اسی گھر میں جس میں ہیں اور وہ بھائی صاحب کے سایہ عاطفت میں پلے اور بڑھے تھے، میرا انتقال ہوگیا ہے، اور میں عالم برزخ سے گھر والوں سے ملنے آیا ہوں، اور مجھے پھر وہیں واپس جانا ہے، میں اس کا بھی افسوس کر رہا ہوں کہ میری عمر بہت کم ہوئی، دوسرے ہی روز ان کی وفات کا حادثہ پیش آیا[1]، اور میں جب بمبئی سے ۱۵ر جون کو رائے بریلی پہونچا تو یہاں سب کچھ ہو چکا تھا[2]۔

عربی میں ان کے زور تحریر کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا نہیں چاہتا کہ اس پر مستقل مضمون ان کی معرکۃ الآراء کتاب "الإسلام الممتحن" کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، یہاں پر اس کی چند سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

"عالم عربی کی مذہب بیزار اور اسلام گریز قومی، اشتراکی، بعثی، مادی تحریکوں اور دعوتوں، اور مادہ پرستانہ زندگی نے ان کی طبیعت کے اندر ایک ایسی کشمکش پیدا کر دی جس نے ان کے قلم کو ایسے آبشار میں تبدیل کر دیا، جو چٹانوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ابلتا ہے، اور بڑے جوش اور شور کے ساتھ گرتا ہے، اس کے نتیجہ میں ایسے مضامین ان کے قلم سے نکلے جن میں آبشار کا شور اور طوفان کا زور ہے، شاید بہت سے لوگوں پر یہ بات گراں گزرے اور کچھ پڑھنے والے اس کو مبالغہ اور قرابت کے اثر پر محمول کریں کہ وہ اپنے اس جوش تحریر و زور قلم میں سید قطب شہیدؒ سے آنکھیں ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں،

---

[1] وفات کے وقت ان کی عمر ۴۴ سال تھی۔ [2] محمد میاں پر میرا مستقل مضمون "پرانے چراغ حصہ دوم" میں ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷-۴۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

اور تعجب نہیں (ایک عجمی نژاد نو عمر (محمد میاں) اور ایک عربی الاصل پختہ کار ادیب (سید قطب) کا فرق ذہن میں رکھتے ہوئے) کہیں کہیں ان سے بڑھ جاتے ہوں کہ فوارہ کی روانی اس کے جوش دروں کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہ جوش دروں ان کو اپنے آبائے کرام اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے تعلق و عقیدت سے ملا تھا جس کی نظیر مشرق وسطی میں اگر مفقود نہیں تو قلیل الوجود ضرور ہے۔"

میں نے اس مضمون کو جو "پرانے چراغ" میں شامل ہے، فارسی کے اس شعر پر ختم کیا تھا، اسی کو یہاں دہرایا جاتا ہے کہ حقیقت حال کی عکاسی اور دل کی ترجمانی اس سے بہتر نہیں ہو سکتی ؎

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز
دردہا دادی و درمانی ہنوز

محمد میاں کے انتقال سے نہ صرف میری عربی تحریروں اور تصنیفات کا بہترین مترجم، قومیت عربیہ اور عربوں کی بے راہ روی پر تنقید کرنے والا پُر زور قلم، عربی زبان میں دین کا ایک داعی اور رجز خواں مجاہد، اردو کا ایک اچھا انشاء پرداز اور سوانح نگار نہیں رہا، یہ بھی ایک بڑا خسارہ تھا کہ "تحریک پیام انسانیت" میں میرا قلمی ترجمان اور اس سے سَو فیصدی اتفاق و توارد رکھنے والا رفیق جدا ہو گیا، جس سے ہمیشہ بیش قیمت مدد ملی۔

دوسرا حادثہ

محمد میاں کے بعد اور ان کی موجودگی میں بھی سب سے زیادہ مدد رفیق عزیز مولوی

www.abulhasanalinadwi.org

اسحاق جلیس ندوی سے ملتی تھی، جن پر میں اپنے رفقاء میں سب سے زیادہ اس تحریک کی ترجمانی کے سلسلہ میں اعتماد کر سکتا تھا، اور جو موقعہ و محل کے مناسب بات کرنے اور مخاطبین کے ہر حلقہ کو متاثر کرنے کی وہبی صلاحیت رکھتے تھے، اور جہاں جاتے تھے، لوگ ان کے گرویدہ اور فریفتہ ہو جاتے تھے، وہ بھی اپنے عزیز رفیق اور دوست محمد میاں کے انتقال کے تین ہی ہفتے بعد ۸ رجولائی ۱۹۷۹ء کو راہی ملک بقا ہوئے، اور میں ان کی بھی تدفین میں شریک نہیں ہو سکا، اس جاں گداز تحریر کو دونوں عزیزوں کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تمہیں سو گئے داستاں کہتے کہتے[1]

---

[1] مولانا اسحاق جلیس ندوی کے متعلق مفصل مضمون ملاحظہ ہو "پرانے چراغ حصہ دوم" میں ص ۲۰۱-۲۳۱

www.abulhasanalinadwi.org

باب دوازدہم ۱۲

سعودی سربراہ مملکت اور ذمہ داروں کے نام ایک اہم تحریری یادداشت
حرم شریف کا ناشدنی واقعہ قطر کی سیرت کانفرنس فیصل ایوارڈ

ایک اہم تحریری یادداشت

قارئین کو مصنف کی ان حقیر کوششوں کا علم ہو چکا ہے، جو وہ شروع سے حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب کو اس کے صحیح منصب و مقام پر دیکھنے کی آرزو و تمنا کے اظہار اور ان خطرات کی نشاندہی کے سلسلہ میں کرتا رہا ہے، جو ہر مسلمان کے لئے باعث تشویش ہیں، اس سلسلہ کا آغاز پہلے سفر حج کے موقعہ پر ولی عہد سلطنت امیر سعود بن عبدالعزیز کے نام اس مفصل مکتوب سے ہوا جس کا تذکرہ حصہ اول کے باب دوازدہم ۱۲ میں تفصیل سے آچکا ہے، اور جو بعد میں "بین الجبایۃ والھدایۃ" کے نام سے مستقل رسالہ کی شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے، اس کے بعد ملک فیصل مرحوم سے (جو مملکت کا اصل دماغ تھے) نجی ملاقاتوں اور ان کے نام مفصل خطوط کا سلسلہ ان کی شہادت تک جاری رہا، اس عرصہ میں دوسرے ذمہ داران حکومت، امیر فہد (جو ملک خالد کے جانشین اور سربراہ مملکت ہوئے) ملک خالد، محترم وزیر تعلیم و وزیر حج و اوقاف کے ساتھ مراسلت کا سلسلہ قائم رہا، ان خطوط کا مجموعہ عربی میں "کیف ینظر المسلمون

www.abulhasanalinadwi.org

إلی الحجاز وجزیرۃ العرب" اور اردو میں "حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے' رابطۂ عالم اسلامی و جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کی کمیٹیوں اور کانفرنسوں کے اسٹیج سے بھی نیز مؤتمر الدعوۃ والدعاۃ اور مؤتمر التعلیم کے عالمی اجلاسوں اور نشستوں میں بھی یہ بات مختلف اسلوب و انداز میں کہی جاتی رہی' اور ایک دور افتادہ مسلمان جو مملکت میں کوئی کلیدی عہدہ یا سربراہانِ مملکت پر کوئی ذاتی اثر نہیں رکھتا، اس سے زیادہ کچھ کرنے پر قادر بھی نہیں تھا۔

لیکن مملکت میں مختلف تقریبوں سے سال میں دو تین مرتبہ حاضر ہونے اور کئی کئی ہفتے اور بعض اوقات کئی کئی مہینے قیام کرنے' مملکت کی اہم شخصیتوں اور ہر طبقہ کے ممتاز اشخاص اصحاب فکر اور درد مند شہریوں سے ملنے' ملک سے نکلنے والے اخبارات و رسائل کے مطالعہ اور روزمرہ کے مشاہدات سے مصنف کو وہاں کی زندگی کے حقائق و واقعات کا علم ہوتا رہتا تھا، اور اس کا احساس دن بدن تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا کہ (خواہ اس میں کسی منصوبہ بندی' بیرونی اثر اور سازش کا دخل نہ ہو) مجموعی طور پر ملک و معاشرہ کا رخ تیزی سے بدل رہا ہے' اور اگر حالات کی یہی رفتار رہی تو (خاکم بدہن) وہ دن دور نہیں جب بیت اللہ شریف اور اس کا مقدس ماحول اس ترقی یافتہ زندگی اور معاشرت کے (جس نے اپنے لئے یورپ اور امریکہ کو نمونہ بنایا ہے) سمندر میں ایک جزیرہ بن کر رہ جائے گا، اور ایک ایسی نسل پیدا ہوگی جو ان مقاصد سے جن کے لئے حرم کی تعمیر ہوئی اور اس پیغام سے جس کا وہ نشان و علمبردار ہے' بیگانہ ہو کر رہ جائے گی' اور یہ خلیج (اگر یہ طاقتور عوامل آزادی سے اپنا کام کرتے رہے تو) وسیع سے وسیع اور عمیق سے عمیق تر ہوتی چلی جائے گی' اور صرف حج کا فریضہ اور اس کے مناسک (جن کے

www.abulhasanalinadwi.org

قیامت تک باقی رہنے کا فیصلۂ خداوندی ہے) اور صرف باہر کے مسلم ممالک کے مسلمانوں کا جذبۂ دینی، شوق حضوری، گہوارۂ اسلام اور مولد رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احترام وشوق اور عشق رسولؐ اس کو اسلام اور عالم اسلام سے مربوط رکھے گا، لیکن یہاں کے تہذیبی ومعاشرتی انقلاب، مادی ترقیات، مغرب کی تقلید اور ذرائع ابلاغ کے اثر سے باہر سے آنے والے مسلمان یہاں اپنے ایمان اور دینی جذبہ کو غذا پہونچانے والا، اور ان کے سامنے مثالی اسلامی سیرت ومعاشرت کا نمونہ پیش کرنے والا سامان اور ماحول نہیں پائیں گے جس کی ان دور افتادہ عجمی مسلم ممالک کو ہر وقت ضرورت ہے، اور ان کا غیر اسلامی وعجمی تہذیب ومعاشرت سے ہر وقت واسطہ رہتا ہے، بلکہ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ان مقدس مقامات میں آکر (جن کی خاک کو وہ اپنی آنکھ کا سرمہ بنانے کے آرزومند رہتے ہیں اور جن کے ہر قول وفعل کو وہ سند کا درجہ دیتے ہیں) ایسے تجربات ومشاہدات کا سامنا کرنا پڑے جو ان کے ایمان، جذبۂ اتباع سنت اور مغربی تہذیب کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے عزم میں کچھ خلل اور فتور پیدا کر دیں، اور وہ یہاں آکر الٹی آزمائش میں پڑ جائیں۔

۱۳۹۹ھ (۱۹۷۹ء) میں میں نے اس کی ضرورت سمجھی کہ ذمہ داران مملکت کے سامنے (جن کو اپنی انتظامی مصروفیتوں اور ملک کے سیاسی تقاضوں کی بناء پر اس کا موقعہ نہیں ملتا کہ وہ معاشرہ کا اخلاقی جائزہ لیں) ایک ایسی تحریری یادداشت پیش کی جائے جس میں صرف اشارات اور اصولی باتوں پر اکتفا نہ کی جائے، متعین واقعات اعداد وشمار، اور وقت ومقام کے حوالہ اور تاریخوں کے تعین کے ساتھ ان دوررس اثرات اور تبدیلیوں کا ذکر کیا جائے جو مختلف موثر اداروں اور ذہن وجذبات ڈھالنے والے اور معاشرہ میں نئے رجحانات پیدا کرنے والے ذرائع سے رونما ہو رہے ہیں؛

www.abulhasanalinadwi.org

اور ایک نئے معاشرہ اور نسل کی تشکیل تیزی سے کررہے ہیں، تقدیری بات تھی کہ مجھے ان کمیٹیوں میں شرکت کے سلسلہ میں (جن کا میں رکن ہوں) ۱۹۷۶ء کے ابتدائی سال میں حجاز میں طویل قیام کا موقعہ ملا، اور میں نے اس نقطۂ نظر سے اخبارات کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور ان سے معلومات اکٹھا کئے، باحمیت و باخبر دوستوں، علماء و فضلاء اور متوسط درجہ کے شہریوں سے رابطہ قائم کیا، ان کے تاثرات سُنے، اس موقعہ پر اندرونی و خانگی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو سامنے آئے جن کا علم وادراک ایک غیر ملکی کے لئے دشوار ہے، میں نے اس پورے رکارڈ کو سامنے رکھ کر ایک مفصل تحریر تیار کی جس میں اولاً اس سرزمین مقدس سے اپنے رابطہ کی ابتدا، واقفیت کے ذرائع و مواقع اور مملکت کے بانیوں کے مقاصد وجذبات کے ساتھ ہم آہنگی، جذباتی وذہنی تعلق، اور اس خاندانی ماحول واثرات کا (جن میں اور اس دعوت میں جس پر اس مملکت کا قیام عمل میں آیا بڑا اشتراک تھا) ذکر کیا اور بتایا کہ اس مملکت کے قیام اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے عقیدۂ توحید کی دعوت واشاعت، بے نظیر امن وتحفظ، پانی کی توفیر، رسل ورسائل ومواصلات کی سہولت، غارتگر بدوؤں کی سرکوبی، حجاج کی حفاظت وراحت کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دلایا جس کی نظیر پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس پر ہندوستان کے صحیح العقیدہ اور صاحبِ شعور مسلمانوں نے اور ہمارے بزرگوں، اساتذہ اور شیوخ نے بے پایاں مسرت محسوس کی، اللہ کا شکر ادا کیا، اور اس مملکت کے بانیوں کے حق میں دعائیں کیں، اس کے بعد اچانک وسائل دولت کی فراہمی، داخلی وخارجی حالات کی تیز رفتاری، بے لوث اور عمیق الفکر مشیران سلطنت کی کم یابی اور طویل المیعاد اور گہری منصوبہ بندی کے فقدان سے حکومت کو جن مشکلات اور ملک و معاشرہ کو

www.abulhasanalinadwi.org

جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا، ان کی طرف اشارہ کیا گیا، اور اس کے نتیجہ میں اچانک جو صورت حال پیدا ہوئی اس کی عکاسی کی گئی، اس تبدیلی میں جو ادارے اور ذرائع مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں، ان کو چھ عنوانوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ ذرائع ابلاغ PUBLIC MEDIA جن میں ٹیلی ویژن کو خاص طور پر لیا گیا۔

۲۔ فلمیں اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے کیسٹ۔

۳۔ صحافت (اخبارات و مجلات)۔

۴۔ تعلیم۔ مدارس اور جامعات۔

۵۔ کھیلوں (GAMES) ٹیموں کے مقابلہ اور میچوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ و سرپرستی اور ان کے سلسلہ میں پبلک کی دل چسپی جو جنون کی حد تک پہونچ رہی ہے۔

۶۔ معیار زندگی کی بلندی، سامانِ تعیش کی فراوانی اور تفریحی رجحان۔

اس کے بعد ان میں سے ایک ایک چیز کو لیا گیا، ذرائع ابلاغ اور ٹیلی ویژن کے سلسلہ میں تاریخ و وقت کے تعین کے ساتھ ان پروگراموں اور تماشوں کا حوالہ دیا گیا، جو نوجوانوں میں قبل از وقت جنسی احساس بیدار یا ان کے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کے لئے ایک طاقتور انجکشن یا مہمیز کا کام کرتے ہیں، اس سلسلہ میں بعض امریکی فلموں کا بھی ذکر کیا گیا، جن میں موٹروں کے چرانے اور واردات کرنے کا ڈھنگ بتایا گیا ہے، اور ان کے کارنامے دکھائے گئے ہیں، جن کے نتیجہ میں نوجوانوں اور کم عمر لڑکوں میں جرائم اور واردات کرنے اور ان میں اپنی چابک دستی دکھانے کا شوق پیدا ہو رہا ہے، اسی ضمن میں جاسوسی فلموں کا بھی ذکر کیا گیا، اس سلسلہ میں خود امریکہ میں بعض ماہرین نفسیات و اجتماعیات کے اقوال اور ان کی رپورٹوں کے اقتباسات پیش کئے گئے،

www.abulhasanalinadwi.org

جنھوں نے ٹیلی ویژن کے اس کردار اور سوسائٹی پر اس کے تخریبی اثرات کا بڑی وضاحت وجرأت سے اظہار کیا ہے[1]، ٹیلی ویژن کے حد سے بڑھے ہوئے شوق، اس کے دیکھنے کے انہماک سے معیار تعلیم، طلبہ کی محنت، یکسوئی اور امتحانات کے نتائج پر جو اثر پڑ رہا ہے، اس کی طرف بھی متوجہ کیا گیا، بچوں کے اغوا و قتل کی وارداتوں اور جرائم میں اس سے جو اضافہ ہو رہا ہے، اور قوم کے مردانہ اخلاق و سپاہیانہ زندگی پر (جس میں عرب اپنے دور جاہلیت میں بھی ممتاز تھے) اس کا جو اثر پڑ رہا ہے اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا، اسی طرح فلموں اور مخرب اخلاق کیسٹوں کی زیادتی پر تشویش کا اظہار کیا گیا اور اس کی مثالیں بھی وقت اور مقام کے تعین کے ساتھ دی گئیں، اس سلسلہ میں لباس کے ان نئے ماڈل اور نمونوں کی نمائش پر بھی متوجہ کیا گیا جو غیر صالح رجحانات پیدا کرنے والے ہوتے ہیں، نیز اخبارات کی نیم عریاں تصویروں اور ہیجان انگیز اشتہارات اور شہوانی گانوں کی مقبولیت کا بھی ذکر کیا گیا جن کے کیسٹ آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتے ہیں، اور جس میں ویڈیو (VIDEO) کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

اسی طرح اخبارات و رسائل کے غیر صحت مندانہ رجحانات، دینی حقائق کے ساتھ بعض اوقات استخفاف، تشکیکی مضامین کی اشاعت، بعض ملحد و فاسق شعراء و ادباء کو مثالی شخصیتوں کی حیثیت سے پیش کرنے کے سلسلہ کا ذکر کیا گیا۔

نمبر ۱۲ میں نصاب و نظام تعلیم کی بعض خامیوں، بعض غلط درسی کتابوں، بعض نسوانی مدارس میں معلمات کی بے پردگی اور فیشن پرستی، اعلیٰ تعلیم کے لئے نوجوانوں کا کثرت سے امریکہ جانا اور وزارت تعلیم اور یونیورسٹیوں کا وہاں اپنے طلبہ و فضلاء کو مزید تعلیم حاصل

---

[1] ملاحظہ ہو T. W. ADARNO کی کتاب MASS COMMUNICATION

www.abulhasanalinadwi.org

کرنے کے لئے بھیجنا اور ان کے لئے ایسا ماحول فراہم کرنا جس میں وہ ان جذبات و احساسات سے عاری ہو جائیں جو ان کے لئے سرمایۂ افتخار تھا، اور وہاں کے رنگ میں رنگ جائیں۔

نمبر ۵ میں کھیلوں اور ان کے مقابلہ سے نوجوانوں کا شغف (جو جنون کی حد تک پہونچ گیا ہے) کھیلنے والی ٹیموں کے ساتھ حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ اور اس کی بنا پر گھر گھر تقسیم و محاذ آرائی، میچوں کے اوقات میں نماز و جماعت کا ترک اور ان سے غفلت، بعض امراء و اہل وجاہت کا ان کے ساتھ سرپرستانہ رویہ، اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کی طرف توجہ دلائی گئی۔

چھٹے اور آخری نمبر میں مملکت میں معیار زندگی کے اچانک بلند ہو جانے، افراط زر اور اس سے اشیاء کے نرخ، زمینوں کی قیمت، مکانات کی زیب و زینت اور سب سے زیادہ تشویشناک بات شادیوں میں اسراف، شادی کی شرطیں اور ان کی دعوتوں کے شاہانہ مصارف و مناظر کا ذکر کیا گیا، اور صرف ایک مثال اس کی دی گئی کہ جدہ کے مریڈیان ہوٹل میں ایک رات میں شادی کی تقریب منعقد کرنے کی فیس ایک لاکھ ریال[1] ہے، شادی کی خود ساختہ شرائط، اس کے روز افزوں مطالبات اور اس کی شان شوکت میں مسابقت کا نتیجہ یہ ہے کہ شادی نے معاشرہ میں ایک پیچیدہ مسئلہ اور بحران (CRISIS) کی شکل اختیار کر لی ہے، اس سلسلہ میں ایک نوجوان کے انٹرویو کا ایک اقتباس پیش کیا گیا جو اخبار عکاظ کے ۷ شعبان ۱۳۹۶ھ کے شمارہ میں "ایک نازک اجتماعی مسئلہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اور جس میں یونیورسٹی کے

---

[1] ہندوستانی سکہ کے لحاظ سے تین لاکھ روپیہ ۳۰۰۰۰۰

www.abulhasanalinadwi.org

ایک نوجوان طالب علم نے بڑا زور دے کر یہ کہا کہ ہمارے اس دور اور معاشرہ کا ایک پیچیدہ اور نازک ترین مسئلہ اور دشواری شادی ہے۔

آخر میں ان حقائق و واقعات کو پیش کرنے کے بعد کہا گیا کہ جزیرۃ العرب پر فقر اور ذرائع آمدنی کی کمی کا ایک دور گزرا ہے جو صدیوں قائم رہا، لیکن اس سے اسلام کا یہ مرکز اس خطرہ سے دوچار نہیں ہوا، جو دولت کی اس فراوانی، معیارِ زندگی کی بلندی، اور خوش حالی و رفاہیت سے پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اس فقر و پسماندگی کے دور سے یہ فائدہ ہوا کہ بداندیشوں اور توسیع پسندوں کی نگاہوں اور ان کے دندان آز سے یہ ملک محفوظ رہا اور انھوں نے کبھی اس پر اپنی توانائیاں صرف کرنے اور ڈورے ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جس کے نتیجہ میں ان کو کسی مادی فائدہ کے حاصل کرنے کی امید نہیں تھی، لیکن اب صورت حال بالکل مختلف ہے

اس کے بعد کہا گیا کہ انھیں حقائق و خطرات کے پیش نظر اس کی جرأت کی جا رہی ہے کہ یہ تحریر جو عام اشاعت کے لئے نہیں ہے، ذمہ داروں کی خدمت میں شخصی طور پر پیش کی جائے، تاکہ یہ حقائق ان کے سامنے متعیّن و مدلّل طریقہ پر اور مستند ذرائع کے حوالہ سے آجائیں، اور وہ صورت حال کی نزاکت کا احساس اور اس کے تدارک کے لئے کوئی اقدام کر سکیں، اس تحریر کو جو "إلى أين تتجه الجزيرة العربية وإلى أي غاية تنتهي"[1] (جزیرۃ العرب کس طرف جا رہا ہے، اور کہاں جا کر رکے گا؟) کے عنوان سے مرتب کی گئی تھی، ٹائپ اور سائیکلو اسٹائل کرا کر محفوظ رکھا گیا۔

خوش قسمتی سے اس زمانہ میں شاہ خالد مرحوم اپنے عملہ کے ساتھ طائف میں

---

[1] یہ تحریر فلسکیپ سائز کے ۱۸ صفحات میں آئی ہے، اور یہاں صرف اس کے اشارات و نکات پیش کئے گئے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

مقیم تھے، میں نے رابطہ کے سکریٹری جنرل شیخ محمد علی الحرکان سے ذکر کیا کہ میں طائف جاکر بادشاہ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، انھوں نے رئیس التشریفات (RECEPTION SECRETARY) کو ٹیلی فون کردیا کہ مجھے بادشاہ سے ملادیا جائے، میں طائف پہونچا تو معلوم ہوا کہ شاہ حسین والیِ اردن آئے ہوئے ہیں اور وقت کا بڑا حصہ ان کے استقبال اور ان کے اعزاز میں دعوتوں میں گھرا ہوا ہے، مجھے جب اندازہ ہوا کہ مجھے زیادہ انتظار کرنا پڑے گا تو میں مکہ معظمہ واپس آگیا اور میں نے ایک کاپی اپنے خط کے ساتھ اپنے محترم وکرم فرما دوست وبزرگ شیخ عبدالعزیز بن باز صدر رابطۂ عالم اسلامی کی خدمت میں اور ایک کاپی رئیس القضاۃ ومحاکم شرعیہ کے صدر و نگراں شیخ عبداللہ بن حُمید کی خدمت میں بھیجی، چند دن بعد ان دونوں حضرات کے علیحدہ علیحدہ خط آئے (اس طرح کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی) کہ میں نے تمہاری یہ یادداشت جلالۃ الملک کے پاس اپنے ذاتی خط کے ساتھ بھیجی ہے جس میں میں نے لکھا ہے کہ آپ کی مملکت کے ایک سچے خیرخواہ اور مخلص نے یہ یادداشت پیش کی ہے، آپ اس کو بجائے کسی سے پڑھواکر سننے کے خود ہی ملاحظہ فرمائیں، تقریباً دونوں حضرات نے اسی طرح کی بات لکھی تھی، مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے ان کے ولی عہد، اور ان کے وزیر اعظم امیر فہد، وزیر داخلہ وغیرہ کے پاس یہ یادداشت پہونچی اور ان کو اس کے مندرجات سے آگاہی ہوئی،

"وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا"

ایک سوئے اتفاق

میں نے اس یادداشت کی اشاعت مناسب نہیں سمجھی تھی کہ مقصد فوت ہوتا،

www.abulhasanalinadwi.org

مقصد مملکت کو بدنام کرنا اور اس کے بارہ میں بے اعتمادی و بدگمانی کی فضا پیدا کرنا نہیں تھا، لیکن سوئے اتفاق کہ اس کی کوئی کاپی "الاخوان المسلمون" کے ترجمان "رسالۃ الدعوۃ" (جو قاہرہ سے نکلتا ہے) کے ایڈیٹر یا عملہ کے کسی فرد کے ہاتھ لگ گئی، اور اس سے زیادہ سوئے اتفاق یہ کہ اس کی پہلی شائع شدہ قسط حجاز میں اس وقت پہونچی جس دن حرم کا ناشدنی واقعہ پیش آیا، جس کی تفصیل آرہی ہے، یہ شمارہ ضبط کر لیا گیا، الحمد للہ کہ اس واقعہ کا اس تحریر سے کوئی ربط و علاقہ سمجھا نہیں گیا۔

حرم کا ناشدنی واقعہ

ذی الحجہ کی آخری تاریخ (۲۰ نومبر ۱۹۷۹ء) کو میں نورِ چشم سید عبد اللہ حسنی (فرزند محمد الحسنی مرحوم) کی معیت میں نصف شب میں جدہ پہونچا تاکہ رابطہ کی مقرر کی ہوئی وزرائے اوقاف کی اس کمیٹی میں شرکت کروں جو یکم محرم ۱۴۰۰ھ (۲۱ نومبر ۱۹۷۹ء) سے مکہ مکرمہ میں اپنا کام شروع کرنے والی تھی، اس کمیٹی کے ارکان میں مملکت سعودیہ کے وزیر اوقاف شیخ عبد الوہاب عبد الواسع، شام کے وزیر اوقاف عبد الستار السید، اردن کے وزیر اوقاف کامل الشریف اور کسی افریقی ملک کے وزیر اوقاف (جن کا نام یاد نہیں رہا) رکن تھے، رابطہ نے اپنی نمائندگی کے لئے اپنے جنرل سکریٹری شیخ محمد الحرکان کو اور مجھے منتخب کیا تھا، میں حسب معمول جدّہ میں اپنی قیام گاہ عبد الغنی محمد نور ولی صاحبان کے یہاں ٹھہر گیا، ہم لوگ احرام باندھ کر آئے تھے، اور اگلے دن عمرہ ادا کرنے اور کمیٹی میں شرکت کا ارادہ تھا، صبح جب آنکھ کھلی تو ہمارے

www.abulhasanalinadwi.org

میزبانوں نے بتایا کہ ابھی مکہ معظمہ سے ٹیلی فون آیا ہے کہ حرم شریف پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا، لیکن تھوڑی دیر بعد انھوں نے اس کی تردید کی کہ ایرانیوں نے نہیں کچھ غالی انتہا پسند عربوں نے وہاں فتنہ برپا کیا ہے، تھوڑی دیر کے بعد رابطہ کے دفتر سے خود ایک ذمہ دار کا ٹیلی فون آیا کہ شیخ ابوالحسن سے کہہ دیا جائے کہ وہ سیدھے حرم آنے کے بجائے فندق مکہ انٹرکانٹی نینٹل میں آئیں، اس مشورہ کے مطابق ہم لوگ سیدھے فندق میں پہونچے وہیں ارکان کے اعزاز میں رابطہ کی دعوت میں شرکت کی، شام کو مغرب بعد کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا، مملکت سعودیہ کے وزیر اوقاف شیخ عبدالوہاب عبدالواسع سے میں نے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ انھوں نے کہا کچھ انتہا پسندوں اور مذہبی دیوانوں نے ہنگامہ برپا کیا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ محمد عبداللہ القحطانی نے یکم محرم ۱۴۰۰ھ کو (جبکہ حرم بھرا ہوا تھا اور حجاج کی ایک بڑی تعداد ابھی اپنے گھروں کو واپس نہیں گئی تھی) اچانک مہدی ہونے کا دعوی کیا، اور لوگوں سے بیعت لینی شروع کی اس سے سارے حرم میں ہیجان اور پھر پوری مملکت اور عالم اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی[1]، یہ اپنی نوعیت کا

---

[1] اس فتنہ کا فکری قائد محمد عبداللہ القحطانی (مدعی مہدویت) اور عسکری قائد جہیمان العتیبی تھا، جنھوں نے اپنے رفقاء اور اعوان کے ساتھ پانچ دن حرم شریف پر پورا تسلط قائم رکھا، پانچ دن کے بعد فوج نے قبضہ کرنے والوں کا قبضہ ختم کرایا، اور تقریباً دو ہفتوں کے بعد باقاعدہ امام حرم کی امامت میں نماز شروع ہوئی۔

محمد عبداللہ القحطانی (مہدی مزعوم) نے اپنے کہنے کے مطابق حرم شریف میں نئے سال کی ابتداء پر یہ نامبارک اقدام، عالم اسلام کی توجہ حکومت سعودیہ کے خلاف اس بے چینی کی طرف منعطف کرنے کے لئے کیا تھا جس کی بنیاد وہ خرابیاں تھیں جن کو دور کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، محمد عبداللہ القحطانی اس حملہ میں مقتول ہوا جو سعودی فوج نے حرم کے استخلاص کے لئے کیا تھا، جہیمان عتیبی گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا، اس نامبارک اقدام سے کئی روز تک مطاف (صدیوں کے معمول کے خلاف) طواف کرنے والوں سے خالی اور حرم شریف باقاعدہ کثیر جماعت اور معین امام کی امامت سے محروم رہا، دوحہ میں ٹیلی ویژن پر حرم کا یہ نقشہ دیکھ کر آنکھیں پُرآب اور دل بے تاب ہو جاتا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

پہلا واقعہ تھا، جو قرامطہ کے مذموم اقدام کے بعد پیش آیا تھا، اس کی وجہ سے عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کی گردنیں شرم وندامت سے جھک گئیں، اور سیکڑوں برس کے بعد حرم شریف کی حرمت اور ادب وسکون خطرہ میں پڑ گیا، حرم شریف اپنے ماحول اور سارے مکہ سے کٹ گیا، معلوم ہوا کہ یہ لوگ کچھ عرصہ سے جنازوں کی شکل میں (جن کی تفتیش نہیں کی جاتی) حرم میں اسلحہ پہونچا رہے تھے، اور وہاں کے خلوات میں جو تہ خانوں کی شکل میں ہیں جمع کر رہے تھے، پولیس اور فوج نے مزاحمت کی لیکن حرم ہونے کی وجہ سے وہ آزادانہ فوجی کارروائی کرنے میں متردد تھے، اس حالت میں پردیسی حجاج پر جو کچھ گزری ہوگی اور جو لوگ وہاں محصور رہ گئے، ان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، میں نے مکہ معظمہ ہی میں یہ داستان بعض قریبی ہندوستانی حجاج سے تفصیل سے سنی جو اس فجر کی نماز میں موجود تھے، جس کے معاً بعد یہ واقعہ پیش آیا۔

کمیٹی سے فراغت کے بعد میں اور عزیزی عبداللہ اپنی قدیم قیام گاہ ڈاکٹر مولوی عبداللہ عباس ندوی کے مکان واقع شارع منصور پر منتقل ہو گئے، میں تو بار بار حاضر ہو چکا تھا، اور حاضر ہوتا رہتا تھا، لیکن عزیزی عبداللہ سلمہ کو دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ پہلی مرتبہ میرے ساتھ عمرہ کے لئے آئے تھے، اور وہ سوائے دور سے حرم شریف کے میناروں کو دیکھنے کے ہر چیز سے محروم تھے، حرم کے چاروں طرف فوجی پہرہ تھا اور ٹینک اور موٹریں تھیں، اس سے مایوس ہو کر کہ ہم لوگ مناسک ادا کر سکیں گے ہم دونوں نے احرام کھول لیا اور عمرہ کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے۔[1]

[1] اس کے اگلے سال عمرہ ادا کیا گیا، احرام کھولنے کے کفارہ میں قربانی بھی دی گئی (باقی صفحہ ۲۸۷ پر)

www.abulhasanalinadwi.org

۵ ۔ ۹ ر محرم ۱۴۰۰ھ (۲۶ ر ۔ ۳۰ ر نومبر ۱۹۷۹ء) کو قطر کے دار الحکومت دوحہ میں تیسری عالمی سیرت کانفرنس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہونے والی تھی، میں اس کی مجلس انتظامی و انتخابی کمیٹی کا بھی رکن تھا، میری شرکت ضروری تھی، میں پنجشنبہ ۳ ر محرم کو عزیزی عبد اللہ کی معیت میں بحرین کے راستہ دوحہ روانہ ہوگیا، اسی جہاز پر جس میں ہمارا سفر ہو رہا تھا، رابطہ کا نمائندہ وفد اپنے سکریٹری جنرل شیخ محمد علی الحرکان کی قیادت میں روانہ ہو رہا تھا، ہم لوگوں کا ساتھ ہوگیا، دوحہ میں وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل (GULF HOTEL) میں ہم سب حکومت کے مہمان ہوئے۔

قطر کی سیرت کانفرنس

یہ تیسری عالمی سیرت کانفرنس تھی جس کی دعوت حکومت قطر نے دی تھی، پہلی کانفرنس ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء میں پاکستان میں منعقد ہوئی تھی جس کا بہت دنوں تک چرچا رہا، دوسری ۱۳۹۷ھ ۱۹۷۷ء میں ترکی میں منعقد ہوئی اب یہ تیسری کانفرنس محرم ۱۴۰۰ھ نومبر ۱۹۷۹ء میں قطر کے دار الحکومت دوحہ میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس کی دعوت دینے اور اعلیٰ پیمانہ پر اس کے انتظامات کرنے میں ہمارے قابل احترام دوست شیخ عبد اللہ بن ابراہیم الانصاری رئیس امور دینیہ کا خاص حصہ تھا، جو بڑے صاحب ایمان، زندہ دل اور علمی آدمی ہیں، حکومت قطر نے بھی اپنے رقبہ اور حجم کے مختصر ہونے کے باوجود شاہانہ پیمانہ پر میزبانی کے فرائض انجام دیئے، مجھے کثیر التعداد کانفرنسوں، ندوات و مجالس مذاکرہ

(باقی ص ۲۸۶ کا) یہ واقعہ اصلاحی و دعوتی کام کرنے والوں کے حق میں بڑا نامبارک ثابت ہوا کہ ان کو شک وخوف کی نظر سے دیکھا جانے لگا، اور ان کے کام کے راستہ میں مختلف رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

(SEMINARS) میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے، لیکن میں نے اس فیاضی، مستعدی اور فراخ دلی کا مظاہرہ اس سے پہلے کسی کانفرنس میں نہیں دیکھا تھا، شرکاء بھی اپنی کمیّت وکیفیت کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے، امریکہ سے لے کر انڈونیشیا تک اور مراکش ورباط سے لے کر عراق وخلیج تک کے چوٹی کے عالم اسلم جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہ اور جامعات کے فاضل اساتذہ شریک تھے۔

شیخ عبداللہ بن ابراہیم الانصاری نے میری کتاب "السیرۃ النبویۃ" (جو کچھ ہی عرصہ پہلے مرتّب اور دارالشروق جدہ کی طرف سے شائع ہوئی تھی) کا نیا ایڈیشن شائع کیا تھا، تاکہ وہ کانفرنس کے مندوبین کو کانفرنس کے موضوع کی نسبت سے ہدیہ کی جائے[1]، یہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۶۲۴ صفحات پر آیا، اور مجلد شکل میں مندوبین کو پیش کیا گیا۔

ہمارے پہونچنے پر کانفرنس کے سکریٹریٹ کی طرف سے خط ملا کہ عالم اسلام سے جو وفود آئے ہیں، ان کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر آپ کو کرنی ہے آپ مقالہ تیار کرلیں، عرب ممالک کے مؤتمرات میں صدر کے خطبہ کے بعد سب سے اہم کلمۃ الوفود ہوتا ہے،

---

[1] یہ کتاب سیرت کی جدید ترین کتابوں میں ہے جو بڑے سائز کے ۴۹۹ صفحات پر آئی ہے، اس میں بعض ایسی نئی بحثیں، تاریخ کا تقابلی مطالعہ، ما قبل اسلام عہد کی مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی واقتصادی تصویر... پیش کی گئی ہے، جزیرۃ العرب، مکہ ومدینہ اور طائف پر تاریخی وجغرافیائی ومعاشرتی وتہذیبی نقطۂ نظر سے پہلی مرتبہ روشنی ڈالی گئی ہے، جو اس کتاب کی خصوصیت ہے، اس کے علاوہ اور بھی تحقیقی بحثیں ہیں، جن پر اس کتاب میں پہلی مرتبہ قلم اٹھایا گیا ہے، یہ کتاب متعدد عرب جامعات اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، اس وقت تک عربی کے تین ایڈیشن دارالشروق کی طرف سے نکل چکے ہیں، دو ایڈیشن بعض دوسرے مکتبات نے شائع کئے ہیں، اردو، انگریزی اور ہندی ترجمے بھی شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس کا کسی مندوب کو دیا جانا اعزاز و اعتماد کی نشانی ہے، اگلے دن جمعہ تھا، مضمون لینے کے لئے جب نمائندہ آیا تو ہم لوگ مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے، اور میں کچھ لکھ نہیں سکا تھا، اس تحریر کو چھپنا اور اجلاس میں تقسیم ہونا تھا، جو اگلے ہی دن صبح کو منعقد ہونے والا تھا، میں نے مضمون سے معذرت کی اور کہا کہ خدا کے فضل سے یہاں چوٹی کے علماء و مفکرین موجود ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے، مجھے معاف رکھا جائے، مجھے لکھنے کے لئے وقت نہیں ملا۔

شنبہ ۵ محرم ۱۴۰۰ھ کو جب ہم لوگ جلسہ گاہ میں پہونچے، جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور اس میں ترکی و مغرب اقصیٰ، امریکہ اور یورپ سے لے کر جنوبی و مشرقی مسلم ممالک تک کی ممتاز شخصیتیں موجود تھیں، جن میں بہت سے چہرے جانے پہچانے تھے، میں نے دیکھا کہ نشستوں پر پروگرام چھپا ہوا رکھا ہے، اس میں کلمۃ الوفود میرے ہی نام ہے، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں برجستہ تقریر کروں اور اللہ جو کہلوائے وہ کہوں، والیٔ قطر خلیفہ بن حمد آل ثانی کے بیرونی سفر کی وجہ سے ان کے صاحبزادہ نے (جو ولی عہد اور وزیر دفاع بھی ہیں) کانفرنس کا افتتاح کیا، اور سربراہ مملکت کا مقالہ پڑھ کر سنایا، ان کے بعد وہاں کے رئیس القضاۃ شیخ عبد اللہ بن زید المحمود نے تقریر کی۔

عرب و عجم پر بعثت محمدی کے احسانات

میری باری آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ دل و دماغ اس دل آویز موضوع کی حلاوت، اور جس ذات گرامی سے اس کو نسبت ہے، اس کی عظمت و محبت سے معمور ہی نہیں مخمور ہیں، مضامین ہی نہیں الفاظ اور جملوں کا ورود ہو رہا ہے، اس وقت اس کی حکمت معلوم ہوئی کہ

www.abulhasanalinadwi.org

پہلے یہ تقریر کیوں تیار نہیں ہو سکی، میں نے پہلے پاکستان و ترکی کی کانفرنسوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی موزونیت اور ان ملکوں پر بعثت محمدیؐ کے احسانات کا ذکر کیا اور اس انقلاب بلکہ نئی زندگی کا جو ان کو اس کے طفیل میں ملی' یہ ان کی احسان شناسی اور شکر گزاری کا مظاہرہ اور ان احسانات و نعمتوں کا ادنیٰ خراج تھا جو انھوں نے ادا کیا۔

برصغیر کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبالؔ کے ان اشعار کی ترجمانی کی گئی، جو انھوں نے وہاں کے مسلمانوں کی زبان حال سے کہے ہیں ؎

نے حضور کاہناں افگندہ سر | نے خدا ہا ساختیم از گاؤ خر
نے طواف کوشک سلطان و میر | نے سجودے پیش معبودانِ پیر
فکر ما پروردۂ احسانِ تُست | ایں ہمہ از لطف بے پایانِ تست

(ترجمہ :- نہ ہم نے گاؤ خر کو خدا بنایا نہ نجومیوں اور پروہتوں کے آگے سر جھکایا نہ روایتی معبودوں کو سجدہ کیا نہ کسی سلطان و امیر کی بارگاہ کا چکر لگایا' یہ سب باتیں آپ کے بے پایاں لطف و کرم کے سبب ہیں' اور ہماری فکر و نظر کی صلاحیت آپؐ ہی کی آغوشِ تربیت کی پروردہ ہے۔)

پھر ترک قوم پر اس کے احسانات کا ذکر کیا اور بتایا کہ اسی دین و دعوت نے ترکی قوم کو وسط ایشیا کے ایک گم نام و محدود دائرہ اور حصار سے نکال کر جہاں وہ گمنامی اور بے نشانی کی زندگی بسر کر رہی تھی' اور بھورے بھیڑیئے کی پرستش کر رہی تھی' اس وسیع و عریض میدان میں لا کھڑا کیا اور امت مسلمہ کی قیادت و سیادت کے منصب رفیع پر پہونچایا' حرمین شریفین کی تولیت کا شرف عطا فرمایا' حرم مکی اور مسجد نبویؐ کی نئی تعمیر کا موقعہ دیا' جو آج تک باقی ہے[1]۔

---

[1] بیت اللہ کی موجودہ عمارت سلطان مراد کی اور مسجد نبویؐ کی موجودہ عمارت سلطان عبدالمجید ثانی کی تعمیر ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے بعد میں نے کہا کہ اب یہ تیسری کانفرنس موزوں وقت اور موزوں جگہ پر ہو رہی ہے، وقت پندرہویں صدی ہجری کی آمد آمد کا ہے اور جگہ "جزیرۃ العرب" پھر میں نے "جزیرۃ العرب" اور امت عربیہ کے تعلق سے بعثت محمدی کے اس احسان کا تذکرہ کیا جو دنیا کی سب قوموں اور ملکوں سے بڑھ کر عرب پر ہے، اس موقع پر میں نے علامہ اقبال کا شعر فارسی میں پڑھا کہ کچھ فارسی کے سمجھنے والے بھی موجود تھے، پھر عربی میں اس کا ترجمہ اور شرح کی، شعر تھا ؎

از دمِ سیرابِ آں امّی لقب ﷺ
لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

(اس نبیٔ امی لقب ﷺ کے فیضِ نفس سے صحرائے عرب کے ریگ زار سے گل لالہ لہلہا اٹھے۔)

میں نے جب اس کا تشریحی ترجمہ کیا اور عرب کے حالات پر اس کو منطبق کیا تو بہت سی آنکھوں میں آنسو اور بہت سے چہروں پر مسرت و تاثر کی چمک تھی، پھر میں نے ذرا صفائی اور جرأت سے بتایا کہ اگر خدانخواستہ اسلام نہ آتا اور عرب اس کی دعوت لے کر کھڑے نہ ہوتے تو جزیرۃ العرب کا حال کیا ہوتا، اور ان حکومتوں اور ریاستوں کو کون کہاں تلاش کرنے جاتا جن سے ساری دنیا کے مسلمان محبت و عقیدت رکھتے ہیں، اور جن کی دولت اور فیاضی کے دنیا میں گیت گائے جا رہے ہیں، اور اس چشمۂ شیریں پر مور و ملخ جمع ہو رہے ہیں، اس کے لئے کتنے ہزار سال انتظار کرنا پڑتا، پھر بھی اس کے ظہور میں آنے کے کیا امکانات تھے ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے ۔۔۔ یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

www.abulhasanalinadwi.org

ہم آپ سب بعثت محمدیؐ کے سایہ میں پرورش پارہے ہیں، اسی خوان نعمت کے زلّہ ربا ہیں جس کو آقائے نامدار صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری انسانیت کے لئے بچھایا، اسی کا کرشمہ ہے کہ میں اس وقت ولی عہد معظم اور عرب کے علمائے کبار کے پہلو میں بیٹھا ہوں، اور اپنی زبان (اردو) میں نہیں ان کی زبان میں (جواب میری بھی زبان ہے) ایسے چیدہ وبرگزیدہ مجمع کو خطاب کررہا ہوں۔

پھر میں نے کہا کہ اس کانفرنس کا اگر کوئی پیغام ہے تو یہ ہے کہ ہم اپنے اسلامی عربی معاشرہ کے اس تضاد کو دور کریں جو اس وقت اس میں پایا جاتا ہے، ہمارا مرض الحمدللہ کفر وشرک نہیں ہے، ہمارا مرض "نفاق" ہے، ہم اعلان کچھ کرتے ہیں عمل کچھ کرتے ہیں، ہم کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں، اس تضاد نے اس معاشرہ کو بے اعتبار اور بے وقعت بنادیا ہے، اور اس میں اب دنیا کے لئے وہ کشش باقی نہیں رہی جو لوگوں کے لئے قبول اسلام کا سبب بنتی تھی۔

میری تقریر کے بعد شیخ عبداللہ ابراہیم الانصاری نے (جو اس کانفرنس کے روح رواں تھے، اور ایک طرح سے صدر مجلس استقبالیہ) تقریر کی اور وہ اجلاس کمیٹیوں کی تشکیل پر ختم ہوا جنھوں نے اپنا علمی وتحقیقی کام شروع کیا، فاضلانہ مقالات پڑھے گئے جو فاضل مندوبین تیار کرکے لائے تھے، کام کا نقشہ بنا اور تجاویز پاس ہوئیں۔

اجلاس کے باہر میری ایک تقریر جامع مسجد میں بعد مغرب ہوئی جس میں شارقہ کی ایک تقریر کے انداز پر جس کا عنوان تھا "خلیج بین الاسلام والمسلمین" میں نے اس فاصلہ کو بتایا جو اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی زندگی میں پیدا ہوگیا ہے، اس موقعہ پر بھی علامہ اقبال کے اس شعر کی تشریح کی کہ ؎

www.abulhasanalinadwi.org

نالم از کسے می نالم از خویش

کہ ماشایان شان تو نہ بودیم

(یارسول اللہ، میں کسی کی شکایت اور فریاد نہیں کرتا، میں اپنی شکایت اور اس کے خلاف فریاد کرتا ہوں کہ سچی بات ہے کہ ہم آپ کے شایان شان نہ تھے۔)

سیرت کانفرنس کی میری افتتاحی تقریر ٹیلی ویژن پر دوبارہ دکھائی گئی، میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے کو بولتا ہوا دیکھا اور اپنے کانوں سے اپنی تقریر سنی اور سامعین کے تاثر چہرے نظر آئے۔

پانچ دن کے اجلاس پر یہ کانفرنس بخیر وخوبی ختم ہوگئی، اور مہمان ان کتابوں کے ساتھ جوان کو ہدیہ کی گئی تھیں، پورے اعزاز وراحت کے ساتھ اپنے اپنے وطن واپس ہوئے۔

فیصل ایوارڈ

حرم کے نامبارک واقعہ اور اسی سے کچھ ہی عرصہ پیشتر میرا ذمہ داران مملکت کو وہ تحریری یادداشت بھیجنے (جس کا اوپر تفصیل سے ذکر آیا) پھر عین اس دن حرم میں واقعہ پیش آنے اور "الدعوۃ" (قاہرہ) میں اس کی چھپی ہوئی ایک قسط کے سعودی عرب میں پہونچنے سے مجھے اس کا خیال ہونے لگا تھا کہ شاید میری رابطہ اور جامعہ کی رکنیت بھی محل غور وبحث بن جائے، اور مجھے اب تک اس مقدس ومحبوب سرزمین میں آنے کی جو سہولتیں اور مملکت کے ذمہ داروں سے ملنے اور ان کو متوجہ کرنے کے جو مواقع حاصل رہے ہیں، ان سے بھی مجھے محروم کردیا جائے، لیکن میرا دل اندر سے مطمئن تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ دین کے تقاضے،

www.abulhasanalinadwi.org

فرض کے احساس اور اس مقدّس سرزمین کی محبت و تعلق سے کیا۔

لیکن مجھے حیرت ہوئی جب اچانک اس سال کے فیصل ایوارڈ کے لئے جو عالم اسلام میں تقریباً وہ حیثیت رکھتا ہے، جو عمومی طور پر نوبل پرائز کی ہے، میرے نام کا اعلان ہوا، میں اپنی مردانہ قیام گاہ (دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی) کے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا اپنے معمول کے مطابق تحریری و تصنیفی کام کر رہا تھا کہ عزیزی محمد رابع سلمہٗ لکھنؤ سے آئے اور انھوں نے اطلاع دی کہ آپ کے لئے فیصل ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے[1]، اور اطلاع و مبارک باد کے یہ تار آئے ہیں، ان میں ایوارڈ کی کمیٹی کے صدر امیر خالد فیصل بن عبدالعزیز کی طرف سے اطلاع کا تار اور ریاض آکر اس کو وصول کرنے کی دعوت تھی، مبارک باد کے تاروں میں غالباً سب سے پہلا تار حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا تھا، ان کو جب ریڈیو کے حوالہ سے مدینہ طیبہ میں ایک صاحب کے ذریعہ اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ "علی میاں کو فوراً مبارک باد کا تار دے دو کہ ان سے اندیشہ ہے کہ وہ اس کے قبول کرنے سے معذرت نہ کر دیں وہ میرے اس تار سے میرا ایماء سمجھ لیں گے۔"

فیصل ایوارڈ کا طریقۂ کار یہ ہے کہ کمیٹی کی طرف سے عالم اسلام کے مختلف مرکزوں، اہم شخصیتوں، اداروں اور تنظیموں سے رائے مانگی جاتی ہے کہ آپ کے نزدیک اس ایوارڈ کا کون مستحق ہے؟ پھر جس کے حق میں زیادہ رائیں آتی ہیں اس کے حق میں فیصلہ کیا جاتا ہے، ایوارڈ کی قیمت ۳ لاکھ ریال ہوتی ہے جو نقد، ایک طلائی تمغہ اور ایک سند کے ساتھ

---

[1] اس سال یہ ایوارڈ دو شخصیتوں میں تقسیم کیا گیا ایک میں، دوسرے ڈاکٹر محمد ناصر سابق وزیر اعظم انڈونیشیا جو ایک بڑے داعی و مجاہد اور رابطہ کی مجلس تاسیسی کے شروع سے رکن ہیں، پہلا ایوارڈ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو ملا تھا، جس کے کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس میں انعام پانے والے کی امتیازی خدمات کا اظہار ہوتا ہے، جلسہ میں پیش کیا جاتا ہے، جس میں بادشاہ، ولی عہد سلطنت، وزراء واعیان وعلماء شریک ہوتے ہیں۔

۲۴ر صفر ۱۴۰۰ھ (۱۴ر جنوری ۱۹۸۰ء) تا ۲۶ر صفر ۱۴۰۰ھ (۱۶ر جنوری ۱۹۸۰ء) انتخاب کی کمیٹیوں کے اجلاس ہوئے اور انعام پانے والوں کے ناموں کا فیصلہ ہوا، میرے نام وزیر تعلیم عالی معالی الشیخ حسن عبداللہ آل الشیخ کا خصوصی وپرزور تار آیا کہ آپ میری خاطر اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں، لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ میں خود جانے کے بجائے عزیزی ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی[1] کو اپنا قائم مقام بنا دوں اور وہ میری طرف سے تمغہ و ایوارڈ وصول کریں۔

میں نے اس موقعہ پر کمیٹی کے صدر کے نام خط لکھا جس میں شکریہ کے بعد لکھا کہ بہتر تو یہ تھا کہ دین کی خدمت کرنے والوں کو ان کا انعام دنیا سے جانے کے بعد ملے، لیکن میری لاعلمی میں اس کا اعلان ہوا، اب میرے لئے ملک فیصل مرحوم (جن سے اس انعام کا انتساب ہے) کی عظیم اسلامی خدمات کے اعتراف واحترام میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کو قبول کرلوں، اور دعا کروں کہ انعام جس بات کی علامت ہے، اور اس کے جو مضمرات ہیں وہ پورے کئے جائیں، میں خود حاضر نہیں ہو سکتا برادرم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو اپنا نمائندہ بناتا ہوں وہ اس کو قبول کریں گے اور میری طرف سے سلام وشکریہ پہونچائیں گے۔

پھر میں نے لکھا کہ یہ ایوارڈ دو پہلوؤں کا حامل ہے، ایک اس کی معنوی قیمت یعنی اعزاز واعتراف اس کو میں شرمندگی کے ساتھ قبول کرتا ہوں، دوسرا اس کا

---

[1] استاد جامعۃ ام القریٰ مکۂ مکرمہ

www.abulhasanalinadwi.org

مالی پہلو یعنی وہ رقم جو اس کے ساتھ ملے گی، اس کے لئے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ میں اس کو اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کروں جس کا اعلان مولوی عبداللہ عباس ندوی کریں گے۔

تقسیم انعامات کا جلسہ ۱۲ فروری کو ریاض کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے فیصل ہال میں شام کو ۸ بجے ہوا، ملک خالد بن عبدالعزیز کے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے شہزادہ فہد بن عبدالعزیز (ولی عہد مملکت وحال ملک فہد) نے تقریب کی صدارت کے فرائض انجام دیئے، متعدد شہزادے، وزراء، اور گورنر ریاض شریک تھے، امیر فہد ابن عبدالعزیز نے ایوارڈ پیش کئے، ایوارڈ پانے والوں کے سوانحی خاکے بھی پڑھے گئے، جلسہ میں اعلان کیا گیا کہ ابوالحسن ندوی نے ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کو اپنا نائب بنایا ہے، وہ تمغہ، سند، اور ایوارڈ ان کی طرف سے وصول کریں گے، چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے اس کو وصول کیا انھوں نے میرا خط بھی پڑھ کر سنایا اور اعلان کیا کہ نصف رقم افغان پناہ گزینوں کے لئے، ایک ربع جماعت تحفیظ القرآن الکریم کے لئے[1] جس کے شیخ صالح القزاز (سابق سکریٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی) نگراں ہیں، اور دوسرا ربع مدرسۂ صولتیہ مکہ مکرمہ کے لئے ہے[2]

---

[1] یہ تحریک اور اس کے لئے ادارہ کا قیام پاکستان کے ایک نیک دل اور صاحب توفیق تاجر الحاج یوسف سیٹھی صاحب کے حسنات میں ہے جنھوں نے یہ محسوس کیا کہ خود مرکز اسلام میں حفظ قرآن کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے، ایک بڑی رقم اس کے لئے وقف کی اور اس کا ایک نظام بنایا، جس میں علاقہ والوں کو بھی شریک کیا اور حکومت سعودیہ نے بھی اس میں حصہ لیا، یہ نظام سعودی عرب اور افریقہ میں خوب پھیل گیا، اور اس کی بدولت ہزاروں نوجوان اس وقت تک حافظ ہو گئے ہوں گے۔ [2] یہ مدرسہ جو خالص دینی تعلیم کا واحد مرکز رہ گیا ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب مہاجر مکہ معظمہ کی حمیت اسلامی کا نتیجہ اور آثار رحمت میں سے ہے، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس پر فخر ہے اور اس سے ہندوستانی، پاکستانی حجاج نیز ہندی انڈونیشائی مہاجرین کے بچوں کو بڑا فیض پہونچا اور چند علماء اس سے تیار ہو کر نکلے جو اپنے اپنے ملکوں میں اہم دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

دوسرے انعام پانے والے (جن میں علمی وادبی خدمات اور تحقیقی کاموں پر ایوارڈ وصول کرنے والے تھے) بذات خود موجود تھے، اور انھوں نے انعام وصول کئے۔[1]

ایاز قدر خود را بشناس

فیصل ایوارڈ کے اعلان کے کچھ ہی دن بعد (۴ فروری ۱۹۸۰ء کو) دار المصنفین کی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا، جس میں مجھے شرکت کرنی تھی، میری لاعلمی میں برادر محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین نے اس موقع پر ایک تہنیتی جلسہ کے انعقاد اور اس میں مجھے دار المصنفین کی طرف سے سپاسنامہ پیش کرنے کا پروگرام بنالیا، میں جب وہاں پہونچا تو مجھے یہ دیکھ کر شرمندگی ہوئی کہ انھوں نے ازراہ محبت وتعلق اس کا خاص اہتمام کیا ہے، اور قرب وجوار کے علماء اور معززین شہر کو دعوت دی ہے، سپاس نامہ میں بھی انھوں نے اپنے ادیبانہ وپرزور قلم سے وہ سب کچھ لکھا جو ان کے خلوص ومحبت نے لکھوایا۔

میں شکریہ ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے اپنی تقریر کا آغاز محمود وایاز کے اس قصہ سے کیا، جس کا ایک فقرہ "ایاز قدر خود را بشناس" ضرب المثل کی طرح مشہور ہوگیا ہے، میں نے کہا کہ جب سلطان محمود غزنوی کے اہل دربار ومقربانِ خاص نے دیکھا کہ بادشاہ کا ایاز پر (جو ایک غلام تھا) وہ التفات اور نظر خصوصی ہے جو ان میں سے کسی

---

[1] ماخوذ باختصار از "الجزیرۃ" (ریاض) ۲۶ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ (۱۳ فروری ۱۹۸۰ء) ص ۱۳۔

اگلے سال ۱۹۸۱ء کو خدمتِ اسلام کا یہ ایوارڈ شاہ خالد کو، اس کے اگلے سال شیخ عبد العزیز بن الباز کو، اور اس کے اگلے سال شاہ فہد کو ملا۔

www.abulhasanalinadwi.org

حاصل نہیں تو ان کو حسد پیدا ہوا اور انھوں نے موقعہ دیکھ کر سلطان سے عرض کیا کہ جہاں پناہ اس غلام پر بڑا اعتماد فرماتے ہیں، اور اس کو بارگاہ سلطانی میں تقرب خاص حاصل ہے، ہم کو اس کی وفاداری میں شک ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مجلس شاہی سے اٹھ کر اپنے خلوت خانہ میں جاتا ہے، اور کچھ دیر وہاں ٹھہر کر چلا آتا ہے، جہاں پناہ کو اس کی تحقیق کر لینی چاہیئے کہ وہ خلوت میں کیا کرتا ہے؟

بادشاہ کو بھی بار بار کہنے سے خیال پیدا ہو گیا، ایک مرتبہ ایاز اس خلوت خانہ میں جانے لگا تو بادشاہ بھی اس کے پیچھے پیچھے پہونچا دیکھا کہ وہاں ایک پرانی گدڑی (دلق فقیرانہ) رکھی ہوئی ہے، ایاز اس کے سامنے کھڑا ہوا اور کئی بار یہ فقرہ کہا "ایاز قدر خود را بشناس" "ایاز قدر خود را بشناس" جب وہ اس وظیفہ سے فارغ ہوا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں آتے ہو؟ اور اس فقرہ کا کیا مطلب ہے؟ ایاز نے عرض کیا کہ ولیّ نعمت! میں جب دربار عالی میں آیا تھا تو گدایانہ وفقیرانہ آیا تھا، اور یہی گدڑی میرے جسم پر تھی، میں چاہتا ہوں کہ اپنی حقیقت نہ بھولوں اور مجھے یاد رہے کہ میں کس حال میں آیا تھا، اور نگاہ خسروانہ نے مجھے کہاں تک پہونچا دیا، اس لئے میں اس کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا ماضی اور اپنی اصل حیثیت یاد کر لیتا ہوں، تاکہ میرا دماغ نہ بہکے اور میں خود فریبی میں مبتلا نہ ہوں۔

میں نے کہا کہ میں نے بھی اپنی پرانی گدڑی (ابتدا کی بے نوائی اور بے حقیقتی) محفوظ رکھی ہے، اور میں بھی اس کو سامنے رکھ کر "ایاز قدر خود را بشناس" کہہ لیا کرتا ہوں، یہ گدڑی یہ ہے کہ میں ۱۹۳۱ء میں جب اپنے استاد علامہ تقی الدین الہلالی کے ساتھ خادمانہ یہاں حاضر ہوا تھا تو میں نے ان کے ذریعہ اپنی اس خواہش کا اظہار

www.abulhasanalinadwi.org

کیا تھا کہ مجھے یہاں کم سے کم مشاہرہ پر (جس کی مقدار میرے نزدیک اس وقت ۲۵ - ۳۰ روپیہ بھی ہوسکتی تھی) رکھ لیا جائے، اور میں کوئی خدمت انجام دوں، لیکن میں اس وقت اس کا بھی اہل نہیں سمجھا گیا، آج اسی عظیم ادارہ کی طرف سے میری یہ پذیرائی اور عزت افزائی ہو رہی ہے لیکن الحمدللہ میں اپنی حقیقت سے واقف ہوں، مجھے اپنا ماضی یاد ہے اور میں اپنے بارے میں کسی فریب میں مبتلا نہیں، اس لئے اپنے نفس کو مخاطب کرکے میں اب بھی کہہ رہا ہوں "ایاز قدر خود را بشناس" "ایاز قدر خود را بشناس" اور اسی میں اپنی حفاظت اور سلامتی سمجھتا ہوں۔

اسی طرح کا (محدود پیمانہ پر) ایک جلسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احباب اور رفقائے کار نے مجلس اساتذہ کی طرف سے منعقد کیا، اور میں نے اس میں بھی اسی انداز سے اظہار خیال کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب سیزدہم[۱۳]

دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس، مراد آباد کا المیہ، پیام انسانیت کنونشن لکھنؤ

دارالعلوم دیوبند کا اجلاس صد سالہ

دارالعلوم دیوبند کے قیام پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزر رہی تھی، دارالعلوم دیوبند محض ایک دینی درسگاہ ہی نہیں (جس کو ازہرِ ہند کہنا ہر طرح سے درست ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے وہ مصر کے جامع ازہر پر بھی فائق ہے) اصلاحِ عقائد اور اشاعتِ کتاب و سنت کی تاریخ ساز دعوت ہے، وہ درحقیقت خاندان ولی اللّٰہی کے تجدیدی کارنامہ کا امتداد اور تسلسل ہے، جس میں (زمانہ و حالات کی تبدیلی اور انقلابِ سلطنت کے پیشِ نظر) ملت کے بچے کھچے دینی سرمایہ کی حفاظت اور اس کے لئے ایک بڑے مرکز کی تاسیس و ترقی کی حکمت عملی، اور اقدامی کوششوں کے میدان کے تنگ ہو جانے کی بناء پر (عارضی طور پر) دفاعی و حفاظتی پوزیشن اختیار کی گئی، جس کے محرکات و موجبات کا سمجھنا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی سنگینی، اور اس کے وسیع و عمیق اثرات کا جائزہ لئے بغیر ممکن نہیں،[۱] دارالعلوم ہر طرح سے اس کا مستحق تھا کہ

---

[۱] دارالعلوم دیوبند کے قیام کے پس منظر اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "ممالک اسلامیہ میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "دارالعلوم دیوبند"۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کا صد سالہ جشن منایا جائے، اس کی خدمات بلکہ فتوحات کا جائزہ لیا جائے اور اس کی تاریخ کو نہ صرف ملک بلکہ ملت کے سامنے رکھا جائے، اسی کے ساتھ زمانۂ حاضر کے تقاضوں، وقت کے حقائق اور ملک کی صحیح صورت حال کا جائزہ بھی لیا جائے اور مستقبل کے لئے راہِ عمل متعین کی جائے کہ (جیسے پہلے کہا جا چکا ہے) ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے زندہ رہتا ہے، اور تحریک کے لئے حقیقت پسندانہ احتسابِ نفس، نمو و شادابی، اور ہر زمانہ میں نئے برگ و بار لانے کی صلاحیت ضروری ہے۔

دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے انعقاد کا خیال بہت پرانا ہے، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی زندگی ہی میں ۱۹۴۹ء کے ایک جلسۂ شوریٰ میں پہلی مرتبہ اس کی تجویز سامنے آئی، اس کے بڑے محرک مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند، و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند، اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بعض ایسے واقعات پیش آئے تھے، جن کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ایک کل ہند بلکہ بین الاقوامی اجلاس کے ذریعہ دارالعلوم کی بین الاقوامیت کو نمایاں کیا جائے، تاکہ حکومت کے ذمہ دار بھی دارالعلوم کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کریں، لیکن مولانا مدنیؒ نے اس کے بارے میں اس بناء پر تردد ظاہر کیا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا اور جب دارالعلوم کے تاریخی جلسۂ دستار بندی کا حوالہ دیا گیا جو ربیع الآخر ۱۳۲۸ھ (اپریل ۱۹۱۰ء) میں منعقد ہوا تھا، اور غیر معمولی طریقہ پر کامیاب رہا تھا، اور جس کی خوشگوار اور پُرانوار یادیں ابھی تک تازہ ہیں، تو مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "انھیں بزرگوں کی خصوصیت تھی جو اس وقت رونق افروز تھے"[1]

---

[1] مولانا کا اشارہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ (باقی صفحہ ۳۰۲ پر)

www.abulhasanalinadwi.org

اس پُر فتن دور میں اس کا صحیح طور پر ہونا اور اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، بعض دوسرے حضرات نے بھی مختلف خدشات ظاہر کئے لیکن بالآخر اس کا فیصلہ کر لیا گیا اور اس کی تیاری کے لئے ایک دفتر قائم کر دیا گیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ تحریک سرد پڑ گئی اور اجلاس معرضِ التوا میں آ گیا۔

اسی عرصہ میں ۱۹۷۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن تعلیمی منایا گیا، جو توقع سے بڑھ کر کامیاب اور مفید رہا، جس کی تفصیل "باب ہشتم" میں گزر چکی ہے، اس تجربہ اور نظیر نے دار العلوم کے اجلاس صد سالہ کے خیال و تحریک کو مزید قوت پہونچائی اور بالآخر طے کر لیا گیا کہ ۳، ۴، ۵ رجمادی الاولی ۱۴۰۰ھ (۲۱، ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء) میں توکلاً علی اللہ یہ اجلاس کر لیا جائے، اس کے لئے اولاً بڑے وسیع انتظامات سوچے گئے اور ایک طویل المیعاد پروگرام اور نقشۂ کار بنایا گیا، پھر عملی تجربات کی روشنی اور دار العلوم کے ان ارکان اور سرپرستوں کے احساسات کے اثر سے جو دار العلوم کے بانیوں کی روح اور جذبات کی رعایت اس کے ہر کام میں ضروری سمجھتے تھے، اس پیمانہ کو مختصر کیا گیا، لیکن مختصر ہوتے بھی وہ خاصا وسیع رہا، اور یہ دار العلوم کے وسیع اثرات، اس کی عام مقبولیت، اس کے فضلاء و منتسبین کی کثرت اور عوام کے رجوع کے پیش نظر کوئی خلافِ قیاس اور بے محل بات نہ تھی کہ اس کا سب کو اندازہ تھا کہ اس جلسہ میں شرکت کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے کونہ کونہ سے شائقین و معتقدین جوق در جوق آئیں گے اور ان کی تعداد آسانی سے ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پہونچ جائے گی، اس لئے

(باقی ص ۳۰۱ کا) حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی طرف تھا، جنھوں نے اس جلسہ کی سرپرستی فرمائی تھی، اور اس کی کامیابی اور فتنوں سے محفوظ رہنے کے لئے ہمہ تن دعا میں مشغول رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

انتظامات بھی اسی کے مطابق ہونے چاہئیں۔

مجھے ۱۹۶۲ء سے دار العلوم کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کا شرف حاصل تھا اور میں مجلس شوریٰ کے ان اہم جلسوں میں شریک رہتا تھا جن میں اس اجلاس کے بارے میں غور کیا جاتا تھا، ایک مختصر گروہ کا خیال یہ تھا کہ اس اجلاس کو خالص عوامی رنگ نہ دیا جائے" اور اس کا پیمانہ اتنا وسیع نہ کیا جائے جس کو سنبھالنا مشکل ہو جائے اور جس میں دار العلوم کا اصل پیغام اس کے فضلاء و منتسبین تک نہ پہونچایا جا سکے اور ان کو اپنے فرائض اور ان سے وقت کا اور دین کا جو مطالبہ ہے اس کی تذکیر و تجدید کا کام نہ ہو سکے، لیکن وہ گروہ زیادہ موثر تھا جو اس کو اس برصغیر کا ایک یادگار اور ناقابل فراموش دینی جشن بنانا چاہتا تھا، اور اس کے ذریعہ سے حکومت، اکثریت اور موافقین و مخالفین پر دار العلوم کی مقبولیت و عظمت کا ایسا نقش قائم کر دینا چاہتا تھا، جس کی نظیر دینی اداروں اور ملّی تحریکوں کی تاریخ میں نہ مل سکے، آخر میں میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا جائے، دو دن وہ اپنے فضلاء، سند یافتگان اور اہل علم کے طبقہ تک محدود رہے، جس میں اس کی تاریخ، اس کے بانیوں اور اکابر کے عزائم و مقاصد رکھے جائیں، اور ان کو اپنا فرض و مقام یاد دلایا جائے، آخری دن کی نشست عوامی اجلاس اور وعظ و ارشاد کے لئے رکھ لی جائے، جس میں قریب و بعید کے آنے والے مسلمانوں کو شرکت کا موقعہ دیا جائے، اور اس میں دینی تذکیر و وعظ و ارشاد کا خاص اہتمام کیا جائے، لیکن غالباً اس خیال سے کہ یہ تقسیم و پابندی مشکل ہو گی، اس کو شروع سے عام اور مشترک اجلاس بنانے کا فیصلہ کیا گیا، اجلاس کی تشہیر اور پبلیسٹی ملک میں اتنی ہو گئی تھی کہ اب اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اجلاس کے سلسلہ میں مجلس شوریٰ کا جو آخری اجلاس ہوا اس میں میں شریک تھا، اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ سربراہ مملکت سعودیہ شاہ خالد سے یہ استدعا کی جائے کہ وہ اپنا کوئی نمائندہ اس اجلاس میں بھیجیں، اس خط کا لکھنا میرے سپرد کیا گیا اور میں نے اس میں دارالعلوم کا تعارف کراتے ہوئے اس کی اصلاحی کوششوں، عقیدۂ صحیحہ کی تبلیغ، علوم دینیہ بالخصوص کتاب وسنت کی اشاعت اور ردّ شرک وبدعات کے کارنامہ کا خاص طور پر ذکر کیا اور اس کی استدعا کی کہ ملک معظم اپنے نمائندہ کے طور پر کسی عالی مرتبہ عالم اور وزیر سلطنت کو شرکت کے لئے مامور فرمائیں، میرا پہلے خیال تھا کہ عالی مرتبت شیخ حسن عبداللہ آل الشیخ وزیر تعلیم عالی مملکت سعودیہ اس کے لئے زیادہ موزوں رہیں گے، پھر بعض مصالح کی بناء پر وزیر عدل شیخ ابراہیم ابن محمد ابن ابراہیم کا نام پیش کیا گیا، اس مجلس کے چند دن بعد ہی مجھے سعودی عرب کا سفر پیش آیا، (غالباً جامعہ اسلامیہ کی مجلس اعلیٰ میں شرکت کے لئے) حرمین شریفین سے فارغ ہو کر میں کسی ضرورت سے ریاض گیا، وہاں معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اس اجلاس میں شرکت اور مملکت سعودیہ کی نمائندگی کے لئے ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی وائس چانسلر جامعۃ الامام محمد بن سعود کو مامور فرمایا ہے، موصوف کو جب معلوم ہوا کہ میں ریاض آیا ہوا ہوں تو انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی تاکہ وہ اس اجلاس کی نوعیت اور پیمانہ کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرلیں، اور ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو کر جائیں، ان کو جب معلوم ہوا کہ اجلاس شعبی (عوامی) پیمانہ پر ہو رہا ہے، اور کئی لاکھ آدمیوں کی شرکت کی توقع ہے تو انھوں نے کہا کہ اس کو اتنے وسیع پیمانہ پر کیوں کیا جارہا ہے؟ میں نے دارالعلوم دیوبند کے عوام سے رابطہ کا ذکر کیا اور بتایا کہ اب اس کو محدود پیمانہ پر

www.abulhasanalinadwi.org

کرنا مشکل ہوگیا ہے، مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کے نمائندہ کی حیثیت سے جانے والے ہیں تو میں نے ضروری سمجھا کہ ان کا اکرام اور استقبال اسی پیمانہ پر ہوا اور ان کو پہلے اجلاس کا صدر بنایا جائے[1]، مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ حکومت سعودیہ ادارہ کی مدد بھی کرنا چاہتی ہے، اور ڈاکٹر ترکی نے میرے سامنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ان کے سامنے کچھ متعین منصوبے (PROJECTS) رکھے جائیں، جو پہلے سے متعین ہوں، میں اپنی مصروفیتوں کی بناء پر عین اجلاس کے موقعہ پر پہونچنے والا تھا، اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ ذمہ داروں کو اس کی اطلاع پہلے سے ہوجائے، اس مقصد سے میں نے عزیزی خلیل الرحمٰن عرف سجاد ندوی کو جو جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ میں پڑھ رہے تھے، اس مقصد کے لئے پہلے روانہ کیا، تاکہ وہ مولانا قاری محمد طیب صاحب اور ان کے رفقائے کار کو اس صورت حال سے مطلع کردیں، چنانچہ وہ پہلے پہونچ گئے، اور یہ طے ہوگیا کہ ڈاکٹر ترکی پہلے اجلاس کی صدارت کریں گے۔

میں ۱۹؍مارچ کو بمبئی پہونچ گیا، مجھے کسی دوست نے دہلی سے ٹیلی فون کے ذریعہ بتایا کہ افتتاحی اجلاس میں پرائم منسٹر مسز اندرا گاندھی شرکت کرنے والی ہیں، اور ان کو اس کی دعوت دی گئی ہے، مجھے اس اطلاع سے تکدر رہا کہ یہ ایک بے جوڑ بات ہے، اور یہ بات دارالعلوم کے مقام و روایات اور اس اجلاس سے میل نہیں کھاتی،

---

[1] میں نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ کوئی ایسی واحد، متفقہ اور بین الاقوامی شخصیت سامنے نہیں ہے، جس کو اول سے آخر تک اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا جائے، اور کوئی اس پر اعتراض نہ کرسکے اس لئے مناسب ہے کہ ہر اجلاس کا علیحدہ صدر رہو۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس کے اسٹیج پر اتنے مستند علماء تشریف رکھتے ہوں گے کہ وہاں کا ہر فعل اور ہر مظاہرہ دینی سند اور فتوے کا درجہ رکھے گا، اور وہ آئندہ کے لئے نظیر بن جائے گا ہیں ۲۰ مارچ کو دہلی پہونچ گیا میرے ساتھ ہمارے جدہ کے میزبان الحاج محمد نور (مالک عبدالغنی محمد نورولی کمپنی) ان کے فرزند عزیزی محمد یوسف نورولی، بمبئی کے احباب جن میں میرے میزبان الحاج غلام محمد (عرف محمد بھائی مالک با مبے آندھرا ٹرانسپورٹ) اور صوفی عبدالرحمٰن صاحب (فرم عمر بھائی چاند بھائی، ناگ دیوی اسٹریٹ) اور مجبی اسماعیل منصوری صاحب وغیرہ تھے، ہم لوگوں نے اجلاس کا ابتدائی وقت قصداً دہلی نظام الدین میں گزارا اور پھر بذریعہ کار ایسے وقت دہلی سے روانہ ہوئے کہ ہم میرٹھ کے پاس سے گزر رہے تھے کہ پرائم منسٹر کا ہیلی کاپٹر ان کو لے کر واپس آرہا تھا، ہم مغرب عشاء کے درمیان دارالعلوم پہونچے، ایسا اندازہ ہوا کہ مجمع قابو سے اور انتظامات دسترس سے باہر ہیں، بڑی مشکل سے مجھے اور میرے رفیقوں کو قیام کے لئے جگہ ملی، میں علیل بھی تھا، چند روز پیشتر نقرس کا حملہ ہوا تھا، اور مجھے چند قدم پیدل چلنا مشکل تھا۔

اگلے دن (۲۲ مارچ کو) جلسہ گاہ میں پہونچا تو انسانوں کا ایک جنگل نظر آتا تھا، اور میدان عرفات کا ایک ہلکا سا نقشہ، ہمارے دوست ڈاکٹر عبداللہ زائد (وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، متعدد عرب فضلاء اور معززین ڈائس پر موجود تھے، جن میں ہمارے دوست ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر وزیر اوقاف مصر، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، معالی الشیخ یوسف الحجی، (وزیر اوقاف کویت) مجبی عبداللہ العقیل وغیرہ موجود تھے، اس وقت میرے

www.abulhasanalinadwi.org

عربی میں تقریر کرنے کا پروگرام تھا، مجھ سے منتظمین نے عربی میں تقریر کرنے کا اشارہ کیا، مگر مجھے اس عظیم الشان مجمع کے سامنے (جو عربی سے نابلد تھا اور جو حدِ نگاہ تک نظر آتا تھا) عربی زبان میں تقریر کرنا ایک مصنوعی و نمائشی عمل نظر آیا جس کے لئے میرا ضمیر تیار نہیں ہوا، مجھے اس کا بھی احساس تھا (اور کسی حد تک علم بھی ہو چکا تھا) کہ ابھی تک اس عظیم مجمع کے سامنے جو ہندوستان کے کونہ کونہ سے اور دُور دَراز کے دیہاتوں اور گاؤں سے محبت و عقیدت کے جذبہ کے ساتھ اس شوق میں آیا ہے کہ وہ اپنے ایمان کو تازہ، دین و شریعت کے ساتھ اپنے رابطہ کو مستحکم اور ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال میں دین و ملت کے ساتھ وابستگی و وفاداری کے عزم کو پختہ بنا کر جائے گا، ابھی تک کوئی ایسا حیات بخش پیغام اور ان کے دینی شعور کو بیدار کرنے کی دعوت پیش نہیں ہوئی، جو ان کے اس سفر کا حاصل اور ''زادِ راہ'' ہو، زیادہ تر دارالعلوم کی تاریخ اور اکابر کا ذکر خیر ہوتا رہا ہے جس سے یہ کم سوادِ مجمع اپنی زندگی اور طرزِ عمل کے بارے میں کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا، اس مجمع کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ایسی تقریر کرنے کا زبردست داعیہ پیدا ہوا جس سے سادہ دل بندگانِ خدا جو دُور دَراز حصوں سے اپنا خرچ کر کے علماء کی زیارت اور اللہ و رسول کی بات سننے کے شوق میں آئے ہیں، ایک نیا دینی اعتماد اور ہندوستان میں ایک صاحبِ دعوت اور حاملِ شریعت ملت کی حیثیت سے رہنے اور اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کی ذمہ داری کا احساس لے کر جائیں، اور ہم لوگوں (داعیوں اور ذمہ داروں) کو خدا اور رسول کے سامنے جوابدہ نہ ہونا پڑے کہ ان اللہ کے بندوں کو کس لئے بلایا گیا تھا، میں نے عربی میں چند لفظ کہہ کر جن میں عرب فضلاء سے عربی میں تقریر نہ کرنے کی معذرت کی گئی، اور بتایا گیا کہ یہ عظیم مجمع

www.abulhasanalinadwi.org

اپنی زبان میں دینی پیغام سننے کا مستحق بھی ہے اور مشتاق بھی، اس لئے میں اردو میں تقریر کروں گا، میں نے تقریر شروع کی، میں محسوس کر رہا تھا کہ آورد سے زیادہ آمد ہے، اور اس میں ان سادہ دل اور صاحبِ ایمان سامعین کا دخل ہے جو ہمہ تن گوش ہیں۔

یہاں پر اس تقریر کے چند ٹکڑے نقل کئے جاتے ہیں، میں نے ہندوستانی مسلمانوں اور اس پُرخلوص مجمع کو اس کی وہ ذمہ داری یاد دلاتے ہوئے، جو اس ملک میں نہ صرف اپنے ملی تشخص کو باقی رکھنے کے سلسلہ میں بلکہ اس میں داعیانہ اور قائدانہ کردار ادا کرنے کے سلسلہ میں ان پر عائد ہوتی ہے، عرض کیا:۔

"ہم صاف اعلان کرتے ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کریں کہ ہم ایسے جانوروں کی زندگی گزارنے پر ہرگز راضی نہیں جن کو صرف راتب اور تحفظ (SECURITY) چاہئے کہ ان کو کوئی مارے نہیں، ہم ہزار بار ایسی زندگی گزارنے اور ایسی حیثیت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں اور نمازوں کے ساتھ رہیں گے، بلکہ ہم تراویح اور اشراق و تہجد تک چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، ہم ایک ایک سنت کو سینہ سے لگا کر رہیں گے، ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو سامنے رکھ کر کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں۔

مسئلہ ایک مدرسہ، یا کسی جامعہ کا نہیں، نہ کسی مکتبِ خیال، نہ کچھ منصوبوں اور عمارتوں کی تکمیل کا ہے، مسئلہ علوم ایمانی کے باقی رکھنے اور اسلامی شخصیت کے تحفظ کا ہے، آپ دوسروں کے پیچھے چلنے کے لئے ہرگز نہیں پیدا کئے گئے اور نہ خدا نے آپ کو اس ملک میں اس لئے بھیجا ہے کہ آپ دوسروں کے

www.abulhasanalinadwi.org

غاشیہ بردار ہوں، اور آپ لوگوں کے چشم و ابرو کو پہچاننے کی کوشش کریں کہ ملک کس رخ پر جا رہا ہے، ہم کسی قومی دھارے سے واقف نہیں ہم تو صرف اسلامیت کے دھارے کو جانتے ہیں، ہم تو دنیا کی قیادت و امامت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

آج ملک خودکشی کے لئے قسم کھا چکا ہے، وہ آگ کے خندق میں گرنے کے لئے تیار ہے، وہ بداخلاقی اور انسانیت کشی کے دلدل میں ڈوب رہا ہے، آپ ہی ہیں، جو ہندوستان کیا پورے ایشیا میں کسی ملک کو بچا سکتے ہیں، آپ اللہ و رسول کی بات کہئے، آپ کو کوئی ضرورت نہیں کہ آپ نیلام کی منڈی میں اتر آئیں اور اپنا سودا کرانے لگیں کہ بولی بولی جائے، آپ متاع نایاب ہیں، اللہ کے سوا آپ کی خریداری کا کوئی حوصلہ نہیں کر سکتا، اس لئے میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں (کاش میں آپ کے دلوں اور دماغوں پر بھی چوٹ لگا سکتا) کہ اس ملک کو تنہا آپ بچا سکتے ہیں، اس لئے کہ آپ کے پاس عقیدۂ توحید، اور انسانی مساوات کا اصول ہے، آپ کے پاس اجتماعی عدل کا مکمل نظام موجود ہے، آپ ہی ہیں جو ہر چیز سے بالاتر ہیں، آپ ہی ہیں، جن کے پاس ایمان بالآخرۃ ہے اور جو "اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" پر یقین رکھتے ہیں، آپ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی نظر طاقت اور قوت پر رہا کرتی ہے، اور جن کی نگاہ میں مال و متاع اور اکثریت ہی سب کچھ ہے، اور نہ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے، جو انتخابات میں کامیابی اور پارلیمنٹ تک پہونچ جانے ہی کو سب سے بڑی معراج سمجھتے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

میرے عزیزو اور دوستو! میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کی روح کا یہی پیغام ہے، حضرت شیخ الہند اسی فکر میں پگھلتے اور گھلتے رہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مولانا مدنیؒ (اپنے اپنے خاص طرز اور اسلوب سے) اسی کے لئے ہمیشہ سوزاں ولرزاں رہے، کہ ہندوستانی مسلمان اپنی خصوصیات اور ملّی تشخصات کے ساتھ اس ملک میں باقی رہیں، قرآن وسنت کو سینہ سے لگائے رکھیں، اختلافی مسائل چھیڑنے کے بجائے توحید وسنت پر زور دیں، دیوبند کا یہی پیغام ہے، اور اس کی یہی خصوصیت رہی ہے، کہ اس نے سرمایۂ ملت کو بچانے کی کوشش کی"!

پھر میں نے ضرورت سمجھی کہ خود فضلائے دار العلوم کو ان کی ثقافت ومسلک کے عناصر ترکیبی اور ان کے جماعتی امتیازات بتائے جائیں جن کی حفاظت ونمائندگی کی اس وقت بھی ضرورت ہے، میں نے کہا:-

"اس درس گاہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اختلافی مسائل کے بجائے توحید وسنت پر اپنی توجّہ مرکوز کی، (اور یہ وہ وراثت اور امانت ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے وسیلہ سے اس کو ملی اور ابھی تک اس کو عزیز ہے۔)

دوسری خصوصیت اتباع سنت کا جذبہ اور فکر ہے۔

تیسری خصوصیت تعلق مع اللہ کی فکر اور ذکر وحضوری اور ایمان واحتساب کا جذبہ ہے، چوتھا عنصر ہے اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور کوشش اور دینی حمیّت وغیرت، یہ چار عناصر مل جائیں تو دیوبندی بنتا ہے اگر ان میں سے

کوئی عنصر کم ہو جائے تو دیوبندیت ناقص ہے، فضلائے دارالعلوم دیوبند کا یہی شعار رہا ہے، اور وہ ان چاروں چیزوں کے جامع رہے ہیں۔"[1]

تقریر کے دوران اور اس کے بعد سامعین پر ایک خاص اثر نظر آیا، متعدد احباب نے جو اس جلسہ میں شریک تھے، سامعین کے تاثر کا ذکر کیا اور اندازہ ہوا کہ یہ لوگوں کے دل کی بات تھی اور اس سے ان کی روح کی پیاس بجھی، جہاں تک دیوبند کے مسلک اور اس کے فضلاء و منتسبین کی ہیئت ترکیبی اور مسلک و شعار کی ترجمانی کا تعلق ہے، میری تقریر کے معاً بعد مولانا مفتی محمود صاحب مرحوم (سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد پاکستان) جو پاکستان میں مسلک دیوبند کے اہم نمائندہ سمجھے جاتے تھے، اور ہندوستان میں عرصہ تک مدرسہ شاہی مراد آباد میں تدریسی خدمات انجام دے چکے تھے، کھڑے ہوئے اور انھوں نے میری تائید میں مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ دیوبندیت کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا وہ سو فیصدی صحیح ہے۔

میری اس تقریر سے قطع نظر جلسہ اس حیثیت سے بھی کامیاب رہا کہ فضلائے دارالعلوم کو (جن کی ایک بڑی تعداد پاکستان اور بعض بیرونی ممالک سے بھی آئی ہوئی تھی) عرصہ کے بعد ایک دوسرے سے ملنے کا موقعہ ملا، انھوں نے اپنی مادرِ علمی کو دیکھا اور اس کی وسعت و ترقی اور نئی تعمیرات کی دید سے اپنی آنکھیں روشن کیں، مسلمانوں نے خصوصیت سے اور باشندگانِ ملک نے عمومیت کے ساتھ نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ علماء کے اثرات کا اندازہ کیا، اور محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اب بھی دینی علوم اور دینی نظامِ تعلیم سے کس قدر دلچسپی اور گرویدگی ہے، اور ان کے لئے اس میں کیا مقناطیسی اثر ہے،

---

[1] پوری تقریر رسالہ "الفرقان" "تعمیر حیات" وغیرہ میں شائع ہوئی ہے "مجلس نشریات اسلام" کراچی نے "زندہ رہنا ہے تو میرِ کارواں بن کر رہو" کے عنوان سے مستقل رسالہ کی شکل میں اس کو شائع کر دیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جو ہزاروں انسانوں کو دُور دَراز سے کھینچ لیتا ہے۔

اجلاس صد سالہ کے بعد

لیکن تقدیری بات یہ ہے کہ اس کامیاب اور یادگار اجلاس کے بعد ہی سے دارالعلوم کی تاریخ میں اختلاف و انتشار کا ایک نیا دور شروع ہوگیا جس میں شاید اس ادارہ کی مقبولیت، اس کے قوی اثرات اور ان سے فائدہ اٹھانے کے وسیع امکانات کے علم کا بھی دخل رہا ہو جن کا اس جلسہ نے ثبوت دیا، یہ اختلاف حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اور مجلس شوریٰ کے درمیان ایسی نمایاں شکل میں نمودار ہوا، جو ارکان مجلس اور متعلقین کے حلقہ میں محدود نہیں رہا، پبلک اور پریس میں بھی پہونچ گیا، مجھے یاد ہے کہ اجلاس کے چند روز بعد دارالعلوم دیوبند سے متعلق بعض اہم مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے چند نمایاں ارکان مجلس کو لکھنؤ دعوت دی گئی، تاکہ علیحدہ بیٹھ کر ان پر غور کر لیا جائے، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور غالباً مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی بھی تشریف لائے تھے، میں اور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی وہیں موجود تھے، مولانا قاری محمد طیب صاحب سے جب میں نے مصافحہ کیا تو پہلا جملہ جو ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ "ہر طرف سے ہم کو اجلاس کی کامیابی پر مبارکباد دی جارہی ہے، لیکن ہمارے لئے تو وہ بڑی مشکلات کا سبب بن گیا" (أو کما قال) آخر میں یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے اس نقطہ پر پہونچا کہ قاری صاحب نے دارالعلوم کے دستور کے کالعدم اور اس کی مجلس شوریٰ کے ختم ہونے کا دہلی کے ایک جلسۂ عام میں اعلان کر دیا،

www.abulhasanalinadwi.org

اور دار العلوم کے لئے ایک ایڈہاک کمیٹی بنادی، دوسری طرف مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۷، ۱۸ جنوری ۱۹۸۲ء؁ دیوبند میں قاری صاحب کو اپنے منصب سے سبکدوش کر دیا، اور نئے مہتمم کا انتخاب کیا[1]، اور متعدد اساتذہ و ملازمین دار العلوم کی ایک بڑی تعداد کے تعلقِ ملازمت کو ختم کر دیا، اس کے مقابلہ میں قاری صاحب کے چند متنسبین نے دیوبند کی جامع مسجد میں ایک متوازی مدرسہ قائم کر لیا، دار العلوم کی رقوم (جو جمع تھیں) منجمد کر دی گئیں، اور ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ متنسبین دار العلوم میں جماعت کے اختلاف اور محاذ آرائی سے (جو مقتدیٰ کی حیثیت رکھتی ہے) بڑا رنج اور ندامت محسوس کی گئی، اور اس کا برّ صغیر کے پورے دینی نظام تعلیم اور اس کے مرکزوں اور نمائندوں پر بڑا اثر پڑا۔

بعض نیازمندوں نے جو مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے، اس اختلاف کے رفع کرنے کی امکانی کوشش کی، باربار فریقین کے ذمہ داروں اور سربراہوں سے انفراداً و اجتماعاً ملے اور ایک ایسا فارمولا بھی پیش کیا، جو امکانی حد تک دونوں کے لئے قابل قبول تھا[2]، ان کی کوشش تھی کہ علماء کے وقار، دینی تعلیم کے اخلاقی نتائج، اور قدیم نظام تعلیم کے مستقبل کے لئے جو خطرہ پیدا ہوگیا ہے، وہ حتی الامکان دور ہو، اور اس میں یہ خواہش بھی کام کر رہی تھی (جس کے محرّکات خالص اخلاقی اور بے غرضانہ تھے)

---

[1] مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری جو دار العلوم کے قدیم فاضل اور قدیم رکن شوریٰ ہیں۔

[2] فارمولا یہ تھا کہ قاری صاحب مدظلہ دستور کو تسلیم کرلیں اور مجلس شوریٰ کو دار العلوم کی اعلیٰ یا اختیار کمیٹی (ہیئت حاکمہ) (GOVERNING BODY)۔۔ مان لیں، جیسا کہ ابھی تک تھا، اس کے مقابلہ میں جو فیصلے اس دور اختلاف میں کئے گئے ہیں مجلس شوریٰ ان پر از سر نو غور کرے گی اور اتفاق رائے سے ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔

www.abulhasanalinadwi.org

کہ قاری صاحبؒ جو اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں ہیں[1] اور جو نہ صرف دارالعلوم کے بانی اور اس کے روحِ رواں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے قریب ترین انتساب رکھتے ہیں، بلکہ طبقۂ علماء میں اس وقار و امتیاز کے مالک ہیں جو مشکل سے کسی دوسرے کو حاصل ہوگا،[2] پھر نصف صدی سے زائد مدت تک انھوں نے دارالعلوم کی خدمت کی ہے، اور اس کو ترقی کے مدارج عالیہ تک پہونچایا ہے، اس دنیا سے (وقت مقررہ پر) اس حالت میں جائیں کہ ان کو دارالعلوم سے جدائی اور اپنی جماعت کی بے اعتمادی کا داغ نہ لگا ہو، افسوس ہے (کہ جیسے فریقانہ کشمکش کے واقعات میں اکثر تجربہ ہوا ہے) یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی، اور اس سلسلہ میں اسی گروہ نے تعاون نہیں کیا، جس کو قاری صاحب کا وقار، ان کا سکون خاطر، اور دارالعلوم سے ان کا ارتباط سب سے زیادہ عزیز ہونا چاہئے تھا، اور اس کو اپنے ہر مفاد و تاثر پر ترجیح دینی چاہئے تھی، بالآخر جس کا خطرہ تھا وہی پیش آیا، اور ۶؍شوال ۱۴۰۳ھ (۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء) کو انھوں نے اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی غفر اللہ لہ ورفع درجاتہ، اس سے زیادہ تفصیل اور وضاحت اس کتاب کا موضوع نہیں، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی سوانح ـــــ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا موضوع ہے، اور اس کی تفصیلات وہیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

---

[1] اس وقت قاری صاحبؒ کی عمر شمسی حساب سے ۸۵ سال اور قمری حساب سے ۸۷ سال تھی۔

[2] اسی عام مقبولیت و وقار کا نتیجہ تھا کہ ان کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا جس میں مسلمانوں کے تمام مختلف الخیال گروہوں اور فرقوں کی نمائندگی ہے، بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا، اور وہ آخر وقت تک اس پر متمکن رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مرادآباد کا المیہ

۱۹۸۰ء کے پارلیمانی الیکشن میں مسز اندرا گاندھی رائے بریلی اور میدک (آندھرا پردیش) دونوں جگہ سے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئیں، سنجے گاندھی امیٹھی سے منتخب ہوئے، اور آئی کانگریس کو کھلی کامیابی حاصل ہوئی۔

اس دور کا (جو تادم تحریر قائم ہے) سب سے افسوسناک واقعہ مرادآباد کا وہ فساد (اور صحیح معنی میں یک طرفہ حملہ) تھا، جو ۱۳ اگست ۱۹۸۰ء کو عید کے روز عیدگاہ میں عین عید کی نماز کے اختتام پر پیش آیا، یوں تو فرقہ وارانہ فسادات (دو طرفہ ہوں یا یک طرفہ) تقسیم کے بعد سے ہندوستان کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئے ہیں، ۱۹۶۴ء میں جمشید پور، راوڑکیلا کے فساد میں جیساکہ اوپر گزر چکا ہے، چھ ہزار مسلمان مارے گئے تھے، لیکن مرادآباد کے فساد میں بدنمائی و بدنامی کا پہلو اس لئے غالب اور نمایاں رہا کہ اولاً وہ عین عید کے دن عیدگاہ میں پیش آیا، جو ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت اور دنیا کے مذاہب میں دوسرے سب سے بڑے مذہب کی سب سے بڑی خوشی کا دن ہوتا ہے، اور اس کے اعمال و اشغال میں (جو صرف دوگانۂ شکر ادا کرنے، غسل اور صفائی اور نئے یا صاف کپڑے پہننے اور ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دینے سے زیادہ نہیں) کوئی جزء کسی فرقہ کے نزدیک قابلِ اعتراض نہیں ہے، خوشی کے ایسے موقعوں اور مظاہروں کا احترام، بلکہ ان کی مسرت میں کسی حد تک شرکت وحشی قوموں میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ انسان کے آخری جذبۂ شرافت اور رشتۂ شہریت کا تقاضا ہوتا ہے۔

دوسرا سبب مقتولین میں بہت بڑی تعداد میں کمسن و معصوم بچوں کی شرکت تھی،

www.abulhasanalinadwi.org

جو بڑے ذوق وشوق سے بالعموم نئے کپڑے پہن کر اپنے بزرگوں اور عزیزوں کے ساتھ عیدگاہ آتے ہیں، چونکہ مرادآباد کی عیدگاہ کے پاس میلہ بھی لگتا ہے، اور لوگ اپنے بچوں کو میلہ دکھانے اور کھلونے وغیرہ خریدنے کے لئے لے جاتے ہیں، اس لئے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں (متوسط درجہ کے شہروں میں) یہاں عیدگاہ میں بچوں کی تعداد نمایاں ہوتی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ فسادات عام طور پر شہر یا ریاست کے پھیلے ہوئے رقبہ میں اور وسیع مدت کے درمیان ہوتے ہیں لیکن یہ فساد ایک معیّن ومحدود جگہ اور مختصر وقفہ میں ہوا، جس نے فساد سے زیادہ اس کو ایک فوجی حملہ اور لشکر کشی کی شکل دیدی۔

واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مسلمان عیدگاہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عیدگاہ کے اندر سؤر چلا آیا (جو غالباً سازش اور پہلے سے بنے ہوئے منصوبہ کا نتیجہ تھا) جو لوگ مسلمانوں کی تہذیب اور مزاج سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو سارے گندے جانوروں میں سؤر سے سب سے زیادہ نفرت اور وحشت ہوتی ہے، خاص طور پر اس موقعہ پر جب وہ نہا دھو کر آئے تھے، پولیس والوں سے اس بات پر تو تو میں میں ہوئی، نماز پڑھنے والے کہتے تھے کہ سؤر کیسے آیا؟ (واضح رہے کہ عید کے دن نماز کے بعد خطبہ ہوتا ہے) اس کو باہر کرو، لیکن پولیس والوں کو اس میں اپنی توہین محسوس ہوئی، کسی گوشہ سے یا کسی کیمپ سے جو وہاں لگے ہوئے تھے، ڈھیلہ بھی آیا، بہت عرصہ سے وہ لوگ جن کو اللہ نے دیکھنے کے لئے آنکھیں دی ہیں، یہ محسوس کر رہے تھے (اور جیسا کہ "پیامِ انسانیت" کی بعض تقریروں میں کہا بھی گیا) کہ ہمارے ہندوستانی معاشرہ سے (جس میں کسی طبقہ کا استثناء نہیں) برداشت کرنے کی طاقت روز بروز رخصت ہوتی جا رہی ہے، اور یہ خاص طور پر ایک ایسے معاشرہ کے لئے جو مختلف عناصر، طبقوں اور فرقوں سے

www.abulhasanalinadwi.org

مرکب ہے، بڑی تشویشناک بات ہے، چنانچہ اتنی بات پر ایک طرف سے اظہار غضب، دوسری طرف سے وحشیانہ فائرنگ شروع ہوگئی، بعض اندازوں کے مطابق اس وقت عیدگاہ میں ساٹھ ہزار بڑے اور اتنے ہی بچے تھے، مراد آباد کی روایت ہے کہ وہاں چھوٹی مسجدوں میں عام طور پر نماز عید نہیں ہوتی، مسلمان زیادہ تر عیدگاہ ہی میں نماز پڑھنے آتے ہیں، چنانچہ یہ عیدگاہ جو نماز پڑھنے کی جگہ (مصلیٰ) تھی، مقتل بن گئی، نوبھارت ٹائمز نے دو سو مقتولین کا ذکر کیا، دوسرے ذرائع کے مطابق چار سو پانچ سو سے زیادہ آدمی پولیس کی فائرنگ سے عیدگاہ کے میدان میں شہید ہوئے[1]۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض رول پی، اے، سی (P.A.C) کا رہا، جس پر شہریوں کے جان ومال کے تحفظ کی سب سے بڑی ذمہ داری عائد اور مسلح ہونے کی بنا پر اس کی ان میں سب سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اور جس کو مطلقاً غیر جانب دار ہونا چاہئے، لیکن علی گڑھ، میرٹھ، مراد آباد، بہار کے مختلف شہروں کے تجربہ نے بتایا کہ پولیس کا یہ گروہ ان فسادات میں سب سے زیادہ ملوث اور جانب دار ثابت ہوا ہے، مسلمانوں کی مختلف تنظیموں اور جماعتوں نے حکومت سے مسلسل اس کی شکایت کی ہے، لیکن اس کا تدارک کرنے کے بجائے حزب مخالف تک کے بعض لیڈروں نے اس کی حمایت کی اور اس پر تنقید کرنے کو مضر بتایا، مراد آباد کے اس وقت کے ڈی، ایم کا ریکارڈ بھی اس سلسلہ میں بہت مشتبہ اور جانبدارانہ تھا۔

---

[1] محمد اعظم خاں صاحب ایم، ایل، اے، نے اپنی اسمبلی کی تقریر میں دعویٰ کیا کہ دو ہزار مسلمان مقتول ہوئے، جن میں سات سو بچے تھے، امام عیدگاہ ڈاکٹر کمال فاہم صاحب نے بتایا کہ سجدہ اندازہ تین صف لاشیں تھیں، ہر صف میں ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) آدمی مارے گئے، بہت سے لوگ مسجد سے باہر پی، اے، سی کی گولیوں سے مرے۔

ابتداءً یہ فساد پی۔ اے۔ سی اور مسلمانوں کے درمیان محدود رہا، مگر دوسرے ہی دن فرقہ پرست اور شرپسند عناصر نے اسے فرقہ وارانہ رخ دے کر ہندو مسلم فساد بنا دیا، اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ مراد آباد عرصہ سے ایک بڑا صنعتی و تجارتی مرکز بن گیا تھا، اور اس شہر کی خاص صنعت (ظروف سازی) جو باہر کے ملکوں بالخصوص سعودی عرب اور خلیج میں بہت مقبول تھی، زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ذریعہ سے بڑی مقدار میں فارن اکسچینج اس شہر میں آ رہا تھا، اور اس کا مسلمانوں کے معیار زندگی کی بلندی، خوشحالی، نئی تعمیرات اور نئے اداروں کے قیام کی شکل میں اظہار ہو رہا تھا، فسادات کے تجزیہ نے بتایا ہے کہ وہ شہر اور مقامات جہاں کوئی صنعت یا تجارت نمایاں طریقہ پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے فساد کا پہلے نشانہ بنتے ہیں، مثال کے طور پر علی گڑھ، بنارس، میرٹھ اور مراد آباد کا نام لیا جا سکتا ہے۔[۱]

اس بدنما اور بدنام فساد پر حکومت کی مشینری کو جس طرح حرکت میں آنا چاہیئے تھا، نہیں آئی، اس میں اس الیکشنی سیاست کا بڑا دخل ہے جس میں فیصلوں اور اقدامات کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ آئندہ الیکشن پر اس سے کیا اثر پڑے گا؟ شہر اور ریاست کا انتظامیہ ADMINISTRATION (جو الیکشن کرانے اور جتانے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے) اس سے کیا اثر لے گا؟ رائے دہندگان VOTERS کی تعداد کس طرف زائد ہے؟ اسی چیز نے پورے معاشرہ کو ملوث CORRUPT انتظامیہ کو مفلوج اور جرائم پیشہ لوگوں کو آزاد بلکہ شیر بنا رکھا ہے، یہاں بھی یہی ہوا کہ جس تیزی سے مراد آباد کے انتظامیہ حکام اور

۱ؔ اس کی کھلی ہوئی تازہ مثال بھیونڈی اور بمبئی کا حالیہ فساد ہے جو ان سطور کی تحریر سے (جو اتفاق سے بمبئی ہی میں لکھی جا رہی ہیں) مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے ہوا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

پولیس افسران میں ردوبدل کرنے کی ضرورت تھی نہیں ہوئی، شہر میں ہفتوں خوف و ہراس طاری رہا، مکانات اور دکانیں جلائی گئیں، مسجدیں شہید ہوئیں، عورتیں اور نابالغ بچے سفاکی کا نشانہ بنے، اور کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا، سارے ملک میں اس پر احتجاج ہوا، باہر کے پریس نے بھی اس کو بہت نمایاں کیا، اور عید کے موقعہ پر ہونے نے اس کی شناعت اور نامعقولیت کو بہت بڑھا دیا۔

مسلم مجلس مشاورت کے عاملہ کا اجلاس اور مرادآباد کا دورہ

مسلم مجلس مشاورت کے قائدین نے اس فساد کی سنگینی کو پورے طور پر محسوس کیا، اس کے قائدین چونکہ اپنی اپنی جماعتوں کے سربراہ اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنی تنظیموں اور جماعتوں کی طرف سے بروقت احتجاج اور مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی میں حصہ لیا، دعوت نامہ بھیجنے اور لوگوں کے اوقات کی رعایت کرنے میں وقت لگتا ہے، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مجلس مشاورت کی مجلس عاملہ کی دہلی میں بجوں کے گھر میں میٹنگ ہو سکی، اس جلسہ میں مجلس کے تقریباً تمام ذمہ دار موجود تھے، یہ بات طے شدہ تھی، کہ مجلس کا ایک نمائندہ وفد جو زیادہ سے زیادہ مسلم جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ہوگا، مرادآباد جائے گا اور وہاں فساد سے متعلق براہ راست معلومات حاصل کرے گا، اور اس سلسلہ میں جو کوششیں ضروری ہیں، انجام دے گا، لیکن چونکہ یہ ذمہ دار ملک کے مختلف حصوں سے آئے تھے، اور اس وقت تک مرادآباد جانے کی کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی تھی، نیز اس دورہ کے سلسلہ میں (تاکہ معتدل اور نارمل حالات میں وفد اپنا کام کر سکے) حکومت اور انتظامیہ سے بھی رابطہ پیدا کرنا ہوگا، تاکہ اس کو نئے ہنگامہ اور شر انگیزی کے لئے بہانہ نہ بنایا جا سکے،

www.abulhasanalinadwi.org

میٹنگ کے دوسرے ہی دن کی تاریخ جانے کے لئے نہ رکھی جاسکی کہ انتظامات میں کچھ دیر لگ گی، بعض ارکان کی کچھ مجبوریاں بھی تھیں کہ وہ دوسرے ہی دن نہیں جاسکتے تھے، اس موقع پر (مفتی صاحب صدر مجلس کی نرم مزاجی اور رعایت کی وجہ سے) بہت سے ایسے نوجوان، اہل شہر اور علی گڑھ کے طالب علم جلسہ میں آگئے تھے، جو نہ مجلس کے رکن تھے نہ مدعو تھے، ارکان نے جب وفد کے جانے کے انتظامات پر غور کرنا شروع کیا اور اس کے لئے وقت کی کچھ گنجائش ضروری سمجھی گئی، تو اچانک ان نوجوانوں میں ہیجان پیدا ہوگیا، اور انھوں نے نعرے لگانے شروع کئے "یا تو کل مراد آباد جایئے یا اپنی قبروں میں جاکر سو جایئے" وہ اس بوڑھی قیادت پر بھی فقرے کس رہے تھے، اور جامہ سے باہر ہو رہے تھے، اس مجلس میں مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب صدر مجلس مشاورت، مولوی محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی، مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ، اور جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر مسلم لیگ، سید شہاب الدین صاحب ایم، پی شیخ ذوالفقار اللہ صاحب صدر مسلم مجلس و سابق وزیر مالیات، مولوی عبدالکریم صاحب پاریکھ ناگپور، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی، اور کئی موقر و محترم افراد موجود تھے، جنھوں نے اپنے اپنے فکر و مطالعہ کے مطابق دین و ملت کی خدمت انجام دی تھی، اور ان میں سے کوئی بھی ملت فروش یا ننگ دین و وطن نہ تھا، اور نہ کبھی حکومت کا آلۂ کار رہا تھا، ہنگامہ اتنا تیز ہوا کہ یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں ان بوڑھوں پر کسی نوجوان کا ہاتھ نہ اٹھ جائے، اس وقت ملت کے ان نوجوانوں کی (جن کے لئے نبوت کی یہ تعلیم موجود تھی کہ "من لم یوقر کبیرنا فلیس منا" (جو ہمارے بڑے کی توقیر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے) مزاجی کیفیت پھر نمایاں ہو کر سامنے آگئی کہ وہ اپنے قائدین اور ملت کا کام کرنے والوں کی عزت کو دم کے دم میں خاک میں

www.abulhasanalinadwi.org

ملا دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، یہاں پر ساری کمزوریوں کے باوجود ملک کی اکثریت کے نوجوانوں کا یہ امتیاز سامنے آیا کہ وہ بڑے سے بڑے اختلاف کے موقعہ پر بھی اپنے کہن سال لیڈروں کے ساتھ یہ سلوک گوارہ نہیں کرتے اور ان کی مخالفت توہین و تذلیل کی حد تک نہیں پہونچتی، اسی چیز نے گاندھی جی، موتی لال نہرو، اور مالوی جی تک کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ اپنے منصوبوں کی تکمیل کر سکیں، اور اس کے نتیجہ میں انھوں نے بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کی، اس واقعہ نے ایک بار پھر ملت کے مستقبل کی طرف سے تشویش اور فکر پیدا کر دی کہ وہ جن نازک حالات سے گزر رہی ہے، ان میں وہ کیسے دین و ملت کے سرمایہ کو بچا سکے گی، اور قیادت کے ہفت خواں کو (جو بڑے صبر و تحمل، ایثار و قربانی، اعتماد و احترام کا متقاضی ہے) سر کر سکے گی؟

۱۵ ستمبر کو مشاورت کا ایک وفد وزیر اعظم صاحبہ سے ملا اور ان کو اپنے مراد آباد جانے کا پروگرام بتایا اور فساد پر جلد قابو پانے کی طرف توجہ دلائی، وفد سواریوں کے انتظام کی وجہ سے اگلے دن مراد آباد روانہ نہیں ہو سکا، وہ ۱۷ کی صبح مراد آباد روانہ ہوا، تقریباً ۱۱ بجے دن کو وہاں پہونچ گیا، یہ وفد انیس ۱۹ آدمیوں پر مشتمل تھا، جن میں تقریباً مجلس کے سب اہم ارکان اور مسلم تنظیموں اور جماعتوں کے اکثر ذمہ دار شریک تھے، کمشنر مراد آباد مسٹر ٹکرو، ڈی، آئی، جی، کے، ڈی شرمانے وفد سے ملاقات کی اور گسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا انتظام کیا، اور شہر کے مسلم و غیر مسلم رہنماؤں اور نمائندوں کو ملنے اور اپنی بات کہنے کا موقعہ دیا، وفد نے ان کی گفتگو اطمینان کے ساتھ سُنی، فساد اور اس کے محرکات کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، غیر مسلم مقامی نمائندوں اور با اثر لوگوں کی بھی ایک تعداد تھی، ہر ایک نے اپنے اپنے زاویۂ نظر سے واقعہ پر روشنی ڈالی اور

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے اسباب بیان کئے، وفد کے بعض ممتاز ارکان نے جن میں راقم سطور بھی تھا، اس شرم ناک واقعہ پر اپنی حیرت واستعجاب اور تأسف و تأثر کا اظہار بھی کیا، غیر مسلم نمائندوں میں سے مسٹر دیانند گپتا نے مجھ سے خاص طور پر الگ بات کرنے کا وقت مانگا، انھوں نے اپنی تنہائی کی گفتگو میں اس فساد کا بڑا سبب ان مسلم اداروں کے قیام کو بتایا جو مدارس اور جامعات کے نام سے مراد آباد آنے والے اور مراد آباد سے جانے والے تین راستوں پر بڑے وسیع احاطوں اور رقبے میں قائم ہو رہے ہیں، اور جن کو مسلم پاکٹس کی شکل دی جا رہی ہے، گویا ان کے نزدیک یہ چھوٹے چھوٹے پاکستان بن رہے ہیں، مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ابھی تک دلوں میں تلخی، ناگواری اور بدگمانی پائی جاتی ہے، اس کو دور کرنے کے لئے بڑی حکمت، سلیقہ اور وقت کی ضرورت ہوگی، اس موقعہ پر ان کاموں کے علاوہ جو حکومت، انتظامیہ اور سیاسی رہنماؤں کو انجام دینے چاہئیں "پیام انسانیت" کے طرز کی تحریک و مہم کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی کہ وہی اس کا مستقل علاج ہے۔

مسلمان ذمہ داروں نے اس کا اعتراف کیا کہ تازہ انتظامی تبدیلیوں سے حالات کچھ بہتر ہونا شروع ہو گئے ہیں، انھوں نے یہ رائے بھی دی کہ اگر سرکاری افسران بھی اصرار کریں تو بھی شب میں قیام نہ کیا جائے، تاکہ شرپسند عناصر کو مزید شرپسندی کا بہانہ نہ ملے، وفد نے محسوس کیا کہ اس نے اپنا کام کر لیا ہے، اور مقامی حضرات خلوص سے یہ مشورہ دے رہے ہیں، اس لئے انھوں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور رات ہی کو وہ مراد آباد سے روانہ ہو گئے، بعض حلقوں کو اس پر بھی اعتراض رہا کہ واپسی میں اتنی عجلت کیوں کی گئی؟ انھوں نے اس کو خوف و کمزوری پر محمول کیا، حالاں کہ واقعہ ایسا نہ تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

پیامِ انسانیت کنونشن لکھنؤ

مرادآباد کے المیہ نے (جس کے ساتھ علی گڑھ، الٰہ آباد اور متعدد دوسرے شہروں کے فسادات بھی شامل ہوگئے) پیامِ انسانیت کی تحریک کی ضرورت اور اس کی افادیت کو اور زیادہ واضح اور ایک بدیہی حقیقت بنا دیا، اور شدت سے اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ کل ہند سطح پر ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کو لکھنؤ میں مدعو کیا جائے، اور تازہ واقعات کی روشنی میں جنھوں نے صرف مسلمانوں ہی کو جھنجھوڑ کے نہیں رکھ دیا ہے، ملک کے ہر صاحبِ ضمیر انسان کو جو واقعات سے غیر جانبدارانہ نتیجہ نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ملک کی موجودہ صورتِ حال کی سنگینی پر غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے، راہِ عمل تلاش کی جائے، اس بڑے اجتماع کے لئے جس میں مختلف ریاستوں اور مختلف حلقوں کے حسّاس اور دردمند انسانوں، دانشوروں اور ملک کے بہی خواہوں کو معقول تعداد میں جمع کرنا مقصود تھا، وقت چاہئے تھا، اس لئے ۲۷؍۲۸؍اکتوبر کی تاریخیں اس اہم اجتماع کے لئے رکھی گئیں، اور لکھنؤ کی سفید بارہ دری قیصر باغ کو (جس نے ہندوستان کے بہت سے تاریخی اور فیصلہ کن اجتماعات اور جلسے دیکھے ہیں) اس اجلاس کے لئے تجویز کیا گیا۔

یہ اجلاس ان تاریخوں (۲۷؍۲۸؍اکتوبر ۱۹۸۰ء) میں منعقد ہوا، اور عرصہ کے بعد ایک نمائندہ اور منتخب جلسہ ایسے سکون و وقار کے ساتھ ایک بامقصد ماحول میں دیکھنے میں آیا، اس میں ملک کے چیدہ دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسر، متعدد سابق و حال وزراء، سابق چیف سکریٹری، سماجی و سوشل ریفارمر و کارکن، ادیب و شاعر، اساتذہ و معلّمین متعدد سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار، تاجر، وکیل و ڈاکٹر، اور ہندوستان کے مختلف

www.abulhasanalinadwi.org

مذاہب کے لوگ شریک ہوئے، میں نے مناسب سمجھا کہ بلا کسی تواضع اور انکساری کے میں ہی صدارت کی ذمہ داری قبول کروں، تاکہ صدارت کے اسٹیج سے آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکوں، اور اس تحریک کو اس کی اصلی شکل میں پیش کروں، میں نے اپنے اس خطبہ میں (جو "ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لئے حقیقی خطرہ" کے عنوان سے اردو انگریزی اور ہندی میں مستقل رسالہ کی شکل میں شائع ہوگیا ہے) سب سے پہلے ظلم و سفاکی کے خطرناک نتائج کا ذکر کیا جو پورے پورے ملکوں و تہذیبوں اور قوموں کے زوال کا باعث ہوئے ہیں، اور جن کی موجودگی میں نہ کوئی تعمیری کام ہوسکتا ہے، نہ ملک و مذہب کی خدمت، پھر اس سلسلہ میں ایسے حق گو اور بے لاگ انسانوں کی ضرورت ثابت کی جو ظلم کو ظلم، ناانصافی کو ناانصافی اور غلطی کو غلطی کہہ سکتے ہیں، اور بتایا کہ ایسے لوگوں کا وجود ملک کی حقیقی دولت، اس کا قیمتی سرمایہ اور اس کے بقا و سلامتی کی ضمانت ہے، پھر ملک کے ممتاز ترین قائدین کی تحریروں کے چند اقتباسات پیش کئے گئے جو پچھلے فسادات کے موقعہ پر سامنے آئی تھیں، جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر جمہوریہ ہند) جے پرکاش نرائن جی، اور پنڈت جواہر لال نہرو شامل تھے، پھر اس حقیقت کا اظہار کیا گیا کہ ابھی اس ملک میں کوئی ٹھوس گہری، پائیدار اور قابلِ اعتبار تبدیلی نہیں آئی ہے، یہاں انسانی جان کی قیمت پورے طور پر سمجھی ہی نہیں گئی، یہاں ایک جھوٹا سچا نعرہ ہزاروں انسانوں کو پاگل بنا سکتا ہے، ہم نے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جتنی کوشش کی، قوم کے ضمیر کو آزاد کرانے کی اس کی چوتھائی اور دسویں حصہ کے برابر بھی کوشش نہیں کی، ہم نے برطانیہ کے ظلم سے اس کو متنفر بنایا، لیکن ظلم کی ہر شکل سے متنفر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی، پھر عرض کیا گیا کہ ایسے لوگ جو

www.abulhasanalinadwi.org

اس طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں، زیادہ تر ریاست اور حکومت کے ایوانوں کے باہر سچے روحانیوں اور دانشوروں میں پائے جاتے ہیں، یہ دو طبقے عام طور سے سب سے آخر میں گراوٹ کا شکار ہوتے ہیں، اور جب ان میں بھی خرابی آجاتی ہے، تو پھر اس ملک اور تہذیب کو بچانے والی دنیا میں کوئی طاقت نہیں رہ جاتی ہے۔

پھر اس سلسلہ میں چار نکات کی طرف توجہ دلائی گئی، جن کو تجویزوں کی شکل میں ڈھال کر اجلاس میں پیش کیا گیا، اور وہ بالاتفاق پاس ہوئیں، سب سے پہلی تجویز اخلاقی و انسانی بنیادوں پر عوامی رابطے سے متعلق تھی، دوسری تجویز تعلیمی نصاب کی اصلاح کے سلسلہ میں تھی جس کے نتیجہ میں آپس میں منافرت پیدا ہو رہی ہے، تعلقات خراب ہو رہے ہیں، اور بار بار فساد پھوٹ پڑتے ہیں، تیسری تجویز اخبارات میں مبالغہ آمیز غیر حقیقت پسندانہ، یک طرفہ اور فرقہ وارانہ خبروں کی اشاعت سے متعلق تھی کہ اس کی اصلاح کی جائے، اس کے بغیر امن مشکل ہے، اخبارات کو خاص طور پر تعمیری رویہ اپنانے پر متوجہ کیا گیا، گویا فارسی کے ایک غزلیہ شعر کے ذریعہ (صرف ایک حرف کی ترمیم سے) اس طبقہ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ؎

زیر قلمت[1] ہزار جان است
آہستہ خرام بلکہ مخرام

چوتھی تجویز پولیس کی اصلاح، اس کی از سر نو تنظیم اور اسے باشعور اور باضمیر بنانے سے متعلق تھی، جسے BHAI VAID نے جو مہاراشٹر کے سابق ہوم منسٹر بھی رہ چکے ہیں، پیش کیا۔

[1] اصل شعر میں محبوب کو مخاطب کر کے "زیر قدمت" کہا گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کنونشن کے لئے جو خطبۂ صدارت لکھا گیا تھا، وہ اردو، انگریزی اور مختصراً ہندی میں چھپوایا گیا تھا، اور کنونشن میں تقسیم کیا گیا، اور بعد میں ملک کے دانشوروں اور سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کو بھیجا گیا، کنونشن کے آخر میں جلسہ کا اختتام ایک مؤثر تقریر پر ہوا، جس میں مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے دیس میں زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا گیا، اس میں ضبط نفس، وسیع القلبی، غلطی کے احساس اور اس کے اقرار، نفرت کے بجائے محبت اور تخریب کے بجائے تعمیر پر زور دیا گیا، اور بتایا گیا کہ ان فسادات کے پیچھے حقیقتاً دولت پرستی، حسد اور تنگ نظری کام کر رہی ہے، اور صفائی سے کہا گیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں ساری حقیقتیں اور صداقتیں مر چکی ہیں، صرف دو حقیقتیں زندہ ہیں، ایک پیسہ کی محبت، دوسرے فرقہ وارانہ منافرت آج سارا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہے ایک حاکم ایک محکوم، ایک بیچنے والا، ایک خریدنے والا، ایک شہری دوسرے شہری پر حکومت کرنا چاہتا ہے جس کی کمان چڑھی ہوتی ہے، وہ کسر نہیں رکھتا۔

میں نے آخر میں کہا کہ اس اجلاس میں باربار "پیام انسانیت" کی تحریک کی نسبت میری حقیر ذات کی طرف کی گئی ہے، میں صاف صاف کہتا ہوں کہ یہ میری تحریک نہیں ہے، میری کوئی ہستی نہیں، مجھے تو "پیام انسانیت" کی ضرورت ہے، یہ پیام انسانیت پیغمبروں کا پیام ہے، خدا کے سچے بندوں اور روحانی انسانوں کا پیام ہے آپ اس کی نسبت خدا کے پیغمبروں کی طرف کیجئے تاکہ برکت آئے اور اس کی رحمت نازل ہو۔

اس کنونشن میں بعض ممتاز غیر مسلم دانشور، اور سماجی کارکن شریک ہوئے،

www.abulhasanalinadwi.org

جن میں BOMCEF کے صدر کاشی رام جی، جواہر لال یونیورسٹی دہلی کے پروفیسر مسٹر سوندھی، پونا کے سابق میئر اور مہاراشٹر کے ہوم منسٹر BHAI VAID اور لکھنؤ کے سابق میئر داؤجی گپتا اور ڈاکٹر دی کیپور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، پروفیسر سوندھی نے یہاں تک کہا کہ:۔

"کمیونزم اور سرمایہ داری کے نظام دونوں فیل ہو چکے ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہیں، میں مولانا سے کہتا ہوں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تعلیمی نظام ناقص ہے، ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہماری رہنمائی کریں"

اس طرح اس کنونشن کے ذریعہ اپنی نحیف آواز کو ذرا بلند آہنگی کے ساتھ اور کسی قدر وسیع دائرہ میں پہونچانے کا موقعہ ملا کہ اس سے زیادہ اپنے اختیار میں کچھ نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب چہاردہم ۱۴

مذاکرۂ ادبیات اسلامی، ایک علمی اعزاز، خطبات کشمیر، خاندانی حادثہ دار المصنفین اور الجزائر کے سیمینار

مذاکرۂ ادبیات اسلامی ندوۃ العلماء

"کاروانِ زندگی" کی جلد اول ہی سے قارئین کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ مجھے اپنی تدریسی و تعلیمی مشغولیت کے زمانہ میں بھی اور اپنے تحریری و تصنیفی دائرہ کے اندر بھی ہمیشہ اس حقیقت کا ادراک رہا کہ ادب اپنے اندر عظیم تعمیری و تخریبی طاقت رکھتا ہے، اس سے ایک طرف عقائد صحیحہ کی استواری، اور صحت مند اور صالح رجحانات کی آبیاری کا کام لیا جا سکتا ہے، تو دوسری طرف اخلاقی انسانی قدروں پر تیشہ زنی اور ذہنی و معاشرتی انتشار کا بھی، اور ہر دور میں اس کی روشن اور ناقابلِ انکار شہادتیں ملتی ہیں، لیکن اس دور میں ادب کی (اپنے وسیع معنی میں) جدید طاقتور وسائل کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے جہانگیری اور فرماں روائی بہت بڑھ گئی ہے، عرصہ سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ جس طرح کبھی فلسفہ کے راستہ سے الحاد اور تشکیک کا سیلاب مسلمانوں کے علمی و فکری طبقہ میں آتا تھا، اس کے بعد سائنس (خاص طور پر علوم طبیعیہ) کے راستہ سے تعلیم یافتہ طبقہ میں آنے لگا، اور کہیں کہیں نفسیات (سائیکالوجی) اجتماعیات (سوشیالوجی) اور

www.abulhasanalinadwi.org

اقتصادیات وسیاسیات کے راستہ سے آتا تھا، اب بہت سی جامعات اور دانشگاہوں میں ادب کے ذریعہ سے آرہا ہے۔

خاص طور پر یہ بات فکر و دعوت اسلامی کے حاملین کے لئے تشویش کا باعث تھی کہ بلادِ عربیہ بالخصوص مصر میں تقریباً نصف صدی سے ادب و تنقید اور نوجوانوں کو ذہنی و ادبی غذا پہونچانے کے میدان پر اُن ادباء اور اہلِ قلم کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی، جن کے عقائد میں خود تزلزل، ذہن میں انتشار اور تحریروں میں تشکیکی رجحان پایا جاتا تھا، اس لئے ایک طرف اس کی ضرورت تھی کہ عربی ادب کے خزانۂ عامرہ سے وہ طاقتور اور دل آویز ادبی و تحریری نمونے نکالے جائیں اور ان کو نمایاں کیا جائے، جن کو سہولت پسندی اور قدیم مؤرخینِ ادب کی پیروی میں نظر انداز کر دیا گیا، یا اس قصور میں کہ وہ کسی عالم و داعی اور دینی شخصیت کے قلم سے نکلے ہیں، ان کو "ایوان ادب" سے دور کر دینے یا الگ رکھنے کی سزا دی گئی، اور صدیوں ان پر پردہ پڑا رہا، دوسری ضرورت اس کی تھی کہ ادبِ عربی کے ایسے اساتذہ، اہلِ قلم اور دانشوروں کو جمع کیا جائے جو عربی ادب و انشاء اور تنقید و تاریخ ادب کو صحیح رُخ پر لگانے کی کوشش کریں، اور جدید نسل کو صالح غذا پہونچانے کے لئے ایک نیا ذخیرۂ کتب (مکتبہ) اور ایک نیا مدرسۂ فکر (مکتبِ خیال) پیدا کر سکیں۔

پہلے جزء کے سلسلہ میں اس مضمون کے ذریعہ اس کام کی دعوت دی گئی جو دمشق کی رائل اکیڈمی المجمع العلمي العربي (حال مجمع اللغة العربية) کی رکنیت کے موقع پر اس کے رسالہ کے لئے لکھا گیا تھا، اور اب وہ "مختارات من أدب العرب" کا مستقل مقدمہ ہے[1]، بعض

[1] ادب پر ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری کے خلاف احتجاج اور اس کے وسیع مفہوم اور میدان کی وضاحت

(باقی صفحہ ۳۳۰ پر)

www.abulhasanalinadwi.org

بلند پایہ اساتذۂ ادب نے اس کا اعتراف کیا کہ ان کے لئے یہ مضمون فکر انگیز ثابت ہوا اور اس سے ان کے اندر ادب اسلامی کی تحریک پیدا ہوئی، دوسرے مقصد کے لئے ضرورت تھی کہ کسی مناسب مقام پر ادبیات اسلامی کے عنوان پر ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ (سیمینار) منعقد کیا جائے جس میں بلاد عربیہ اور وہاں کی جامعات کے اساتذۂ ادب ونقد کو شرکت کی دعوت دی جائے، اور علمی مقالات اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ آئندہ کے لئے کام کا منصوبہ اور نقشہ بنایا جائے۔

اس خیال نے جلد عمل کی شکل اختیار کر لی، اور یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ ۱۷/۔ ۱۹/اپریل ۱۹۸۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا جائے جس کا موضوع "عربی ادب میں خصوصاً اور دوسری زبانوں کی ادبیات میں اسلامی عناصر کی تلاش" قرار پایا، توقع اور قیاس سے بڑھ کر ممالک عربیہ میں اس دعوت وتحریک کا استقبال ہوا اور اس کو RESPONCE ملا، اس میں حصہ لینے کے لئے متعدد عرب ممالک کے ممتاز فضلاء وادباء لکھنؤ آئے، جن میں دور حاضر کے متعدد بلند پایہ مصنفین فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور شعراء وادباء شامل تھے، عام طور پر عرب ممالک کے وفود جس معیار کے ہوتے ہیں ان سے ان ادباء کا علمی درجہ مختلف تھا، عرب ممالک کے ادباء کی تعداد تین درجن سے زائد تھی، جن میں عالی مرتبت سید عبدالعزیز رفاعی سابق سکریٹری مجلس وزراء مملکت سعودیہ بھی تھے، جنھوں نے عربی ادب وتاریخ کے ذخیرہ سے صحابہ کرامؓ کی ان شخصیتوں کے

(باقی ص ۳۲۹ کا) کرنے کے سلسلہ میں مصنف نے اپنی کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کی تیسری جلد میں "مکتوبات سرہندی" کی ادبی حیثیت پر کلام کرتے ہوئے تفصیل سے لکھا ہے، ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت وعزیمت" سوم باب ہشتم مکتوبات ص ۲۴۰-۲۴۵۔ نیز مقدمہ "صدر یار جنگ" ص ۹

www.abulhasanalinadwi.org

ادبی پہلو پر ایک سلسلۂ کتب تیار کر دیا ہے، جو ادیب و شاعر تھے، ڈاکٹر عبد الرحمٰن رأفت الباشا بھی تھے، جنھوں نے الشعر الاسلامی، النثر الاسلامی اور ادب الدعوۃ کے موضوع پر بلا واسطہ اور بالواسطہ ایک مستقل کتب خانہ تیار کر دیا ہے، ۶ مؤقر عرب یونیورسٹیوں کے عربی شعبوں کے سربراہ بھی شریک تھے، مصر کے وزیر اوقاف ڈاکٹر زکریا برّی، حکومت قطر کے دینی امور کے ناظم شیخ عبد اللہ ابراہیم الانصاری وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں، دوسری طرف ہندوستان کی اکثر اہم یونیورسٹیوں اور اسلامی درسگاہوں کے اساتذہ بھی شریک تھے، عربی مجلس کی علیحدہ اور اردو ادب کے سیمینار کی علیحدہ نشست ہوتی تھی، میں نے بڑی عجلت میں خطبۂ استقبالیہ تیار کیا جس میں اس مجلس مذاکرہ کے بنیادی مقصد اور ضرورت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں ہندوستان میں جو کام ہوا ہے اس کا جائزہ پیش کیا، یہ خطبۂ استقبالیہ مجھے صدر منتخب کر لینے کی وجہ سے خطبۂ صدارت بن گیا۔[1]

شعبۂ ادب اردو کے سیمینار میں، جس کی صدارت ناظم دار المصنفین سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم، اے نے کی، میں نے جو اختتامی تقریر کی، وہ سیمینار کی اردو روداد "دین و ادب" میں دیکھی جا سکتی ہے،[2] یہاں اس کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، یا کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے

---

[1] یہ خطبہ علیحدہ بھی شائع ہوا ہے اور سیمینار کی روداد "الأدب الاسلامی فکرتہ ومنہاجہ" میں بھی شامل ہے۔ [2] ص ۳۷-۴۷

کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے، اور اس کو قبول کرے، حسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے، بلبل کو آپ پابند نہیں کر سکتے کہ اس پھول پر بیٹھے اس پھول پر نہ بیٹھے، یہ کہاں کا حسن مذاق اور کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی میخانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے، اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں؟ کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمود اور اپنی جلوہ نمائی کے لئے مسجد کا سہارا لیا، و بقول اقبال ؎

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
بن اگر شہروں سے پیارے ہوں تو شہر اچھے کہ بن؟

ہمیں حسن بے پروا سے مطلب ہے کہ شہر و صحرا سے؟ لیکن ادب کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔"

ہال میں بعض ایسے تحریری اقتباسات اور منتخب اشعار آویزاں کئے گئے تھے، جن سے ادب کے اصل مقصد اور اس کی روح کا اظہار ہوتا تھا، اس میں میری بعض تحریروں کے اقتباسات بھی تھے، اور اقبال کے اشعار بھی، مثلاً ان کا مشہور قطعہ جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا

عربی میں ان کا ترجمہ بھی عربی سیمینار کے ہال میں آویزاں تھا۔

اس سیمینار کے نتیجہ میں ایک مجلس کی تشکیل ہوئی جو مستقل طور پر اس مقصد کے لئے

www.abulhasanalinadwi.org

کام کرے، جن خطوط پر کام کرنا ہے ان کی بھی وضاحت کر دی گئی، اس مستقل سکریٹریٹ کا مرکز دارالعلوم ہی قرار پایا، عزیزی محمد رابع ندوی (جو اس پورے مذاکرہ کے روح رواں تھے) اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے[1]۔

حدیث پر ایک اہم مقالہ

ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ (ستمبر ۱۹۸۱ء) کے پہلے ہفتہ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے اہم جلسوں میں شرکت کے لئے حجاز کا سفر پیش آیا، رابطہ نے چند سال سے موسم حج میں مختلف ممالک کے ممتاز اہل علم واہل نظر کے مطالعہ و تحقیق اور افکار وخیالات سے موسم حج میں آئے ہوئے صاحب ذوق حجاج اور مکۂ معظمہ کے اہل علم وطلب کو مستفید کرنے کے لئے خطبات کا سلسلہ شروع کیا تھا، رابطہ کی مرکزی عمارت کے وسیع کانفرنس ہال میں ان تقریروں اور مقالات کے سنانے کا انتظام ہوتا تھا، ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۱ء) میں اس کے سکریٹری جنرل معالی الشیخ محمد علی الحرکان نے (جو خود ایک بلند پایہ عالم و محدّث تھے) مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس سال کے دورۂ محاضرات کا

---

[1] اسی مجلس مذاکرہ کا اثر تھا کہ اس کے بعض اہم ارکان و شرکاء نے (جن میں اکثر جامعۃ الامام محمد بن سعود کے مؤقر اساتذہ تھے) رابطۃ الادب الاسلامی کے نام سے ریاض میں ایک عالمی تنظیم قائم کی اور مئی ۱۹۸۴ء کی کسی تاریخ کو ان کا ایک وفد مجھ سے مکہ معظمہ میں ملا، اور مجھ سے اس کی صدارت قبول کرنے کی خواہش کی، .... یہ طے ہوا کہ اس کا مرکز دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہے گا، استاد عبدالباسط بدر اس کے سکریٹری اور مولوی محمد رابع ندوی اور مولوی واضح رشید ندوی اس کے جوائنٹ سکریٹری ہوں گے، اور اس کا ایک عالمی اجلاس ۱۹۸۴ء کے اخیر میں ندوۃ العلماء ہی میں ہوگا۔

www.abulhasanalinadwi.org

افتتاح کروں، اور "حجیت حدیث" پر مقالہ پڑھوں، میں نے شکریہ کے ساتھ یہ دعوت قبول کی، لیکن موضوع میں کسی قدر ترمیم کی اجازت لی کہ حجیتِ حدیث کے موضوع پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے، میں نے اپنے لئے "اسلامی مزاج اور ماحول کی تشکیل و حفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار"[1] کا موضوع منتخب کیا، اس مقالہ میں ایک نئے زاویۂ نگاہ اور ایک نئے اسلوب سے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی کہ حدیث کا مسلمانوں کی زندگی میں کیا مقام ہے، امت کو سنّت کی کس قدر ضرورت ہے، اور اس امت کے سنّت مطہّرہ سے رشتہ منقطع ہو جانے اور حدیث نبویؐ کے سرمایہ سے محروم ہو جانے میں امت کا کتنا بڑا خسارہ اور وجود اسلامی کے لئے کتنا بڑا خطرہ مضمر ہے، حدیث کے سند و حجت ہونے کے بارے میں شک و شبہ اور بے اعتمادی پیدا کرنے کی عالم اسلام کے بعض گوشوں میں جو تحریک چل رہی ہے[2]، وہ اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہے، اور اس کے پیچھے کون سے مقاصد و محرّکات سرگرم عمل ہیں؟ تاریخ کی روشنی میں یہ بھی ثابت کیا گیا کہ حدیث احتسابِ امّت کا ایک طاقتور ذریعہ، اور مصلحین و مجدّدین امت کی ایک تربیت گاہ ہے، اور تاریخ اسلام کی تقریباً ساری اصلاحی و تجدیدی تحریکیں، ردِّ شرک و بدعت و رسوم جاہلیت، اور تطہیر عقائد کی کوششیں، حدیث و سنت کے علم اور ان کے درس و تدریس کے سلسلہ سے مربوط ہیں، اور جہاں یہ سلسلہ ختم یا کمزور ہو گیا، وہاں یہ تحریکیں اور کوششیں، بھی (علماء و زہّاد و صالحین کی موجودگی کے باوجود) عرصہ تک موقوف رہیں،

---

[1] عربی میں "دور الحديث في تكوين المناخ الإسلامي وصيانته" اور انگریزی میں (ROLE OF HADITH IN THE PROMOTION OF ISLAMIC CLIMATE AND ATTITUDE) کے نام سے بھی دونوں زبانوں میں یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

[2] جس میں بدقسمتی سے اس وقت لیبیا سب سے آگے ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس سلسلہ میں مختلف ملکوں کا تاریخی جائزہ لیا گیا، اور تاریخ کی شہادتیں پیش کی گئیں یہ مقالہ ۱۶؍ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ (۱۳؍ ستمبر ۱۹۸۱ء) کی شب میں پڑھا گیا، اس موقعہ پر علمائے مکہ، اساتذۂ جامعہ، اور اہل علم و اہل ذوق حجاج کی ایک معتد بہ تعداد موجود تھی۔[1]

ایک علمی اعزاز

۱۶؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جب رابطہ کے اجلاس اور حج سے فارغ ہو کر میں اپنے مستقر پر پہونچا تو اچانک معلوم ہوا کہ کشمیر یونیورسٹی نے مجھے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے، جو ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جلسۂ تقسیم اسناد (کانووکیشن) میں دی جائے گی، اس سلسلہ میں گورنر صاحب جموّں و کشمیر (بی، کے نہرو صاحب) وحیدالدین ملک صاحب وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی اور پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے خطوط اور تار آئے ہوئے ہیں کہ منظوری کی فوراً اطلاع دی جائے۔ میرے لئے یہ "حادثہ" بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا، تھوڑے سے تردّد اور ذہنی کشمکش کے بعد اور اس شرط کے ساتھ کہ اس کی نوعیت خالص علمی و ادبی ہوگی، سیاست سے اس کا دور کا بھی تعلق نہ ہوگا، میں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے مشورہ سے اس اعزاز کو قبول کر لینے کا فیصلہ کر لیا، اور اس کی مذکورہ بالا حضرات کو بذریعۂ تار اطلاع دے دی، میرے سامنے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ، نواب صدر یار جنگ

---

[1] یہ مقالہ عربی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہو گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانیؒ اور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کی نظیر تھی جن کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ ڈگری پیش کی تھی، اور انھوں نے قبول فرمایا تھا، ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بھی خیال تھا کہ مجھے اس موقعہ سے جدید تعلیم کے ماہرین، یونیورسٹی کے اساتذہ اور فضلاء اور ملک کے بعض ذمہ داروں کے سامنے علم و حاملین علم کے بارے میں اپنے خیالات اور مشوروں کے پیش کرنے کا موقعہ ملے گا، اور ایک داعی کی حیثیت سے مجھے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے کہ ؎

غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو کانووکیشن کی تقریب عمل میں آئی جو میرے لئے اس عمر میں ایک نیا تجربہ اور آزمائش تھی، مجھے اس پوری تقریب میں (جس میں میں اپنے کو اجنبی اور نامانوس محسوس کر رہا تھا) صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ مجھے اپنا مقالہ پڑھنے کا موقعہ ملے جس کو میں نے "علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں" کے عنوان سے تیار کیا تھا اور کوشش کی تھی کہ اس میں اپنا دل و دماغ جدید طبقہ اور ذمہ داروں کے حلقہ کے سامنے نکال کر رکھ دوں، بقول غالب ؎

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب\
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

کانووکیشن کی روایات و رسمیات اور اس کے ضابطہ کو پورا کرنے میں جتنی دیر لگ رہی تھی، میرے دل میں ... اضطراب پیدا ہو رہا تھا کہ مبادا میرے لئے اپنے خیالات پیش کرنے کا وقت نہ رہے جو اس پورے سفر اور اس تقریب میں شرکت کا مقصود اصلی اور قیمت ہے، یہ تقریب گورنر صاحب کشمیر بی، کے نہرو صاحب کی صدارت،

www.abulhasanalinadwi.org

اور شیخ محمد عبد اللہ وزیر اعلیٰ کشمیر کی موجودگی میں عمل میں آئی، اس موقعہ پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی چیرمین ڈاکٹر بادھوری آر شاہ[1] بھی موجود تھیں کہ ان کو بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جانے والی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت آیا کہ مجھے اپنا مقالہ جو اردو میں تھا پڑھنے کا موقعہ ملا، اہل کشمیر کی اردو سے خصوصی دلچسپی کی بنا پر عام حاضرین جلسہ، ستدیافتگان اور اردو فارسی سے واقفیت کی بنا پر خود گورنر صاحب اسے غور سے سن رہے تھے، اور اچھی طرح سمجھ رہے تھے، میں نے اس علمی تقریب کی رعایت و مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تقریر کا آغاز اس پہلی وحی کے تذکرہ سے کیا جس نے ایک اُمّی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے ایک ایسی قوم میں جو ناخواندہ (امیین) کے لقب سے مشہور تھی، اس حقیقت کا اعلان کیا کہ علم کا سفر خدائے حکیم و علیم کی رہنمائی میں شروع کیا جانا چاہیئے، اس لئے کہ سفر طویل، پرپیچ اور بہت پُر خطر ہے "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" پھر اس پہلی وحی نے قلم کو بھی فراموش نہیں کیا جو شاید ڈھونڈھنے سے بھی مکہ کے کسی گھر میں نہ ملتا اور اعلان کیا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے، اور اس نبی اُمّی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی (جس نے کبھی خود قلم سے کام نہیں لیا) بعثت کے نتیجہ میں جو امت وجود میں آئے گی، وہ اس قلم سے پورا کام لے گی "اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" پھر یہ انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بھی بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" پھر میں نے جامعات (یونیورسٹیز) کے فرائض پر روشنی ڈالی اور کہا کہ جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے، میں نے کہا کہ:۔

---

[1] سابق وائس چانسلر و میڈیکس یونیورسٹی بمبئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

"یونیورسٹی کو (اپنے طلباء وفضلاء کا) ایسا کیرکٹر بنانا چاہئے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبالؔ ایک "کفِ جو" کے بدلہ میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے کوئی اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جاسکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا، ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ ایسے صاحبِ علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کرسکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت کوئی تخریبی فلسفہ کوئی غلط دعوت و تحریک کسی دام خرید نہ سکے، جو اقبالؔ کے الفاظ میں پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ کہہ سکیں ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں حق و صداقت اور علم و ہدایت کے لئے قربان کرنے کے لئے تیار ہوں، جن کو کسی کے لئے بھوکا رہنے میں وہ لذت آئے جو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے اور "نائے و نوش" میں آتی ہے، جن کو کھونے میں وہ مسرت حاصل ہو جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں ہوتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں، ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ (جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے) انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لئے صرف کریں۔

شریفانہ انسانی زندگی گزارنے کا بنیادی فن خدا ترسی، انسان دوستی، ضبطِ نفس کی ہمت و صلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینے کی

www.abulhasanalinadwi.org

عادت، انسانیت کا احترام، انسانی جان ومال، عزت وآبرو کے تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح، مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت وحفاظت، اور ظالموں اور طاقتوروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت و وجاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں رکھتے، عدمِ مرعوبیت و بے خوفی، ہر موقعہ پر اور خود اپنی قوم اور اپنی جماعت کے مقابلہ میں کلمۂ حق کہنے کی جرءت، اپنے اور پرائے کے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی دانا وبینا طاقت کی نگرانی کا یقین اور اس کے سامنے جواب دہی اور حساب کا کھٹکا ہے، یہی صحیح، خوشگوار و بے خطر اور کامیاب زندگی گزارنے کی بنیادی شرطیں، اور ایک اچھے وخوش اسلوب معاشرہ اور ایک طاقتور ومحفوظ وباعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اس کے تحفظ کی ضمانتیں ہیں، اس کی تعلیم اور اس کے لئے مناسب ماحول مہیا کرنا دانشگاہوں کا اوّلین فرض، اور اس کا حصول تعلیم یافتہ نسل اور ملک کے دانشوروں کی پہلی ذمہ داری ہے، اور ہم کو اس جیسے تمام مواقع پر دیکھنا چاہیئے کہ اس کام کی تکمیل میں ہماری دانشگاہیں کتنی کامیاب اور ان کے سند یافتہ افراد وفضلاء کتنے قابل مبارکباد ہیں، اور آئندہ ان مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لئے ہم کیا عزائم رکھتے ہیں، اور ہم نے کیا انتظامات سوچے ہیں؟"[1]

میرے اس مقالہ کے بعد جب گورنر بی، کے نہرو صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے،

---

[1] یہ خطبہ اردو، انگریزی میں "علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں" کے عنوان کے نام سے شائع ہو چکا ہے شروع میں پروفیسر آل احمد سرور ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کا فاضلانہ پیش لفظ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

توانھوں نے کہا کہ میں نے بہت سے جلسہائے تقسیم اسناد میں شرکت کی، لیکن میں نے ایسا فکر انگیز (INSPIRING) خطبہ نہیں سنا، جب یہ خطبہ اردو میں چھپ کر شیخ محمد عبداللہ صاحب وزیر اعلیٰ کشمیر و جموں کو بھیجا گیا، تو انھوں نے حسب ذیل خط لکھا

جموں (توی)
۱۱ر فروری ۱۹۸۲ء

محترم المقام مولانا صاحب

السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۹۸۱ء وصول ہوا، یاد آوری کا شکریہ،

۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو جلسۂ تقسیم اسناد میں آپ کے خطبہ کی کاپیاں اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں موصول ہو گئی تھیں، مذکورہ جلسہ میں آپ کی آمد اور فکر انگیز انداز میں ہم عصر مسائل پر حقیقت پسندانہ نظر، ان سب باتوں کی بازگشت ابھی تک یہاں سنائی دے رہی ہے، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہم عصر زندگی کی انفرادی و اجتماعی الجھنوں کی عکاسی جس انداز میں آپ کرتے ہیں، وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اس طرح نہ صرف یہ کہ معاشرے کی اصلاح کے لئے نیا راستہ نکل آتا ہے، بلکہ اس سے ان لوگوں کی بھی جو مختلف سطحوں پر معاشی، اقتصادی اور سماجی حالات سے نبرد آزما ہیں، بہت بڑی راہ نمائی ہو جاتی ہے، امید ہے کہ آپ اپنی دعاؤں میں بدستور یاد رکھیں گے۔

خیر اندیش

شیخ محمد عبداللہ

www.abulhasanalinadwi.org

کشمیر کے احباب، اسلامی انجمنوں اور تنظیمات کے سربراہوں اور سری نگر کے اہلِ ذوق اور مخلص احباب کے لئے یہ ایک طرح کا انکشاف اور کسی حد تک حیرت انگیز واقعہ تھا کہ میں ۳۶ برس کی طویل مدت کے بعد[1] ایک معمولی سی تحریک پر کشمیر آیا ہوا ہوں، انھوں نے اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا اور میرے سری نگر کے قیام کے ۹ دن تقریروں اور خطابات کے پروگرام کی وجہ سے سخت مصروفیت کے گزرے، کسی کسی دن تقریروں کے تین تین پروگرام ہوتے تھے، گورنر صاحب نے گورنمنٹ ہاؤس میں اور وزیر اعلیٰ کشمیر جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب نے پامپور کے زعفران زار میں ایک اچھی مجلس ترتیب دی، میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب نے خصوصیت کے ساتھ مختلف مجالس کا انتظام کیا، اور مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا بہتر سے بہتر موقعہ مہیا کیا، میں اور میرے دونوں رفیق ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اور عزیزی عبدالرزاق، وحید الدین ملک صاحب وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے دولت خانہ پر مقیم اور ان کے مہمان رہے۔

سری نگر کی جامع مسجد میں جمعہ کے بعد جس میں ہزاروں کی تعداد میں سری نگر اور اطراف کے مسلمان شریک تھے، تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا "وادیٔ کشمیر میں توحید خالص کا پہلا پیغام اور اس کے علمبردار" میر واعظ منزل میں علماء، ائمۂ مساجد اور خواص کے ایک موقر مجمع کے سامنے حیاتِ ملی میں خواص امت کے مقام اور ان کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی، مرکز جماعت اسلامی کشمیر (سری نگر) میں "دین کے نبوی مزاج اور اس کی حفاظت کی ضرورت" پر تقریر کی گئی، اسی طرح اور متعدد تقریریں ہوئیں[2]۔

---

[1] میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں کشمیر گیا تھا [2] ان تقریروں کا مجموعہ "تحفۂ کشمیر" کے نام سے "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" نے شائع کر دیا ہے، اور وہ ہر مقام کے مسلمانوں کے مطالعہ کے قابل ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سب سے اہم تقریر نصرۃ الاسلام ہال میں کی گئی جس میں سری نگر اور اطراف کے علماء اور اہل علم و فکر خاصی تعداد میں شریک تھے، اس میں تاریخ کے مسافر اور ملت اسلامیہ کے ایک جہاں دیدہ سیّاح کے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ اور علمی و تاریخی سفر کی سوغات تھی، یہاں اس کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے :۔

"حضرات! آپ کشمیر کا قلب و دماغ ہیں، آپ کا فیصلہ اصلاً فیصلہ کن ہوگا، آپ کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اس سرزمین کی اسلامیت باقی رہے، کل حشر کا میدان ہوگا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے ہوں گے اور اللہ تبارک و تعالٰے عدالت کی کرسی پر ہوگا، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان یا دامن، آپ سے سوال ہوگا کہ اللہ نے اس سرزمین کو دولتِ اسلام سے مشرف کیا، اولیائے کرام کو وہاں بھیجا، وہ اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اس وادی میں پہونچے، انھوں نے خدا کا کلام اور پیغام وہاں کے باشندوں کو پہونچایا، پھر اللہ نے اسلام کے پودے کو تناور، بارآور، اور پُرثمر درخت بنایا، وہ درخت سیکڑوں برس تک سرسبز و شاداب اور پُرثمر و سایہ دار رہا، ہزاروں مسجدیں بنیں، سیکڑوں مدرسے اور خانقاہیں قائم ہوئیں، جلیل القدر علماء، فقہاء و محدثین پیدا ہوئے لیکن تمہاری ذرا سی غفلت و سُستی، اختلاف و انتشار، کوتاہ نظری اور کم نگاہی سے اسلام کا یہ باغ خزاں کی نذر ہوگیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ غلطی اور غلطی کی سزا میں تناسب ہونا ضروری نہیں ہے، بعض مرتبہ چھوٹی غلطی ہوتی ہے، لیکن سزا بہت بڑی ہوتی ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

جس کے کچھ اور اسباب ہوتے ہیں، بعض مرتبہ ایک چھوٹے سے فیصلہ میں غلطی ہوئی اس کا نتیجہ صدیوں کے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے، دنیا کی بہت سی قوموں نے کسی خاص موقعہ پر کمزوری دکھائی، صدیوں تک اس کی سزا ملتی رہی۔"

پھر میں نے کہا کہ ہندوستان کے حالات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ اپنی خصوصیات اور اکثریت کے ساتھ باقی رہیں، ہندوستان میں جب ہی صحیح توازن قائم ہوگا، اور ملک اسی وقت عزت پائے گا، اور اس کو استحکام حاصل ہوگا، جب آپ اپنی خصوصیات، اپنی امن پسندی، انسان دوستی اور دماغی صلاحیتوں کے ساتھ باقی رہیں گے۔

پھر میں نے ان کمزوریوں کا ذکر کیا جو اس مقصد کے لئے مضر و خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں، اور اس سرزمین کا رشتہ اسلامیت سے منقطع یا کمزور کر سکتی ہیں، ان میں پہلی چیز مشرکانہ عقائد و اعمال ہیں، جو قرآن کی نصوص قطعیہ کی رو سے ہمیشہ ضعف، مرعوبیت، جبن، بزدلی اور خدا کی نصرت سے محرومی کا سبب بنتے ہیں، دوسرے انتشار و افتراق، تیسرے دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، اور اس کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا جذبہ، نیز اسراف و تبذیر، خود ساختہ رسوم کی پابندی اور اس میں تفاخر و مسابقت ہے، چوتھی چیز جس کا میں نے اضافہ کیا وہ ضرورت سے زائد "جذباتیت" ہے، جب یہ کمزوری جماعتی یا علاقائی مزاج بن جاتی ہے تو بڑے خطرات و نقصانات کا موجب ہوتی ہے، تاریخ میں بعض بڑے ملی حوادث و مصائب کا سبب یہی جذباتیت، اشتعال پذیری، اور سرعت انفعال تھی[1]، جن قوموں یا جماعتوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں

---

[1] اہل کشمیر کی حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت کا اظہار ۱۹۷۹ء میں ذوالفقار علی صاحب بھٹو کو پاکستان میں پھانسی دیئے جانے کے واقعہ پر خاص طور پر ہوا جس میں ان کے حامی اور ان کو پسند کرنے والے تشدد پر اتر آئے، اور جارحا

(باقی صفحہ ۳۴۴ پر)

www.abulhasanalinadwi.org

انجام دیئے ہیں، یا تاریخ میں سلطنتوں اور تہذیبوں کی بانی قرار پائی ہیں، یا انھوں نے دین حق کا دنیا میں جھنڈا بلند کیا ہے، وہ طبعی طور پر حلیم و بردبار متحمل و عالی ظرف اور اسی کے ساتھ بہادر و غیور واقع ہوئی تھیں اور صدر اول کے مسلمان تو اس کا بہترین نمونہ ہیں۔

جب کشمیر کی تقریر کا مجموعہ "تحفۂ کشمیر" کے نام سے شائع ہوا تو میں نے شیخ صاحب کی خدمت میں بھی ایک نسخہ بھیجا، انھوں نے اس کی رسید دیتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

"محترم المقام مولانا صاحب

السّلام علیکم

اکتوبر ۱۹۸۱ء میں یہاں کشمیر میں آپ کے خطبات کا مجموعہ "تحفۂ کشمیر" محترم عبدالرحمن کوندو کی وساطت سے موصول ہوا ہے، کتاب اپنی طبعی خوبصورتی اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے قابل دید و تقلید ہے، آپ نے جس اعتماد سے کشمیر کی اسلامی حیثیت کو برقرار رکھنے کی بات کہی ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا مخلص

شیخ محمد عبداللہ

(باقی ص ۳۴۳ کا) بلکہ سفاکانہ رویہ اختیار کیا، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر قابلِ احترام دینی چیزوں اور شعائر اسلام تک کے ساتھ بے ادبی اور توہین کا سلوک کیا، اور بہت سے ناکردہ گناہ ان کا نشانہ بنے، یہ چیز ایک اعصابی دورہ کی کیفیت رکھتی تھی، اس پر میں نے شیخ صاحب کو بھی توجہ دلائی، انھوں نے ۱۶ جون ۱۹۷۹ء کے جوابی مکتوب میں اس پر اظہار افسوس کیا اور اس کے مقامی و سیاسی اسباب کی وضاحت کی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اہم خاندانی حادثہ

مجھے جنوری ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتہ میں بعض اہم مجالس کی شرکت کے لئے حجاز مقدس کا سفر کرنا پڑا، ۱۵ر فروری کو جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو وہ اہم خاندانی حادثہ پیش آیا جس نے دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا، میری مراد خواہر زادہ عزیز، قوتِ بازو اور فخر خاندان مولوی سید محمد ثانی حسنی مدیر "رضوان" ومصنف "سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی" اور "حیات خلیل"..... کی وفات کے اندوہناک حادثہ سے ہے، جو ۱۶ر فروری کو ایسے حالات میں پیش آیا جس نے دل ودماغ کے تاثر کو اور زیادہ شدید وعمیق کر دیا[1]، خواہر زادہ عزیز ہمارے خاندان کی بہترین روایات اور خصوصیات کے حامل تھے، وہ عالم، مصنف، شاعر، مؤرخ وماہر انساب، ماہر فرائض (علم میراث) ذاکر شاغل اور ایک دل آویز شخصیت کے حامل تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی ان پر خصوصی عنایت وشفقت تھی، اور ان کی طرف سے ان کو اجازت حاصل تھی، تبلیغی واصلاحی ذوق وجذبہ میں وہ امتیاز رکھتے تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء اور مدرسہ مظاہر العلوم دونوں سے استفادہ کیا تھا، اور دونوں کی تعلیم کے اثرات وخصوصیات کے جامع تھے، مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ساتھ خاص رفاقت اور سفر وحضر میں معیت رہی تھی اور ان کا اعتماد حاصل تھا، ضلع میں وہی دعوتی واصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے،

---

[1] مرحوم پر میرے سفر حجاز سے چند روز پہلے راستہ چلتے ایک کتے نے حملہ کیا تھا جس کا پنجہ ان کی پیشانی پر پڑا اس وقت اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، ڈاکٹروں نے بھی کسی خطرہ کا اظہار نہیں کیا، لیکن چند ہفتوں کے بعد اس کا اثر ظاہر ہونا شروع ہوا اور وہ ظاہری طور پر حادثہ کا سبب بن گیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

اور عوام سے وہ رابطہ رکھتے تھے جو ہم افراد خاندان میں سے کسی کو حاصل نہ تھا، ہمارے قدیم وطن نصیر آباد سے قریب امین نگر میں فلاح المسلمین کے نام سے عربی مدرسہ قائم کیا، جس سے ان کو اولاد کی طرح محبت تھی، اب وہ نہ صرف ضلع رائے بریلی کا بلکہ یو۔پی میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے مدارس میں سب سے بڑا مدرسہ ہے، جو برابر ترقی کر رہا ہے، اسی کے ساتھ وہ بڑے ہر دل عزیز، مرنجاں مرنج اور ان دینی و علمی خصوصیات کے ساتھ بڑی انتظامی صلاحیت کے مالک، معاملہ فہم، مستعد و کارگزار تھے، امید تھی کہ خاندان کا روحانی و اصلاحی سلسلہ جو عرصہ سے ٹوٹ چکا ہے، ان کے ذریعہ سے پھر استوار ہوگا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، افراد خاندان میں سفر و حضر میں سب سے زیادہ ساتھ انھیں کا رہا، ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) کے سفر حج میں ان کی جیسی رفاقت رہی اور انھوں نے جس سعادت، بے نفسی اور صلاحیت کا ثبوت دیا، اس کا ذکر باب دوازدہم (حصۂ اول) میں تفصیل سے گزر چکا ہے، میں نے رسالہ "رضوان" کے "مولانا محمد ثانی حسنی" نمبر" میں جو ابھی حال میں شائع ہوا ہے، اپنے مضمون "عزیزی مولوی محمد ثانی مرحوم کی چند یادیں چند نقوش" میں جو کچھ لکھا، اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"اس بات کے سارے آثار و قرائن موجود تھے کہ عزیزی محمد ثانی مرحوم میرے حادثۂ وفات پر (جو ایک نہ ایک دن پیش آنے والا ہے) اپنے نقوش اور تاثرات لکھیں گے، اور وہ ان کے غیر معمولی تعلق، سفر و حضر کی طویل رفاقت، جزئیاتِ زندگی، مزاجی خصوصیات اور حوادث و سوانح سے اس واقفیت کی بنا پر جو خود افراد خاندان اور قریبی عزیزوں میں کسی کو

www.abulhasanalinadwi.org

حاصل نہیں، سب سے زیادہ قابل اعتماد تاریخی دستاویز ہوگی، اور وہی حقیر زندگی کا آئینہ، کہ ان عزیزوں اور بزرگوں سے قطع نظر جن کے واقعاتِ زندگی اور حالات وکمالات کے وہ چشم دید گواہ تھے، خاندان کی تاریخ، بزرگوں کی وفیات اور خاندانی انساب سے ان سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا، اور مجھے اپنے علمی وتاریخی کاموں میں بالخصوص "سیرت سید احمد شہیدؒ" اور "حیات عبدالحئیؒ" کے سلسلہ میں ان سے بار بار رجوع کرنا اور مدد لینا پڑتا تھا، اور ہر مرتبہ ان کے وسیع معلومات، تاریخی شعور اور تحقیقی ذوق پر حیرت ہوتی تھی، لیکن خدا کی قدرت اور اس کی شان استغناء ہے کہ ان سارے آثار وقرائن اور عمر کے اس تفاوت کے باوجود جو دس گیارہ سال سے کم نہ تھا[1]، آج مجھے ان کے بارے میں لکھنا پڑ رہا ہے اور اس موقعہ پر بے اختیار قدیم عرب شاعر اور اپنے ہم نام ابوالحسن التہامی کا وہ مصرعہ یاد آرہا ہے جو اس کے اس دل دوز قصیدہ میں آیا ہے جو اس نے اپنے جواں مرگ بیٹے کے مرثیہ میں کہا ہے، اور اس کا شمار عربی کے مؤثر ترین مرثیوں میں ہوتا ہے، قصیدہ کا مطلع ہے ؎

حکم المنیۃ فی البریۃ جار ماھذہ الدنیا بدار قرار

(موت کا قانون پوری مخلوق پر جاری اور ساری ہے، حقیقت میں یہ دنیا بقا واستقرار کی جگہ نہیں ہے۔)

---

[1] عزیز مرحوم کی ولادت دسمبر ۱۹۲۵ء میں ہوئی جب میری عمر گیارہ سال کی تھی، وفات کے وقت ستاون ۵۷ سال کی عمر تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس قصیدہ میں وہ اپنے لخت جگر کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ ع

فسبقتني وأبوك في المضمار

(ہم تم دونوں ایک ہی میدان کے راہی تھے، تم نے پیش قدمی کی اور منزل پر پہونچ گئے اور تمہارا باپ ابھی سرگرم سفر ہے۔)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کو ان کی وفات کا علم اسی دن مدینہ طیبہ میں ہو گیا جس دن یہ واقعہ پیش آیا، حضرت نے میرے نام ایک مفصل وطویل تعزیت نامہ لکھا جس کے لفظ لفظ سے آپ کے گہرے تأثر اور عمیق تعلق کا اظہار ہوتا ہے، اور علمائے کبار اور بزرگوں کے تعزیت ناموں میں یہ تعزیت نامہ امتیازی شان رکھتا ہے۔[1] تقریباً تین مہینے کے فرق سے یکم شعبان ۱۴۰۲ھ (۲۴ رمئی ۱۹۸۲ء) کو خود حضرت شیخ کی وفات کا واقعہ پیش آیا اور ہم اور سب اہل تعلق نے یتیمی کی سی کیفیت محسوس کی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الأبرار الصالحین، والعلماء الربانیین المصلحین۔

دار المصنفین کا "اسلام و مستشرقین" پر سیمینار

دار المصنفین اعظم گڑھ کی طرف سے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ۲۶ ر - ۲۸ ر ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ (۲۱ ر - ۲۳ ر فروری ۱۹۸۲ء) کی تاریخوں میں ایک بین الاقوامی سیمینار کا اعلان میرے سفر حجاز سے پیشتر ہی ہو گیا تھا، اور میں اور عزیزی محمد رابع اس کے مشوروں میں شریک تھے، ۱۵ ر فروری کو جب ہم دونوں کی

[1] یہ تعزیت نامہ حضرت شیخ کی اس سوانح میں جو میرے قلم سے ان کی وفات کے چند مہینے بعد نکلی بلفظہ منقول ہے، ملاحظہ ہو ص ۱۷۰-۱۷۴، تعزیت نامہ پر ۱۷ ر فروری ۱۹۸۲ء کی تاریخ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

واپسی ہوئی، اور ۱۶ر فروری کو مندرجۂ بالا حادثہ پیش آیا تو دار المصنفین کے سیمینار میں صرف چار دن کا وقفہ تھا، دو دن تو تعزیت میں آنے والوں سے ملنے، اور ہوش و حواس برجا کرنے میں صرف ہو گئے، سیمینار سے صرف دو دن پہلے اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اس موقعہ کے لئے کچھ لکھ لینا چاہئے، خاص طور پر اس لئے کہ اس اہم مجلس مذاکرہ میں جو پہلی مرتبہ اس اہم موضوع پر ہندوستان کے ایک ایسے اہم علمی و تصنیفی ادارہ میں منعقد ہو رہی تھی، جس سے راقم سطور کا ذمہ دارانہ تعلق ہے، عرب فضلاء و اساتذۂ جامعات کی ایک معقول تعداد شرکت کے لئے آرہی تھی، اول تو اس مجلس میں شرکت کرنے کا فیصلہ خود بڑا دشوار تھا، لیکن احساس فرض اور عزیز القدر سید محمد رابع ندوی سلمہٗ کی ہمت کو دیکھ کر جو عزیز مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں (بارك الله في حياته) اور جن کے سامنے محبوب بھائی کی بیماری اور جدائی کے سارے مراحل گزرے تھے، ہمت بندھی، نیز محترمی سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم۔ اے ناظم دار المصنفین کی تنہائی و فکرمندی کا تصور کر کے ہم لوگوں نے شرکت کا فیصلہ کیا، خیال ہوا کہ ایسے اہم موقعہ پر خالی ہاتھ نہیں جانا چاہئے، چنانچہ اس مختصر وقت میں میں نے اپنے خیالات کو عربی میں ایک تحریر کی شکل میں مجتمع کرنا شروع کیا، وقت کی کمی کی وجہ سے ایسے وقت میں بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا جس میں لکھنے لکھانے کا برسوں سے معمول نہیں[1]، عزیزی مولوی نثار الحق ندوی نے آدھی آدھی رات تک جاگ کر مسودہ کی تبییض کی اور اس کا

---

[1] سالہا سال سے میرا صرف صبح (ضروریات و معمولات سے فارغ ہو کر) ۱۲ - ½ ۱۲ بجے تک تصنیفی و تحریری کام کرنے کا معمول ہے، اور میرا سارا تصنیفی و تحریری سرمایہ (اپنی بے بضاعتی لیکن گراں باری کے ساتھ) اسی وقت کی محنت اور کمائی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سلسلہ دارالمصنفین پہونچنے کے بعد تک جاری رہا۔

سیمینار میں ہم لوگوں کی توقع سے زیادہ عرب فضلاء اور ہندوستان و پاکستان کے اہل علم شرکت کے لئے آئے، سیمینار علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی صدارت میں منعقد ہوا، میرا مضمون اصلاً عربی میں تھا، عزیز القدر سید سلمان حسینی ندوی نے اس کے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے جس سے مضمون کی روح اور اس کا مرکزی نقطہ عرب فضلاء کے سامنے آگیا، میں نے مجمع کا لحاظ کر کے جس میں بیشتر عربی نہیں سمجھتے تھے، "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر اردو میں تقریر کی، عربی کتابچہ لکھنؤ اور بیروت سے شائع ہوا، اور اردو ترجمہ "اسلامیات اور مغربی مستشرقین اور مسلمان مصنفین" کے عنوان سے اور اس کا انگریزی ترجمہ ISLAMIC STUDIES, ORIENTALISTS & MUSLIM SCHOLARS کے نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہوا، اس مضمون میں اسلام کی اخلاقی تعلیم کے ماتحت جائز اور ضروری حد تک مستشرقین کی علمی کاوشوں کا اعتراف کیا گیا ہے، اور ان کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی چیز قابل اعتراض نہیں، پھر ان کی کمزوریوں کی جستجو اور خوردہ گیری کی عادت پر تنقید کی گئی، اور نازک مستشرقانہ حکمت عملی پر روشنی ڈالی گئی، نیز مشرقی جامعات اور علمی حلقوں کے مستشرقین کی کتابوں پر ضرورت سے زائد اعتماد کے خطرات اور نتائج کی نشاندہی کی گئی۔

اس مختصر بحث و تحقیق کے بعد اسلامیات کے موضوع پر عالم اسلام کی کوششوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا، اور اس سلسلہ میں عرب و مسلم ممالک میں مغربی زبانوں میں تحقیقی و علمی کام کی کمی اور اس میدان میں ہندوستان کے امتیاز کو ثابت کیا گیا، شاید پہلی مرتبہ ہندوستان کے علماء اور تحقیقی کام کرنے والوں کے علمی کارناموں پر اس تفصیل سے

www.abulhasanalinadwi.org

کسی مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہو، اور بحث و تحقیق کے میدان میں قدیم مدارس کے فضلائ کے اپنے مقصد سے عشق، اس کے لئے ایثار و محنت اور اس باب میں ان کی فوقیت اور امتیاز ثابت کیا گیا ہو، پھر عالم عربی میں تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق کے کام کا جائزہ لیا گیا، آخر میں بتایا گیا کہ عصر حاضر کا جہاد اور حتمی فریضہ اس ذہنی و تہذیبی ارتداد کا مقابلہ اور اس زہر کا تریاق بہم پہونچانا ہے جو مستشرقین مغرب کی تحریروں یا "تحقیقات" نے عالم اسلام میں پھیلا دیا ہے۔

اس سیمینار کا انعقاد دار المصنفین کی اہم دینی خدمات اور اوّلیات میں شمار ہونے کے قابل ہے، وہ جس با مقصد، سنجیدہ ماحول اور جن ممتاز مسلم عرب فضلاء کی موجودگی میں انجام کو پہونچا اور اس میں جو فاضلانہ اور فکر انگیز مقالات پڑھے گئے، اس پر دار المصنفین کو فخر اور خدا کی اس توفیق پر شکر کرنے کا حق ہے، توقع تھی (اور اس کے کچھ آثار ظاہر بھی ہوئے) کہ دوسرے عرب مسلم ممالک اور ان کے موقّر ادارے اس کی تقلید کریں گے، اور ہر سال ایک ایسی مجلس مذاکرہ منعقد ہوگی، جس سے تحقیقی کام کرنے والوں کو موضوع کی اہمیت و ضرورت کا شدّت سے احساس ہوگا، مستشرقین کی نئی کتابوں، اور ان کے اٹھائے ہوئے سوالات اور نقطہائے اعتراض کا نوٹس لیا جائے گا، اور ان موضوعات پر اُور بحیثیل کتابیں اور مضامین لکھنے کا قوی داعیہ پیدا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مسلم اور عرب ممالک اور ان کے علمی مرکزوں میں جس مسابقت اور گرم جوشی کی امید تھی، وہ پوری نہیں ہوئی، اور ایک سال خالی گیا۔[1]

---

[1] معلوم ہوا ہے کہ دسمبر ۱۹۸۴ء میں کراچی میں اس موضوع پر دوسرے عالمی سیمینار کی تیاری ہو رہی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

الجزائر کا سیمینار

الجزائر میں چند سال سے کسی ایک اسلامی موضوع پر حکومت کے شعبۂ امور مذہبی کی طرف سے بڑے اہتمام سے بین الاقوامی پیمانہ پر سیمینار (مجلس مذاکرہ) منعقد کیا جاتا ہے، مجھے بھی چند سال سے اس کی دعوت دی جاتی تھی، لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی مانع پیش آجاتا تھا ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۱ء) کے سیمینار کے موقعہ پر جو حدیث و سنت کے موضوع پر منعقد ہونے والا تھا، مجھے وہاں کے وزیر الشئون الدینیۃ شیخ عبدالرحمٰن شیبان کی طرف سے دعوت نامہ ملا، انھوں نے ذاتی طور پر بھی شرکت کے لئے بڑا اصرار کیا اور پے درپے ان کے اور سیمینار کے ناظم شیخ عبدالوہاب حمودہ کے خطوط اور تار آئے، الجزائر کی اہمیت کی بناء پر کہ اس نے اپنی آزادی کی وہ سب سے بڑی قیمت ادا کی تھی جو اس وقت تک کسی اسلامی یا مشرقی ملک نے ادا نہیں کی،[۱] اس جنگ آزادی کی قیادت الجزائر کے طبقۂ علماء کے ممتاز فرد شیخ عبدالحمید ابن بادیس اور ان کے رفقاء و تلامذہ شیخ محمد البشیر الابراہیمی وغیرہ نے کی تھی، اور اس کی تحریک و جذبہ ان کے درس قرآن و حدیث ہی سے پیدا ہوا تھا، اس طرح الجزائر اور ہندوستان کی تاریخ میں خاص مماثلت پائی جاتی ہے کہ دونوں جگہوں کے علماء نے اپنی بیدار مغزی، غاصب طاقتوں سے نبرد آزمائی اور وقت کے تقاضہ کو پورا کرنے کے بعد ان میں پیش قدمی اور عزیمت کا ثبوت دیا، کچھ اس وجہ سے بھی الجزائر کے ایک سفر کا خیال دل میں

---

[۱] یہ قربانی پانچ لاکھ شہیدوں کی شکل میں تھی جو فرانسیسی قبضہ سے ملک کو آزاد کرانے میں وہاں کے مسلمانوں نے پیش کی تھی۔

www.abulhasanalinadwi.org

انگڑائی لیتا تھا کہ اس سرزمینِ رنگ و بو کو دیکھا جائے، جو خون شہیداں سے لالہ زار ہوئی، اور جس کے غیور فرزندوں نے فرانس جیسی عالمی طاقت کو نکلنے پر مجبور کیا۔

اس سال اس سیمینار کا جو "ملتقى الفكر الاسلامي" کے نام سے موسوم ہے، سولہواں [16] سالانہ اجلاس تھا، یہ ۷ شوال ۱۴۰۲ھ سے شروع ہو کر ۱۳ شوال ۱۴۰۲ھ پر ختم ہوتا تھا، رویت کے فرق کی وجہ سے مغرب میں واقع ہونے والے ممالک میں عید کبھی ہندوستان سے ایک روز اور کبھی دو روز پہلے ہو جاتی ہے، اس کے لئے مجھے عید کے متصلاً سفر کرنا ضروری تھا، جو میرے لئے مہمانوں کے قیام اور تعلیمی سال کے ابتدائی انتظامات کی وجہ سے دشوار تھا، میں نے منتظمین کو لکھ دیا کہ اس کا امکان ہے کہ میں دو روز تاخیر سے پہونچوں انھوں نے اس کو قبول کیا، میں نے سیمینار میں پڑھنے کے لئے اپنے اس مقالہ کی اجازت چاہی جو کچھ ہی عرصہ قبل "طبيعة هذا الدين وسماته البارزة" (دین (اسلام) کا مزاج اور اس کی نمایاں خصوصیات) کے عنوان سے تحریر کیا گیا تھا اور اس میں مقام نبوت اور حدیث و سنت کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی، سیمینار کے ذمہ داروں نے اس کی اجازت دی کہ میں یہ مقالہ پڑھوں، یہ مقالہ میں نے اپنی کتاب "العقيدة والعبادة والسلوك" (جس کا ترجمہ اردو میں "دستور حیات"[1] کے نام سے شائع ہوا ہے) میں شامل کرنے کے لئے لکھا تھا، میں چاہتا تھا کہ اس اہم مقالہ کو بلادِ عربیہ کے ان ممتاز ترین اہل فکر و اہلِ دعوت اور دانشوروں کے سامنے پیش کروں جن کی اس سیمینار میں شرکت کی

---

[1] یہ کتاب ایک مسلمان کی زندگی کے دستور العمل اور ہدایت نامہ کے طور پر تالیف کی گئی ہے، جس میں عقائد، عبادات، اخلاق اور آداب و شمائل کے بارے میں تعلیمات و اسوۂ نبوی کو پیش کیا گیا ہے، اسی ضرورت کے ماتحت جس ضرورت کے لئے اپنے اپنے زمانہ میں "زاد المعاد" "سفر السعادة" اور "مالا بدمنہ" لکھی گئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

توقع تھی، اور جو آسانی سے ایک جگہ اجتماعی طور پر نہیں ملتے، اس مقالہ میں دین کی صحیح روح اور اس کا نبوی مزاج پیش کیا گیا تھا، اور بتایا گیا تھا کہ اس کی پہلی بنیاد عقیدہ کی صحت پر ہے اور اس میں عمل و سعی کا حقیقی محرک رضائے الٰہی کی طلب اور فکر آخرت ہے اس مضمون میں صفائی سے کہا گیا ہے کہ یہ دین جو ہم تک پہونچا ہے، وہ حکیموں، دانشوروں، ماہرین قانون، علمائے اخلاق و نفسیات، بانیانِ سلطنت، سیاسی رہنماؤں، ملکی و قومی قائدین کے ذریعہ نہیں پہونچا، یہ دین ہم تک ان انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ پہونچا ہے، جن کے پاس اللہ تعالےٰ کی وحی آتی تھی، اور جن کا سلسلہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے، اور اس کے فہم و تفہیم، اس کی دعوت و تبلیغ اور اس کے لئے سعی و جہد میں بنیادی طور پر نبوت کی تعلیم اور انبیاء علیہم السلام کے مزاج و سیرت کی پیروی و پابندی کرنی پڑے گی۔

عید سے فارغ ہو کر ۲۸ جولائی ۱۹۸۲ء کو عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں جن کو الگ سے دعوت نامہ موصول ہو گیا تھا، اور انھوں نے بھی "لمحات شعوریۃ و نفسیۃ فی کلام الرسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم" (شعور و نفسیات انسانی کی رعایت و تربیت کے دل آویز نمونے کلام نبویؐ میں) کے عنوان پر ایک مقالہ تیار کر لیا تھا دہلی FRANKFURT کے راستہ سے ۲۹ جولائی کو الجزائر پہونچا، یہ سیمینار ہر سال ملک کے کسی ایک مرکزی شہر میں منعقد ہوتا ہے، اس سال تلمسان کی باری تھی، جو الجزائر (دار الحکومت) سے تقریباً ۳۵۰ سو میل دور ہے، ہم لوگ چونکہ دو روز بعد پہونچے تھے، اور سارا عملہ تلمسان جا چکا تھا، اس لئے الجزائر کے ہوائی اڈہ پر کوئی استقبال کرنے والا اور منزل مقصود پر پہونچانے والا نہ تھا، اس بنا پر ہم دونوں

www.abulhasanalinadwi.org

بڑی زحمت پیش آئی، طویل سفر کر کے آئے تھے، اور جلد اپنے مستقر پر پہونچنے کا تقاضا تھا، عین حالت اضطرار میں تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب (جو اپنے والد صاحب کو جو سفر حجاز سے واپس آرہے تھے، لینے آئے تھے، اور وہ نہیں آسکے تھے) فرشتۂ رحمت بن کر ملے اور انھوں نے اپنی کار سے شہر کے تبلیغی مرکز کی مسجد میں پہونچا دیا، وہاں دوستوں نے وزارت، امور مذہبی سے رابطہ قائم کیا، اور ہماری آمد کی اطلاع دی، وہ لوگ فوراً آئے اور ہم کو شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرایا، اور شیخ عبدالرحمٰن شیبان کو جو اپنے پورے عملہ کے ساتھ تلمسان میں تھے، ہماری آمد کی اطلاع دی، انھوں نے ہمارے سفر کے متعلق ہدایات دیں، اور اگلے روز جو جمعہ کا دن تھا، ہم بذریعہ طیارہ صبح تلمسان پہونچے، شعبۂ امور مذہبی اور الملتقیٰ کے نمائندے وہاں موجود تھے، جو ہم کو لے گئے، اور مہمانوں کے ساتھ ہوٹل میں قیام کرایا، وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ تقریباً تمام ممالک عربیہ سے ممتاز ترین علماء، اساتذہ اور اہلِ فکر شرکت کے لئے آئے ہیں، وسیع اور وقیع نمائندگی کے لحاظ سے کم سیمینار اس الملتقیٰ الفکری کا مقابلہ کر سکتے ہیں، پرانے احباب اور عرب فضلاء اور اسلامی دعوت کا کام کرنے والوں کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی، اور برسوں کے بچھڑے وہاں ملے، ملتقیٰ کے اجلاس میں جب شرکت ہوئی تو معلوم ہوا کہ میرا وہ مضمون جو میں نے رابطہ کے گزشتہ موسم ثقافی کے موقعہ پر "دور الحدیث فی تکوین المناخ الإسلامی وصیانتہ" کے عنوان سے پڑھا تھا، وہ یہاں چھپ کر تقسیم ہو چکا ہے، ایک نشست میں میں نے اور عزیزی محمد رابع نے اپنا اپنا مضمون پڑھ کر سنایا، ایک کمیٹی کی صدارت بھی کرنی پڑی۔

اجلاس سے جب ہم لوگ باہر نکلتے تھے، تو شہر کے نوجوان طلبہ اور لڑکے ہم کو

گھیر لیتے تھے، ان کے پاس ریکارڈر ہوتے تھے، وہ اتنے وقت میں جو سوالات کر سکتے تھے کرتے تھے، اور ہمارے جواب ریکارڈ کر لیتے تھے، پھر فوراً منتظمین ہم کو کار پر بٹھا کر ہوٹل پہونچا دیتے تھے، اس کا بھی اندازہ ہوا کہ ساری عرب حکومتوں کی طرح یہاں بھی پبلک اور پرجوش نوجوانوں سے ہمارا آزادانہ طریقہ پر ملنا اور تبادلۂ خیال پسند نہیں کیا جاتا ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ میری عربی تصنیفات اور دعوتی کتابیں یہاں خاصی مقبول ہوئی ہیں، اور یہ معلوم کر کے مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ "الصراع بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية" (مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش) خاص طور پر توجہ سے پڑھی گئی ہے، جس میں خود الجزائر کی صورت حال پر تنقید ہے، بعض کالجوں کے ذمہ دار بلا کسی استثناء کے طلباء کو ہماری کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دیتے ہیں۔

میں چونکہ عرصہ کے اصرار اور خواہش کے بعد الجزائر گیا تھا، اس لئے وزارت امور مذہبی نے اور اس کے فاضل اور دیندار سربراہ شیخ عبدالرحمٰن شیبان نے میری آمد کو بہت اہمیت دی تھی، اور وہ میرے ساتھ خصوصی معاملہ کرتے تھے، سیمینار سے فراغت کے بعد گورنر تلمسان نے...... مہمانوں کی دعوت کی، یہ جگہ مملکت مغربیہ (رباط و مراکش) سے بہت قریب تھی، پورا ملک نہایت خوبصورت، سرسبز، متمدن اور ترقی یافتہ ہے، اہل ملک میں بالخصوص نوجوانوں میں دینی جذبہ پایا جاتا ہے، جس کو قابو میں رکھنے میں احتیاط اور انتظام سے کام لیا جاتا ہے، تلمسان کے آثار قدیمہ اور تاریخی مقامات کی بھی سیر کی، وہاں سے الجزائر آئے، جہاں دو روز قیام کر کے ۷ راگست ۱۹۸۲ء کو پیرس کے لئے روانگی ہوئی، وہاں سے ایرانڈیا کا جہاز پکڑا اور

www.abulhasanalinadwi.org

۸ راگست کو بخیر و عافیت ہندوستان واپسی ہوگئی۔

اس کے اگلے سال ۱۴۰۳ھ میں "الاجتہاد ونشأۃ المذاہب الفقہیۃ" کے موضوع پر ستر ہواں سیمینار تھا، میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے افتتاح کی تقریب میں (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) شرکت کی وجہ سے جس کو میں نے زیادہ ضروری سمجھا الملتقیٰ کے ذمہ داروں کے اصرار و تقاضہ کے باوجود شریک نہیں ہوسکا، اس اجلاس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد حدیث و تفسیر مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی نے شرکت کی، میں نے اپنا مقالہ جو اسی سیمینار کے لئے تیار کیا تھا، اور اسی عنوان پر تھا پڑھنے کے لئے بھیج دیا، اور وہ وہاں سنایا گیا اور چھپ کر تقسیم ہوا، اس میں میں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے تقلید و اجتہاد کے بارے میں مسلک اعتدال کو پیش کیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

باب پنجدہم[۱۵]

سری لنکا کا سفر، حیدرآباد کے خطبات، برکت اللّٰہ و جہاد افغانستان کے بارے میں بیان، آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سنٹر کا افتتاح،

اور

مقالہ "اسلام و مغرب"

سری لنکا کا سفر

فروری ۱۹۸۲ء کی کسی تاریخ کو رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ محمد علی الحرکان کا خط میرے نام آیا کہ سیلون میں الجامعۃ النظیمیہ (NAEMIA UNIVERSITY) کے نام سے ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے، اس کے بانی الحاج محمد نظیم اور اس کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد شکری چاہتے ہیں کہ آپ وہاں کا سفر کریں، اس جامعہ میں آپ کی کتابیں نصاب میں داخل ہیں، ہم بھی ان کی سفارش کرتے ہیں کہ آپ ضرور جائیں اور وہاں اپنے خطاب سے لوگوں کو مستفید کریں، جامعہ والوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مولانا شہید اللہ صاحب نائب مدیر جامعہ کو لکھنؤ بھیجا، تاکہ وہ شخصی طور پر وہاں کا پیغام اور دعوت نامہ پہونچائیں، اور سری لنکا آنے کی تاریخ مقرر ہو جائے۔

اس تاکیدی پُر اصرار دعوت کے جواب میں وہاں کے سفر کا ارادہ کر لیا گیا،

www.abulhasanalinadwi.org

پہلے مارچ کے مہینہ اور عزیزی محمد رابع ندوی کی معیت میں سفر طے ہوا لیکن پھر مئی کا مہینہ اس سفر کے لئے طے کیا گیا، اس لئے کہ مئی کی ۱۱ تاریخ کو جامعہ کا جلسۂ تقسیم اسناد (کانووکیشن) منعقد ہونے والا تھا، اور جامعہ سے فراغت حاصل کرنے والوں کی پہلی جماعت کو سندیں دی جانے والی تھیں بعض ضرورتوں کی بناء پر محمد رابع سلمہٗ اس سفر میں ساتھ نہیں ہو سکے، ان کی جگہ عزیزی سید سلمان ندوی[۱] نے اس سفر میں رفاقت کی۔

۷ مئی ۱۹۸۲ء کو براہ دہلی لکھنؤ سے روانگی ہوئی، ۹ مئی کو سوئس ایر لائن SWISS AIR LINE سے بمبئی سے براہ راست کولمبو پرواز کی گئی، یہ سری لنکا کا پہلا سفر تھا، اس لئے ملک اور وہاں کے لوگوں کا کوئی واضح تصوّر ذہن میں نہیں تھا، بچپن سے یہ بات کان میں پڑی تھی (اور بہت سے عرب محققین نے بھی لکھی ہے) کہ

---

[۱] عزیز موصوف بھائی صاحب مرحوم ڈاکٹر عبد العلی صاحب رح کے حقیقی نواسہ اور عزیزی مولوی سید محمد طاہر منصور پوری کے فرزند ہیں، دار العلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل کرنے کے بعد جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض سے بڑے امتیاز اور نیک نامی کے ساتھ فراغت حاصل کی، ان کا تحقیقی مقالہ جس کو وہاں کے اساتذہ بالخصوص علامہ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے بہت پسند کیا، کا عنوان تھا "جمع الفاظ الجرح والتعديل ودراستها من خلال تهذيب التهذيب الاجزاء ۱-۲-۳۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے بھی اس مقالہ سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور وہ عرصہ تک مطالعہ کے لئے ان کے پاس رہا، اب دار العلوم ندوۃ العلماء میں استاذ ہیں، عربی زبان میں تحریر و تقریر پر یکساں قدرت ہے، میرے متعدد خطبات و رسائل کا اردو میں ترجمہ کیا، "تاریخ دعوت و عزیمت کے حصہ چہارم و پنجم کو بڑی خوبی اور کامیابی سے عربی میں منتقل کیا، چوتھا حصہ "الامام السرہندی" کے نام سے شائع ہو گیا ہے اور پانچواں حصہ "الامام الدہلوی" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حضرت آدم علیہ السلام جب جنّت سے نکلے تو یہیں نزول فرمایا، اب بھی ان کے نام سے ADAM PEAK یا کوہ آدم مشہور ہے، جہاں ان کے قدم کا نشان بھی بتایا جاتا ہے، حالی مرحوم کا یہ شعر بچپن میں پڑھا تھا۔

سرکوہ آدمؑ سے تا کوہ بیضا
جہاں جاؤگے پاؤگے کھوج ان کا

ہمیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ہم کسی سُرنگ میں جا رہے ہیں جس کے گرد وپیش کچھ نظر نہیں آتا، لیکن اردو کے اس شعر کا تجربہ بار رہا ہوا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

اور یہ ملک تو بہت سرسبز، اور وہاں کے رہنے والے (خاص طور پر ہمارے میزبان اور داعی) بڑے مسافر نواز اور کریم النفس تھے، کولمبو ایرپورٹ پر یونیورسٹی کے ذمہ دار موجود تھے، وہ وہاں سے بانی جامعہ الحاج محمد نظیم صاحب کے بنگلہ پر لے گئے، جہاں کچھ دیر ٹھہر کر وہاں سے قصبہ بیروالا BERUWALA کی طرف ہم لوگ روانہ ہوئے، جو کولمبو سے ۳۴ میل کی مسافت پر بحر ہند کے مشرقی ساحل پر واقع ہے، الحاج محمد نظیم جواہرات کے ایک ممتاز و کامیاب تاجر ہیں، انھوں نے اپنی محنت و ذہانت سے (جو جواہرات کے پہچاننے میں ان کو حاصل تھی) بہت ابتدائی حالت اور معمولی حیثیت سے ترقی کی اور اس حیثیت کو پہونچے کہ وہ سری لنکا کے متموّل ترین مسلمانوں میں ہیں، وہ تقریباً ناخواندہ اور عربی اور مغربی زبانوں سے نابلد ہیں، انھوں نے اس جامعہ کی بنیاد ڈالی اور تنہا وہی اس کی ضروریات اور مصارف کے متکفّل ہیں، ڈاکٹر محمد شکری صاحب کے سے

www.abulhasanalinadwi.org

معلوم ہوا کہ اس جامعہ کے اس طرز پر قیام کا خیال میرے رسالہ "ردّۃ ولا ابا بکر لہا" کے مطالعہ سے پیدا ہوا، ان کے ذہن نے اس کی روح اور اس کے مرکزی مضمون کو پورے طور پر قبول کر لیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم اسلام کا اس وقت کا اصل مسئلہ وہ ذہنی و تہذیبی ارتداد ہے جو آگ کی طرح تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیلا ہوا ہے اور وہ اعتقادی ارتداد کے حدود کو چھو رہا ہے، لیکن مسلم معاشرہ اس کا وہ نوٹس نہیں لے رہا ہے جس کا وہ مستحق ہے، اس کے مقابلہ کے لئے ایک ایسی با صلاحیت، تعلیم یافتہ نسل کی ضرورت ہے جو اسلام کی عظمت و ابدیت پر اپنے دل کی گہرائی اور ذہنی و علمی وثوق و دلائل کے ساتھ یقین رکھتی ہو اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو، اسی تخیل پر بنام خدا اس جامعہ کی بنیاد رکھ دی گئی، حاجی محمد نظیم صاحب نے اس کی پوری مالی ذمہ داری قبول کی، جامعہ کی مرکزی عمارت، دفاتر، طلبہ کے ہوسٹل، اساتذہ کے قیام کے لئے مستقل عمارت، ایک وسیع اور خوبصورت ہال، عملہ کے لئے کوارٹر اور ایک وسیع اور خوبصورت مسجد تعمیر کی، اس دورہ میں انھوں نے جامعہ کی مرکزی لائبریری کا سنگ بنیاد مجھ سے رکھوایا، ان سب تعمیرات اور شعبوں پر حاجی محمد نظیم صاحب ابھی تک پچاس لاکھ روپے اپنی جیب خاص سے خرچ کر چکے ہیں، حاجی صاحب کی نیک دلی اور خوف خدا کا اندازہ اس سے ہوگا کہ انھوں نے اپنے قیام کے لئے بیروو الا میں شاندار کوٹھی بنائی، جس پر بڑی لاگت آئی، ان کے دل میں خیال آیا کہ انھوں نے اپنی ذات کے لئے اس مکان کی تعمیر میں بڑے اسراف سے کام لیا ہے، انھوں نے اس کی تلافی کے لئے دس مکان بنا کر ضرورت مندوں کے حوالہ کر دیئے، یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ میڈیسن و انجینرنگ کی تعلیم کے لئے طلبہ کو دو سو وظیفے دیتے ہیں، انھوں نے از راہِ احتیاط جامعہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

جس میں اپنے کسی بیٹے کو نہیں رکھا ہے، تاکہ یہ ادارہ قومی رہے اور خاندانی میراث نہ بنے۔

اس جامعہ کے قیام کو آٹھ سال ہو چکے تھے، اور اس کے فارغین کی پہلی جماعت کو اس جلسۂ تقسیم اسناد میں جس میں سری لنکا کے وزیر خارجہ، وزیر رسل و رسائل، متعدد عرب و مسلم حکومتوں کے سفراء، اور مسلمان رہنما شریک تھے، میرے ہاتھ سے سندیں دلوائی گئیں، جامعہ میں ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تیار کی ہوئی کئی کتابیں نصاب میں داخل ہیں، موجودہ وائس چانسلر یا پرنسپل ڈاکٹر محمد شکری ہیں، جنھوں نے ایڈنبرا یونیورسٹی سے امام ابوطالب کی کی مشہور کتاب "قوت القلوب" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ان کو عربی، انگریزی، اور ٹامل زبان پر یکساں قدرت حاصل ہے، "ردۃ ولا ابابکر لہا" کا ترجمہ ٹامل زبان میں کر چکے ہیں، اور "ماذا خسر العالم" کے ترجمہ میں مصروف ہیں، ان کے نائب مولانا شہید اللہ صاحب ہیں، جن کا بنگلہ دیش سے تعلق ہے، اور وہ اردو، انگریزی اور عربی پر پوری قدرت رکھتے ہیں، جامعہ میں ازہر و سعودی جامعات کے متعدد مبعوث اساتذہ ہیں۔

جلسۂ تقسیم اسناد میں (جس میں میں نے عربی میں تقریر کی) میں نے کہا کہ یہ ملک وہ ہے، جس کے متعلق یہ روایت مشہور چلی آرہی ہے (اس کی فنی صحت کی ذمہ داری لئے بغیر) کہ ہمارے آپ کے اور نسل انسانی کے مورث اعلیٰ سیدنا آدم علیہ السلام نے جنت سے یہیں نزول فرمایا، آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تھا "ایھا الناس إن ربکم واحد و إن أباکم واحد"[1] "لوگو! تمہارا رب بھی ایک ہے، اور تمہارا مورث اعلیٰ (باپ) بھی ایک) یعنی تم دو رشتوں سے (یعنی بندگی و فرزندی کے رشتہ سے) ایک دوسرے کے بھائی ہو۔

---

[1] کنز العمال

www.abulhasanalinadwi.org

اس صداقت و حقیقت اور اس فرمان نبوی کا اعلان جو اخوتِ انسانی کی سب سے مستحکم بنیاد اور حقوق انسانی کے بین الاقوامی منشور کی سب سے اہم دفعہ ہے، اگر دوسرے اسلامی ممالک ایک مرتبہ اعلان کریں تو آپ کو (مشہور روایت کے مطابق) مہبط آدمؑ ہونے کی بنا پر دس مرتبہ اعلان کرنا چاہیئے، اور وہ اگر آہستہ اور احتیاط سے کہیں تو آپ کو ڈنکے کی چوٹ پر اور ببانگ دہل اعلان کرنا چاہیئے اور اس کا داعی اور مبلّغ ہونا چاہیئے۔

اس تقریب کے ماسوا جس کے لئے سفر کیا گیا تھا، اساتذہ اور طلباء اور عملہ کے سامنے مستقل تقریریں ہوئیں، ایک تقریر کولمبو میں کلیۃ الزاہرہ ایک تبلیغی جماعت کے مرکز، ایک کولمبو کی جمیعۃ العلماء کے ارکان کے سامنے، کل آٹھ تقریریں ہوئیں، عزیزی سید سلمان سے اساتذہ اور طلباء بہت مانوس ہوئے، اور ان کے بار بار عربی میں خطابات ہوئے، جن میں انھوں نے تعلیمی مشورے دیئے اور اخلاقی و دینی پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی۔

اس قصبہ کے قریب ایک مقام بنطوطہ ہے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہے، وہ اپنے مشہور سفر میں یہاں بھی آئے تھے، ابوزید سیرافی اور سلیمان تاجر کا آنا بھی ثابت ہے، کوہ آدمؑ یا ADAM PEAK بیروولا سے (جہاں ہمارا قیام تھا) ڈیڑھ سو ۱۵۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، وہ سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلند ہے، وہاں حضرت آدم علیہ السلام کا نقش قدم بتایا جاتا ہے جس کا عام انسانی پاؤں کے حساب سے پانچ قدم کا طول ہے[1]، کسی زمانہ میں سیلون اور مسلم حکومتوں کے درمیان اچھے تعلقات تھے، کُل آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے، مسلمانوں کا تناسب سات فیصدی اور

---

[1] حضرت آدم علیہ السلام کے نزول اور ان کے آثار کے پائے جانے کے لئے صحیح احادیث و روایات میں کوئی ثبوت نہیں ہے، بہت سے مسلمان مؤرخین و مصنفین نے اس کا ذکر کیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ان کی تعداد بارہ۱۲ لاکھ ہے، باشندے اپنے حلیہ، رنگ اور قومیت میں جنوبی ہند کیرلا اور مدراس کے باشندوں سے ملتے جلتے ہیں، زمین بھی اسی طرح کی ہے، سیکڑوں میل تک ڈوروبیہ ناریل کے درخت نظر آتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا معاملہ (جہاں تک ہمیں علم ہوا) اس وقت بُرا نہیں تھا، جمعہ کے دن ایک گھنٹہ کے لئے تمام دفاتر اور مدارس بند ہو جاتے ہیں، ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ریڈیو پر مسلمانوں کی دلچسپی کی چیزوں کے نشر کے لئے مخصوص ہے، عیدوں اور رمضان میں اور زیادہ وقت دیا جاتا ہے، کابینہ میں دو وزیر مسلمان ہیں، وزیر خارجہ جن کا نام شاہ الحمید ہے، دوسرے ہمارے دوست اور رابطہ کے قدیمی رکن محمد حنیفہ محمد جن کے پاس تین وزارتیں ہیں، اصل باشندوں کی زبان سنگھالی ہے، اور ان میں اکثریت بدھ مذہب کی ہے، لیکن جنوبی ہند سے آئے ہوئے لوگوں کی زبان ٹامل ہے، اس زمانہ تک اس لسانی فساد کے کوئی آثار نہیں تھے (یا ہم کو ان کا علم نہیں ہوا) جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور اس وقت وہ وہاں کا سب سے بڑا مسئلہ اور اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا ہے۔

بیروت اور افغانستان کے بارے میں قلبی احساسات و جذبات کا اظہار

ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء میں بیروت کا وہ المیہ پیش آیا، اور فلسطینی و لبنانی مسلمان بھیڑ بکری کی طرح اس طرح مارے گئے کہ اس کی مثال قریبی علاقہ اور ماضی قریب میں نہیں ملتی، عالم اسلام کی بے وزنی اور بے وقعتی، پڑوسی عرب حکومتوں کی بے بسی اور بے حسی، اور بڑی طاقتوں کی نہ صرف خاموشی بلکہ تماشا بینی دیکھ کر دل پارہ پارہ ہو گیا، عالم عربی سے قریبی واقفیت رکھنے اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں نہ صرف ان کے

www.abulhasanalinadwi.org

تغافل بلکہ مجرمانہ کردار سے واقف ہونے کی بنا پر میرے لئے یہ یکسر انکشاف کی حیثیت نہیں رکھتا تھا، ۱۹۷۳ء میں چھ مسلم ممالک کا جو سفر رابطہ کے وفد کے سلسلہ میں کیا گیا تھا، اس میں بیروت بھی چند روز ٹھہرنا ہوا تھا، بیروت کے بارے میں اپنے تاثرات اور اندیشوں کا اظہار بھی کیا گیا، اس تحریر میں صاف طور پر یہ الفاظ آئے ہیں:-

"فلسطین میں اپنے مستقبل کی طرف سے مایوسی، بے اعتمادی، اور موجودہ حالات سے بیزاری عام ہے، یہ تمام چیزیں اس ملک کے لئے نہیں، پوری عرب دنیا کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ صورت حال ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی، خواہ اس کے دور کرنے میں جتنا بھی وقت لگے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کیسی ہی کوشش کی جائے، دوسری طرف پورا ملک زندگی کی نعمتوں اور آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے، اور ہر جگہ دولت کی ریل پیل ہے"۔[1]

اس موقعہ پر یہ بھی الفاظ آئے ہیں کہ "عمارتوں کی دیواروں میں گولیوں اور بموں کے نشان، اور لوگوں کے دلوں میں اس کے ناسور دیکھے، پناہ گزینوں اور فلسطینیوں کا مسئلہ جس پیچیدگی، ابہام اور تضاد کا شکار ہے، اس کی نظیر دنیا کے دوسرے مسائل میں ملنا مشکل ہے"۔

بیروت کے ان واقعات سے متاثر ہو کر میں نے اس کے بارے میں ایک بیان عربی، اردو، اور انگریزی پریس کے لئے تیار کیا، اس میں اسرائیل کی وحشیانہ اور سفاکانہ کارروائیوں فلسطینی پناہ گزینوں اور مجاہدین آزادی کے جبریہ انخلاء، لبنان کے مارونی عیسائیوں اور فلانجسٹ کے ہاتھوں فلسطینیوں کے بے رحمانہ قتل پر اپنے گہرے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے

---

[1] "دریائے کابل سے دریائے یرموک تک" ص ۱۳۴

ملت اسلامی کے افراد کی عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصیت کے ساتھ دلوں کی ترجمانی کی، اس میں صاف صاف کہا گیا کہ "اس وقت بھی متمدن، تعلیم یافتہ اور تہذیب کے مدعی انسانوں میں وہ خون آشامی، بلکہ خونخواری پائی جاتی ہے، جو ہزاروں برس پہلے کے دور جہالت کی خصوصیت اور آدم خور قوموں اور قبائل کی روایت سمجھی جاتی تھی، اس قتل عام نے یہ ثابت کر دیا کہ مذہبی منافرت اور تعصّب عیسائی دنیا میں اسی طرح زندہ ہے، جس طرح بارہویں صدی عیسوی میں یورپ کے صلیبی حملہ آوروں کے سینہ میں موجزن تھا، اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور عیاں ہوگئی کہ محض انسانی ضمیر، اخلاقی حسّ، انصاف اور معقولیت پسند جماعتوں، بلکہ حکومتوں کی لامت و مذمّت، اقوام متحدہ جیسے عالمگیر ادارہ کا احتجاج اور اس کی تجاویز، پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں، اور ابھی تک اس متمدن دنیا میں جنگل کا قانون (MIGHT IS RIGHT) کا اصول چل رہا ہے، اس کے بعد اس صورت حال کے ازالہ کے سلسلہ میں ان تدابیر اور طریق کار کا ذکر کیا، جن کی قرآن اور شریعتِ آسمانی تعلیم دیتی ہے، اور اسلامی بلکہ انسانی تاریخ ان کی کامیابی کے ثبوت اور شہادتیں پیش کرتی ہے۔

اس بیان کی اشاعت عالم عربی اور اسلامی پریس میں وسیع پیمانہ پر ہوئی، وہ علیحدہ سے بھی اردو، عربی، انگریزی میں شائع ہوا، مصنف کے ایک عزیز دوست قاضی افضل بیابانی صاحب نے جو شکاگو میں مدینہ پریس کے مالک اور اسلامی کتابوں کے ناشر ہیں، ہمارے اس بیان کو ۱۶ر نومبر ۱۹۸۲ء کو اپنے خط کے ساتھ امریکن پریسیڈنٹ مسٹر ریگن کو بھیجا، اور ان کے دفتر سے اس کی رسید بھی آئی، جو انھوں نے مجھے بھیج دی۔

www.abulhasanalinadwi.org

اسی طرح سے دسمبر ۱۹۸۲ء میں میں نے عربی میں "افغان مجاہدین کو سلام" کے عنوان سے مجاہدین افغانستان کے لئے ایک تائیدی اور تہنیتی پیغام لکھا جنھوں نے کمیونسٹ حملہ اور روس جیسی دنیا کی دوسری عظیم طاقت کے مقابلہ کی عالم اسلام میں ایک نئی نظیر قائم کی تھی، جس سے ہر ملک کے صحیح الخیال مسلمان ایک نیا حوصلہ اور جذبہ محسوس کرتے تھے، اور گویا انھوں نے عہد حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کی شرم رکھ لی تھی، اور ثابت کر دیا تھا کہ۔ ؎

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اس بیان میں کمیونسٹ انقلاب اور اشتمالی فلسفہ کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی، اور بتایا گیا تھا کہ اس فلسفہ کے اثرات سیاسی اور اقتصادی میدانوں تک محدود نہیں ہیں، اس کی خطرناک، شدید اور تباہ کن ضربیں عقیدہ و عمل کی ان بنیادوں اور شرافت و اخلاق کے ان تمام اصول و مسلّمات پر بھی پڑتی ہیں، جن پر تمام آسمانی مذاہب کا اتفاق ہے، اور تاریخ کے ہر دور میں ان پر انسانی معاشرہ کی بنیادیں استوار ہوئیں، اور وہ فطرت انسانی اور عقل سلیم کا عین تقاضا ہیں، کمیونزم ان انسانی قدروں کی بنیادیں منہدم کر کے اس کے کھنڈروں پر کلیتہً ایک مصنوعی اور مشینی معاشرہ کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، یہ المناک حقیقت ہے کہ انسانیت کے خلاف اس منفی، غیر فطری، مجرمانہ اور انتشار انگیز سازش کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

پھر افغانستان کے مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا گیا کہ افغانستان تنہا وہ ملک ہے، جہاں غیر ملکی فوجوں اور سیاسی قزّاقوں کے خلاف فوجی اعتبار سے

www.abulhasanalinadwi.org

ناسازگار اور سخت حالات کے باوجود اتنی لمبی مدّت تک جنگ جاری رہی جس کی دوسرے اسلامی ملکوں میں مثال نہیں ملتی، اس کا راز ان کی قومی غیرت، دینی حمیّت، سخت کوشی اور سپاہیانہ زندگی میں پوشیدہ ہے، آخر میں اقبال کے ان دو شعروں پر ختم کیا گیا ؂

قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال
یہ امّتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

یہ بیان نومبر ۱۹۸۲ء کے آخر میں جاری کیا گیا، اور عربی، اردو میں اس کی وسیع پیمانہ پر اشاعت ہوئی، یہ ایک دور افتادہ مسلمان کے دینی جذبات کا اظہار اور وہ اخلاقی و اصولی تائید و حمایت تھی، جو ایک قلیل الوسائل کثیر المسائل ہندوستانی مسلمان پیش کر کے اپنے ضمیر کو ہلکا اور اپنے قلب کو مطمئن کر سکتا تھا۔

خطبات حیدرآباد

۱۱-۱۳ / اکتوبر ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد میں بیرونی زبانوں کی تعلیم کے مرکزی ادارہ (CENTRAL INSTITUTE OF ENGLISH AND FOREIGN LANGUAGES) کی طرف سے عربی زبان کی تعلیم اور اس کے مشکلات و مسائل کے موضوع پر ایک آل انڈیا سیمینار منعقد ہو رہا تھا، ادارہ کے صدر پروفیسر عبدالحلیم ندوی نے مجھے اس مجلس مذاکرہ کے افتتاح کی دعوت دی، میں نے موضوع سے اپنی دلچسپی اور عزیز داعی کے تعلق کی بناء پر منظور کر لیا، اور اپنے چند عزیز رفقاء کے ساتھ (جن میں برادر مکرم مولوی سید ابوبکر حسنی ایم۔ اے اسسٹنٹ پروفیسر نہرو یونیورسٹی، دہلی، اور رفقائے عزیز

www.abulhasanalinadwi.org

مولوی معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء مولوی سعید الرحمٰن ندوی مدیر "البعث الاسلامی" اور عزیزی محمد رابع ندوی تھے) ۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد پہونچا، اور اپنی قدیم قیام گاہ عبداللہ بھائی پٹنی مالک بمبئی آندھرا ٹرانسپورٹ کی کوٹھی بنجارہ ہل پر قیام کیا، ۱۱/ اکتوبر کو آل انڈیا عربک سمینار کا پہلا جلسہ ہوا، جس کی صدارت نواب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اترپردیش نے کی، میں نے اردو میں افتتاحی تقریر کی، جس میں بتایا کہ عربی زبان کی تحصیل و مہارت کا سب سے طاقتور محرک دینی، روحانی، اخلاقی اور اصولی ہے، اسی سے عجمی قوموں کے عربی زبان پر قدرت اور اس کی خدمت کے وہ محیر العقول نتائج اور کارنامے دنیا کے سامنے آئے، جن کی مثال نہ صرف ان زبانوں کے معاملہ میں نظر نہیں آتی جن کی تحصیل اور ان میں کمال پیدا کرنے کے محرکات محض سیاسی، معاشی اور علمی تھے، بلکہ خود اہلِ زبان عربوں میں بھی تلاش سے نہیں مل سکتے، جن کے یہاں یہ محرک بہت سے اہلِ عجم کی طرح اتنا طاقتور اور گہرا نہیں تھا، اس سلسلہ میں ایرانی النسل علمائے عرب اور ہندوستانی فضلاء کی مثالیں دی گئیں، جن کی عربی زبان و ادب کی خدمات اور اس میں دقتِ نظر، عالی حوصلگی، اور پوری کی پوری زندگی وقف کر دینے کی مثال ممالک عربیہ میں بھی صدیوں تک نہیں ملتی، یہی محرک وہ عشق، جذبہ، سوز دروں اور محلی کا اثر پیدا کرتا ہے، جس پر اہل زبان بھی سر دھنتے اور مست ہوتے ہیں۔

اس تقریب سے فراغت ہوئی تو حیدرآباد کے دوستوں نے جن سے قدیم عزیزانہ دینی و فکری روابط ہیں، مختلف اجتماعات کا انتظام کیا جس میں مجھے بے تکلف اظہار خیال کا موقعہ ملا، ہندوستان کے موجودہ حالات، انتظامیہ اور معاشرہ کی

www.abulhasanalinadwi.org

اخلاقی پستی اور دیوالیہ پن نے جو اپنے آخری نقطہ تک پہونچ گیا ہے، نیز ملت اسلامیہ ہندیہ کی جو اس برّصغیر میں امید کی آخری کرن اور انسانیت کی پناہ گاہ ہے، اور جس پر ایک طرف داعی دین اور محافظ انسانیت کے رشتہ سے، دوسری طرف بے لوث وباوفا ہندوستانی ہونے کے رشتہ سے دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے، بے حسی نے دل کو ایسا زخمی کر دیا ہے کہ جہاں بھی اچھے اور سمجھدار سننے والے ملتے ہیں، دل و دماغ کے اندر کا یہ گرم چشمہ اُبل پڑتا ہے، اور بقول اقبالؔ ؎

شعلہ ہا آخر ز ہر موئیم دمید

از رگِ اندیشہ ام آتش چکید

اور یہ تو حیدرآباد تھا جہاں کے مسلمان بہت سی ریاستوں کے مسلمانوں سے امتیاز رکھتے ہیں، اور ان میں بڑی حد تک خود اعتمادی، زندہ دلی اور حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہے، اس بناء پر ان کو اور بھی یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ وہ ایک داعی اور قائد ملت کے افراد ہیں، اور اسی داعیانہ حیثیت اور قائدانہ صلاحیت سے وہ نہ صرف اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ پورے ملک کی خدمت کر سکتے ہیں۔

قیام حیدرآباد کے چار دنوں میں متعدد تقریریں ہوئیں، یہاں پر صرف دو تقریروں کے دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جو پوری ملت اسلامیہ کے لئے پیغام رکھتے ہیں، ایک اس تقریر کا اقتباس جو "ہندوستان میں مسلمانوں کی ذمہ داری" کے عنوان پر ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی شام کو مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ حیدرآباد کے ایک بڑے اجتماع میں کی گئی، تقریر کے آخر میں کہا گیا:۔

www.abulhasanalinadwi.org

"تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم کا اخلاقی زوال پہلے شروع ہوتا ہے، سیاسی زوال بعد میں آتا ہے، یونان، رومۃ الکبریٰ، سلطنت ساسانیہ، قدیم ہندوستان اور اسلامی سلطنتوں کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے، ہمارے ملک کے ذمہ داروں، سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں، دانشگاہوں کے سربراہوں، ملک کے ارباب حل وعقد اور دانشوروں کو پوری حقیقت پسندی اور وسیع النظری سے ملک کے حالات کا جائزہ لینا چاہئے، اور اس مہیب اخلاقی زوال سے لرزہ براندام ہو جانا چاہئے کہ اس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوگئی ہے کہ اس ملک میں صرف پیسہ، عہدہ، ذات، برادری، اور سیاسی مقاصد کی تکمیل ہی حقیقت ہے، باقی صرف فلسفہ اور مذہبی لوگوں کی "سادہ لوحی" اور واعظوں کی "لفاظی" ہے، پھر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اتنے لمبے چوڑے ملک میں راس کماری سے لے کر سری نگر تک یہ آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں، یہ کہنے والا کہ اخلاق درست کرو، انسانیت کا سبق پڑھو، ملک کو بچاؤ، کوئی نہیں، یہ کہنے والے ہزار ہیں کہ ہماری پارٹی میں آؤ، فلاں کی قیادت تسلیم کرو، اس کا شکوہ نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے، سب کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ غلط صحیح ہوتا ہے، ہمارے جھنڈے کے نیچے اور ہمارے زیر اقتدار ہو، دل کا یہ درد، دیوار کا یہ نوشتہ، افق پر چمکنے والے اقبال وزوال کے تارے ہیں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں، اب آپ کا خاص طور پر نوجوانوں کا کام ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں، خود بچیں اور ملک کو بچائیں،

www.abulhasanalinadwi.org

خود فائدہ اٹھائیں اور ملت کو فائدہ پہونچائیں۔ ع

لے اپنے مقدّر کے ستارہ کو تو پہچان

"وما علینا الا البلاغ"

دوسری اہم تقریر وہ تھی جو مجلس علمی حیدر آباد کی اس نشست میں کی گئی جو ۱۴؍ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو جمیل الدین خاں ایڈوکیٹ کے دولت خانہ پر شب میں ہوئی، جس میں بڑی تعداد میں حیدر آباد کے علمائے کرام، فضلائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ تشریف رکھتے تھے، اس میں بتایا گیا کہ علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع ہے، اس کا ایک اقتباس یہاں پیش ہے:۔

"حضرات! علماء کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق، ملک کے حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہیئے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لئے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا، اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے لگے تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی اور وہ دعوت و اصلاح کا فرض انجام نہیں دے سکیں گے، اور اتنا ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہو جائے گا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انھوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں

www.abulhasanalinadwi.org

اس ملک نے ان کو اس طرح اُگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے اور ان کو اگل کر باہر پھینک دیا، اس لئے کہ انھوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی۔

آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ اگر مسلمانوں کو سَو فی صدی تہجّد گزار بنا دیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنا دیں، لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جا رہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے، ملک میں بداخلاقی، وبا اور طوفان کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو رہی ہے تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا، اگر آپ نے دینداروں کے لئے اس ماحول میں جگہ نہیں بنائی، اور ان کو ملک کا بے لوث مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے، تو آپ یاد رکھئے کہ عبادات و نوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہو جائے، اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا، زندگی کے حقائق سے ان کی آنکھیں بند رہیں، اور ملک میں ہونے والے انقلابات، نئے بننے والے قوانین، عوام کے دل و دماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر اُمّۃ کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہو جائے گی!!

www.abulhasanalinadwi.org

حیدرآباد سے واپسی پر دو روز اورنگ آباد قیام رہا جس کو مصنف کے بقول (شہنشاہ اورنگ زیبؒ کی آخری سرگرمیوں کا مرکز بننے کی وجہ سے) اندلس کے غرناطہ سے مماثلت ہے، یہاں ملک عنبر کی جامع مسجد میں کاشف العلوم کے نام سے ایک عربی مدرسہ بھی ہے، جس کا الحاق دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہے، ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو اورنگ آباد آزاد کالج میں ایک بڑا جلسہ ہوا، جس کی صدارت مشہور شاعر جناب سکندر علی وجدؔ نے کی، اساتذہ، طلبہ اور معززین شہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، میں نے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی رعایت سے جو اچھے گھرانوں اور خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، اور جن کے سامنے مستقبل کے شاندار نقشے اور سہانے خواب تھے، اصحاب کہف کا قرآنی قصہ ان کے لئے قابل فہم زبان و اسلوب میں اس انداز سے بیان کیا کہ موجودہ عہد و ماحول میں وہ اس سے رہنمائی حاصل کرسکیں، اور ان کے اندر ان کے نقش قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو، یہ تقریر "تحفۂ دکن" میں "قصہ سات جواں مردوں کا" کے عنوان سے آئی ہے[1]، اگلے دن ایک تقریر جامع مسجد اورنگ آباد میں "سیرت و کردار کی تبدیلی کی ضرورت" کے عنوان سے کی گئی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا اسلامک سنٹر اور مقالہ "اسلام اور مغرب"

مئی ۱۹۸۳ء کے اوائل کی کوئی تاریخ تھی کہ فاضل گرامی پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کا اچانک خط ملا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں جو برطانیہ کی عظیم ترین اور دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹی ہے، ایک اسلامی مرکز (ISLAMIC CENTRE) کے قیام کو

---

[1] تحفۂ دکن صـ ۵۹ـ۷۰

www.abulhasanalinadwi.org

سوچا جا رہا ہے[1] یہ یونیورسٹی کی سات سو سال کی تاریخ میں پہلا موقعہ ہے کہ اسلام کے مطالعہ اس پر بحث و تحقیق اور اس سے فضلائے مغرب اور طالبین حق کو روشناس کرنے کے لئے اس خالص مسیحی، علمی و تعلیمی ماحول و مرکز میں ایک سنجیدہ قدم اٹھایا جا رہا ہے اس تحریک میں ST CROSS COLLEGE کے استاد اور وائس پرنسپل DR. D.G. BROWNING (جن سے ڈاکٹر فرحان نظامی کا خاص ربط و تعلق رہا ہے) پیش پیش ہیں، ڈاکٹر براؤننگ کی شدید خواہش ہے کہ آپ اس کار خیر میں شریک ہوں، اس کی تاسیس اور اس کے مقاصد و دستور العمل کی ترتیب میں مدد دیں، اور "اسلام و مغرب" کے عنوان پر مقالہ بھی پڑھیں۔

یہاں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی حرج نہیں کہ سالہا سال سے میری یہ تمنا تھی، اور کبھی کبھی اس کے لئے دعا بھی کرتا تھا کہ کبھی کوئی ایسا موقعہ آئے کہ مغرب کے ممتاز دانشور کہیں مجتمع ہوں اور مجھے ان کے سامنے مغربی تہذیب، فلسفۂ زندگی، اور عالم انسانی کی اس فکری، تہذیبی اور اخلاقی قیادت کی ناکامی پر جو تقدیر سے ان کے ہاتھ میں آگئی ہے، آزادانہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ ملے اور میں ان کے سامنے وہ حقائق رکھ سکوں جن کے سننے کی نوبت ان کو سالہا سال نہیں آتی اور ان کا احساس برتری ان پر غور کرنے کا موقعہ نہیں دیتا، مجھے من جانب اللہ اس تقریب کے پیدا ہو جانے میں اپنی اس آرزو کی تکمیل نظر آئی، اور اس خوشی نے اس کے محرکات و دواعی کی تفصیلی جانچ پڑتال، اور پچھلے تجربوں کی روشنی میں ان اداروں کے غلط استعمال کے

---

[1] پروفیسر خلیق احمد صاحب کے صاحبزادہ ڈاکٹر فرحان احمد نظامی جو اس وقت یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل میں مشغول تھے، اس کے خاص محرک اور اس کے لئے ساعی تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

بعید امکانات کا ناقدانہ جائزہ لینے کی مہلت نہیں دی کہ بعض اوقات اس طرح کی دور اندیشی اور مصلحت بینی ایسے اقدام اور فیصلہ سے مانع آتی ہے، جو کبھی بڑے خیر کا سبب بن جاتا ہے، غالباً اقبال نے ایسے ہی موقعوں کے لئے کہا ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

میں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور مقررہ تاریخوں میں جن میں میرے لئے پہونچنا مشکل تھا، تھوڑی سی تبدیلی چاہی، ڈاکٹر براؤننگ نے اس کو قبول کر لیا۔ ان کا اس کے شکریہ میں بڑا تشکر آمیز خط آیا جس میں انھوں نے میری منظوری، اور سفر کی آمادگی کو بڑی اہمیت دی، اور میری جن تصنیفات اور تحریروں سے جن پر ان کی نظر پڑی تھی، اپنے تاثر کا اظہار کیا، میں نے اس کا بھی اشارہ کر دیا تھا کہ میں جس مسلک، اصول زندگی اور علماء اور داعیان دین کے جس طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں مجلسوں اور دعوتوں میں اس کی رعایت کی جائے گی، انھوں نے میری سب شرطیں منظور کیں، میرے اور میرے رفیقِ سفر عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ ۲۰-۲۵ روز پہلے بھیج دیئے، میں نے "اسلام و مغرب" کے عنوان پر اردو میں مضمون تیار کیا[1]، اور روانگی سے ایک دو روز پہلے بڑی عجلت میں سید محی الدین صاحب نے (جو میری متعدد کتابوں کے مترجم ہیں) اس کا انگریزی میں ترجمہ تیار کر دیا۔

میں عزیزی مولوی محمد رابع ندوی کی معیت میں ۲۰ ر ۲۱ ر جولائی ۱۹۸۳ء کی

---

[1] مضمون کا عربی ترجمہ عزیزی سید سلمان ندوی کے قلم سے "الاسلام والغرب" کے عنوان سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں اور متعدد عربی اخبارات و مجلات میں شائع ہوا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

درمیانی شب میں لندن کے لئے روانہ ہوا، لندن کے ایتھروا ایرپورٹ پر ڈاکٹر براؤننگ عزیزی فرحان نظامی کے ساتھ اپنی کار لئے موجود تھے، وہ اسی وقت آکسفورڈ لے گئے، پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب مجھ سے پہلے ہی آکسفورڈ پہونچ گئے تھے، مرکزی دستور ساز مجلس میں شرکت کرنے کے لئے پاکستان کے مشہور ماہر قانون اے، کے بروہی صاحب (سابق وزیر امور مذہبی حکومت پاکستان، اور چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی) تشریف لائے تھے، عُمان میں قائم ہونے والی یونیورسٹی کا منصوبہ بنانے والے اور امین عام شیخ عامر علی عُمیر بھی مدعو تھے، اگلے دن ۲۲ جولائی کو ۱۰ بجے دن کو اکزامینشن ہال میں عمومی مجلس تھی، جس میں بیرونی مہمان اور مقامی فضلاء اور دانشور خصوصی طور پر مدعو تھے، افسوس ہے کہ یونیورسٹی میں تعطیلات کی وجہ سے، نیز وسیع پیمانہ پر انگلستان کے فضلاء اور دانشوروں کو دعوت دینے کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے (جس کا یورپ کی مصروف زندگی میں بہت کم رواج ہے) حاضرین کی وہ تعداد نہیں تھی، جس کی میں توقع کرتا تھا، پھر بھی ہال تقریباً بھر گیا تھا، جس میں ایک تعداد ہندوستانی احباب اور عرب ممالک کے سفارت خانوں میں کام کرنے والے اور لندن میں مقیم عربوں کی تھی، مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے انگلستان کے دوسرے اسلامی مرکزوں بالخصوص لیسٹر (LEICESTER) کے اسلامک فاؤنڈیشن کے ذمہ داروں اور خاص طور پر عزیز گرامی خرم جاہ مراد اور ان کے رفیق کار مناظر احسن صاحب کو اس کا ذمہ دار نہیں بنایا تھا کہ وہ اپنی طرف سے انگلستان کے اہل علم و فکر کو اس جلسہ کے لئے مدعو کریں، لیکن پھر بھی جتنے لوگ آ گئے تھے، وہ وہاں کے جلسوں کی روایات کے مطابق غنیمت تھے، میں نے پہلے ڈاکٹر براؤننگ کی خواہش اور فرمائش اور عرب حاضرین کی رعایت سے عربی میں

www.abulhasanalinadwi.org

خطاب کیا پھر انگریزی میں چند لفظ کہہ کر ڈاکٹر فرحان نظامی کو اپنا وہ مضمون سنانے کی دعوت دی، جو میں نے اس موقع کے لئے تیار کیا تھا، اس مضمون کا صرف ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"حضرات! ایک ایسے نازک مرحلہ میں کہ ایک ملک کی قسمت ہی نہیں، انسانی تہذیب زوال و فنا کے خطرہ سے دوچار ہو، معتدل و محتاط کوششوں اور متوسط سطح کے اصلاحی و تعلیمی کام کرنے والوں سے کام نہیں چل سکتا، معتدل و پُرسکون (NORMAL) حالات میں ان کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن ایسے غیر معتدل حالات میں کہ انسانیت موت و حیات کے دوراہے پر جا کر کھڑی ہو گئی ہے، اعلیٰ درجہ کی اخلاقی جرأت، قربانی، خطر پسندی اور مہم جوئی اور "عبقری" (GENIUS) انسانوں کی ضرورت ہے، اور انھیں لوگوں نے ہر دور میں تہذیب انسانی کو موت کے منہ سے نکال لیا ہے، آپ مجھے معاف کریں، وہ مغرب جس نے ماضی میں علوم عمرانیہ SOCIAL SCIENCES سائنس و صنعت اور سیاست و نظم حکومت میں بڑی قدآور شخصیتیں پیدا کیں، جنھوں نے اپنی کاوش و کوشش سے دنیا کا نقشہ بدل دیا، اور ساری دنیا نے ان کی برتری تسلیم کرلی، اور ان کی محنتوں اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا ضروری سمجھا، اس مغرب کی فضا پر عرصہ سے جمود طاری ہے، وہاں اب تہذیب و معاشرۂ انسانی کی نئی قیادت کے لئے اور سائنس اور ٹکنالوجی کا رُخ تخریب سے تعمیر کی طرف موڑنے اور ضبط نفس کی قوت پیدا کرنے، معاشرہ کو بے نظمی بلکہ نبرد آزمائی سے بچانے کے لئے اور حریف طاقتوں اور متحارب کیمپوں

www.abulhasanalinadwi.org

میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے جن انقلابی شخصیتوں اور "حسنِ ادائے قلندرانہ"
اور "جرأت پیمبرانہ" کی ضرورت ہے، اس سے مغرب عرصہ سے خالی ہے
آج سے پون صدی پہلے مغربی علوم کے فاضل اور مغرب میں طویل قیام
کرنے والے مفکر اقبالؒ نے مغربی تہذیب اور ماحول کے متعلق کہا تھا کہ

یاد ایامے کہ بودم در خمستانِ فرنگ — جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل — عقل ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بے تابانہ نیست
رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست[1]

اقبالؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مغرب میں خدا کی معرفت کے اسباب اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں لیکن کوئی ایسا با توفیق انسان نہیں، جو آسمانی تعلیمات سے فیضان و عرفان حاصل کرکے "شانِ کلیمی" کے ساتھ دعوتِ الی اللہ اور خلق کی ہدایت کا کام انجام دے، یہاں مادیت کا طوفان اور "أنا أحيي وأميت" (میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں) کے مدعی موجود ہیں، لیکن ابراہیم خلیل اللہؑ کا سچا پیرو نہیں جو اس کے ماننے سے صاف انکار کر دے، اور اعلان کرے کہ "رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ" (میرا پروردگار ہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے) پھر امتحان کی آگ میں بے محابا کود پڑے اور اس کو گل و گلزار بنا دے۔

یہاں کی فضا جو چمنیوں کے دھویں اور معاشی سرگرمی سے گرم

---

[1] پیام مشرق ص۲۴۵

www.abulhasanalinadwi.org

معلوم ہوتی ہے، حقیقتاً ایسی یخ بستہ ہے، جس میں سوزِ دل اور آہِ بیتاب ناپید ہے، یہاں کی ذہانت دولتِ عشق کی دشمن اور متاعِ قلب کی رہزن ہے، اس میخانہ کا رند بھی اگر مستی میں گرتا ہے تو پہلے سے اس کا حساب لگا لیتا ہے، اور اس کے نتائج کو سوچ لیتا ہے، یہ وہ لغزشِ مستانہ نہیں جس نے بارہا عہدِ قدیم کے عقلاء و حکماء کو اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنے اور سرمستِ خواب دنیا کو چونکا دینے کا کام کیا، یہ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت اور عقل و خرد کے پہرہ کے درمیان ایک اقدام ہے، جس سے رفتارِ زمانہ اور فضائے میخانہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے[1]

یہاں پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میزبانوں نے (جو سب مغربی اور مسیحی تھے) کھانوں اور اجتماعات میں اس کا پورا اہتمام رکھا کہ کوئی چیز اسلام کی تعلیمات اور اس طبقہ کے ذوق و مسلک کے خلاف جس سے میرا تعلق تھا، نہ ہو، یہ تقریبات ان بہت سی تقریبات سے زیادہ شائستہ، سنجیدہ اور خلافِ اسلام عناصر سے پاک تھی، جو ترقی یافتہ PROGRESSIVE مسلمان بہت سے مسلم ممالک میں منعقد کرتے ہیں۔

۲۳، ۲۴ر جولائی کو اس زیرِ تجویز اسلامی مرکز کے بارے میں بنیادی باتیں طے کی گئیں، اور اس کے مقاصد و ضوابط پر مشورہ ہوا، یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر فرحان نظامی اس کے پہلے ڈائرکٹر اور ڈاکٹر براؤننگ اس کے پہلے رجسٹرار ہوں گے، دستور کو

---

[1] یہ مقالہ اردو، عربی، انگریزی تینوں زبانوں میں اسی نام سے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

قطعی و آخری شکل دینے کے لئے پھر مجلس بلائی جائے گی، یہ بھی طے ہوا کہ اس کے ارکان میں ہمیشہ مسلمان فضلاء کی اکثریت ہوگی، تاکہ اس کا اسلامی مزاج برقرار رہے، اور وہ کسی غلط مقصد یا گروہ کا آلۂ کار نہ بننے پائے۔

اس تقریب سے فراغت کے بعد مزید چھ دن انگلستان میں قیام رہا، جس کے دوران ہم نے (MIDLAND) کے اہم اسلامی سنٹر دیکھے، اور اہم مساجد، مشہور تبلیغی مراکز اور مسلمانوں کی بڑی آبادیوں کے قصبات کا دورہ کیا، لیسسٹر (LEICESTER) کے اسلامک فاونڈیشن کا ذرا تفصیل سے معائنہ کیا، مسلمانوں کے سامنے خطابات کا مشترک موضوع، برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داری، صحیح طریق عمل اور خطرات و فوائد کی نشان دہی تھی، ۳۱ جولائی کو پان امریکن کے طیارہ سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔

امارات و کویت کا سفر

امارات عربیہ (جو سات امارتوں یا ریاستوں پر مشتمل ہیں، اور جن کا مرکز ابوظبی ہے) کی ایک محبوب و محترم شخصیت شیخ عبداللہ العلی المحمود تھے، جن کا ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ (۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء) کو انتقال ہوا، میں بلاد عربیہ کے سفر میں جن چند شخصیتوں کے اخلاص، اسلامی درد، دینی حمیت اور مسلمانوں کے مسائل اور اداروں سے دلچسپی اور ہمدردی سے متاثر ہوا، ان میں شارقہ کے شیخ عبداللہ العلی المحمود کا خاص درجہ تھا، جو شارقہ کے مدیر اوقاف بھی رہ چکے تھے، اور آخر میں وہاں کے مرکز "الدعوة الاسلامية" کے ذمہ دار اور روح رواں تھے، حاکم شارقہ شیخ سلطان بن محمد القاسمی ان کو اپنے شیخ اور

www.abulhasanalinadwi.org

استاد کی طرح مانتے تھے، اور وہ ان کے سب سے بڑے دینی مشیر تھے، مجھے ان کی جس صفت نے خاص طور پر متاثر کیا وہ ان کی ایمان و احتساب (اجروثواب کے شوق اور رضائے الٰہی کی نیت سے کام کرنے) کا مزاج تھا، وہ کئی بار ہندوستان اور خود لکھنؤ آچکے تھے، اور اس ملک کی دینی جماعتوں، اداروں اور دینی و دعوتی مساعی سے خوب واقف تھے، میری حقیر ذات اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں سے ان کا خاص ربط تھا، رابطۂ عالم اسلامی کے جلسے ہوں، یا قطر کی سیرت کانفرنس یا دوسرے مقامات کے اجتماعات، وہ ہر موقعہ پر میرے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے تھے، اور بالعموم نماز پڑھنے کے لئے بھی ہوٹل کے اسی کمرہ میں آتے تھے، جہاں میرا قیام ہوتا تھا، ان کے انتقال سے نہ صرف شارقہ بلکہ پورے خلیج کے علاقہ میں ایک بڑا دینی و علمی خلا پیدا ہو گیا" رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ۔

ان کے انتقال پر ان کے سعادت مند فرزندوں نے جن میں ان کے لائق اور دیندار فرزند ڈاکٹر سالم عبداللہ پیش پیش تھے، یہ طے کیا کہ ان کی یادگار میں مرحوم کے ذاتی کتب خانہ کو (جو خود کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا) عمومی کتب خانہ (پبلک لائبریری) میں منتقل کر دیں، جس میں اسلامیات کا عنصر غالب ہو، اور جو شارقہ کا سب سے بڑا اسلامی دارالمطالعہ بن جائے، انھوں نے اس تعلق اور خصوصی رابطہ کی بناء پر جو میرے اور مرحوم کے درمیان تھا، اور جس سے ان کے فرزند و احباب خوب واقف تھے، مجھ سے خواہش کی کہ میں اس مکتبہ کے افتتاحی جلسہ میں شرکت کروں جس کی وہ اہتمام کے ساتھ تقریب منانا چاہتے ہیں، میں نے اپنی مصروفیتوں اور مسلسل سفروں کی وجہ سے معذرت کرنی چاہی اور لکھا کہ وہ اس تقریب کو میری وجہ سے مؤخر نہ کریں، اور اس کارِ خیر کو انجام دے دیں، لیکن انھوں نے لکھا کہ خواہ ایک سال لگ جائے لیکن تمہارے بغیر یہ تقریب انجام

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں پا سکے گی، میں نے اس موقعہ پر ہتھیار ڈال دیئے، اور ان کی دعوت منظور کر لی۔

اس تقریب کو ۱۶ / نومبر ۱۹۸۳ء کو منعقد ہونا تھا، میں عزیزی محمد رابع ندوی کی معیت میں روانہ ہوا، ڈاکٹر سالم نے اس کے لئے بڑے انتظامات کئے تھے، تقریب میں حاکم شارقہ شیخ سلطان بن محمد القاسمی، حاکم عجمان شیخ حمید بن راشد النعیمی اور امارات کے متعدد وزراء اور اعیان نے شرکت کی، حسن اتفاق کہ رابطۂ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف بھی جو ان دنوں امارات کے دورہ پر آئے ہوئے تھے، اس تقریب میں شریک ہو گئے۔

میں نے اس موقعہ پر ایک تقریر کی جس میں دنیا کی سب سے عظیم عالمی علمی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے، جو ایک نبی اُمیؐ کی ایک اُمی اُمت، اور ایک ناخواندہ اور پسماندہ ملک (جزیرۃ العرب) میں بعثت محمدیؐ کے فیض و برکت سے پیدا ہوئی، اور جس نے نہ صرف علم و قلم کو حیات تازہ بخشی، اور ان کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم کیا، بلکہ اس کو بامقصد، باعث ہدایت اور ذریعہ نجات بنا دیا، پھر کتب خانوں کے قیام کے ساتھ مسلمانوں کے شغف کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ابتدائی صدیوں میں ذاتی و انفرادی کتب خانے بھی کتنی وسعت اختیار کر گئے تھے، اور اہل علم کو یاد دلایا کہ "دیوان حماسہ" کی جیسی زندہ جاوید کتاب جس سے عربی ادبیات کی تعلیم بلکہ مدارس کا نصاب تعلیم کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا، مشہور شاعر ابو تمام کے قلم سے امیر ابو الوفاء کے ذاتی کتب خانہ میں اس وقت مرتب ہوئی، جب ابو تمام کو غیر معمولی برف باری کی وجہ سے ایک سفر میں اضطراری طور پر وہاں کئی روز ٹھہرنا پڑا، پھر میں نے شیخ عبد اللہ العلی المحمود کے محاسن و خصوصیات پر روشنی ڈالی اور ان کے فرزندان گرامی کے اس اقدام کی تحسین کی

جو انھوں نے اپنے والد محترم کی مناسب یادگار قائم کرنے کے سلسلہ میں اختیار کیا۔

امارات خلیج کے اس ہفتہ بھر کے قیام میں کئی جلسے اور تقریریں ہوئیں، ان میں ایک اہم تقریر امارات متحدہ کی وفاقی یونیورسٹی جامعۃ العین کے وسیع ہال میں ۱۵ صفر ۱۴۰۴ھ (۱۹ نومبر ۱۹۸۳ء) کو ہوئی تھی، جس کا عنوان تھا "أزمة هذا العصر الحقيقية" (عہد حاضر کا حقیقی خلا اور ضرورت) جس میں بتایا گیا کہ عہد حاضر کا سب سے بڑا خلا ایک ایسے مثالی اسلامی معاشرہ کا فقدان ہے، جو ملک اور حکومت کی سطح پر اسلامی زندگی اور اسلامی تعلیمات کا نمونہ پیش کرے اور ان کے قابل عمل، انسانیت کے لئے بابرکت، اور انسانی مسائل کے کامیاب حل ہونے کا ثبوت دے، یہ وہ خلا تھا جس کو چھٹی صدی مسیحی میں ایک پوری امت اور عالمگیر تحریک و دعوت کی سطح پر امت عربیہ نے (اسلام قبول کرکے اور اس کو عمل میں لاکر) پُر کیا تھا، اور اس سے حیات انسانی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا، یہ خلا بہتر سے بہتر افراد اور مختصر و محدود معاشرے پُر نہیں کرسکتے، خواہ وہ اپنے ذاتی صلاح اور حسنِ عمل میں کیسے ہی بڑھے ہوئے ہوں، یہ کام ایک پورے ملک، آزاد حکومت، اور ایک پوری قوم کی سطح پر ہی ہوسکتا ہے، اور آج کی مایوس و پامال انسانیت، امت عربیہ اور ممالک اسلامیہ سے اسی قائدانہ کردار اور عملی نمونہ کا مطالبہ کررہی ہے، یہی وقت حاضر کی سب سے بڑی ضرورت اور انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے، دیکھیں عرب اس کام کے لئے اٹھتے ہیں یا نہیں؟ اور دوبارہ دنیا کی امامت و قیادت کرتے ہیں یا نہیں؟

ایک تقریر اسی جامعۃ الامارات کے کلیۃ البنات GIRLS COLLEGE میں "خواتین کے مسلم معاشرہ میں خصوصی کردار" کے موضوع پر ہوئی جس میں بتایا گیا کہ

www.abulhasanalinadwi.org

صدر اول کے مسلمانوں کے رومی وایرانی تہذیب کے سانچہ میں تحلیل نہ ہوجانے اور اپنا اسلامی عربی تمدن و معاشرت قائم رکھنے میں اس بات کو خاص طور پر دخل تھا کہ طبقۂ نسواں نے اپنے ایمانی جذبہ اور اسلامی خصائص کی حفاظت اور بیرونی تہذیبوں کے اثرات کے مقابلہ کا ثبوت دیا، اور آج اسی گوشہ سے مغربی تہذیب کی یلغار آرہی ہے اور مسلم معاشرہ کو بہائے لئے جارہی ہے۔

ایک تقریر ابوظبی میں مسجد سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ میں "إلى الاسلام من جديد" (اسلام کی طرف بازگشت) کے موضوع پر ایک تقریر شارقہ میں مسجد سیدنا عمر بن الخطابؓ میں قرآن مجید کی آیت "فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُو بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ"[1] کی تفسیر میں ہوئی، جس میں بتایا گیا کہ ہر عہد کی بڑی ضرورت ان اہلِ ضمیر اہلِ ایمان، اہلِ ایثار اور جری اور دیانت دار لوگوں کی موجودگی ہے، جو اپنے زمانہ کے بگاڑ، اخلاقی زوال، نفس پرستی، ابن الوقتی اور تخریبی کوششوں کے خلاف آواز بلند کریں، اس سیلاب کے خلاف پشتہ باندھیں اور آمادۂ فساد و افساد عنصر سے پنجہ آزمائی کریں سب سے زیادہ یہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے، جس کی ہر زمانہ میں یہ ذمہ داری قرار دی گئی ہے، اور بقول اقبال۔ ع

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

شارقہ اور دبئی سے ۲۳ نومبر کو کویت کا سفر ہوا، کئی ہفتے پہلے وہاں کی

---

[1] سورۂ ہود ۔ ۱۱۶

www.abulhasanalinadwi.org

وزارت اعلام MINISTRY OF INFORMATION کی ثقافت وفنون وآداب کی مجلسِ وطنی کی طرف سے پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریب سے مجھے "اسلام اور انسانی تمدن" پر تقریر کرنے کی دعوت ملی تھی، میں نے چاہا کہ ایک ہی سفر میں یہ سب کام ہو جائیں، مجلسِ وطنی نے کویت یونیورسٹی کے کلیۃ العلوم (SCIENCE COLLEGE) کے میدان میں جلسہ کا انتظام کیا، اور وسیع پیمانہ پر دعوت نامے جاری کئے، ۱۸ر صفر ۱۴۰۲ھ (۲۳ر نومبر ۱۹۸۳ء) کو بعد مغرب وہاں اس عنوان پر میں نے اپنا عربی کا وہ مقالہ پڑھا جو "الإسلام والحضارة الإنسانية" کے عنوان سے عربی میں چھپ چکا ہے، اس میں میں نے اجمالی طور پر اسلام کے ان اثرات کا ذکر کیا، جو پورے انسانی تمدن بلکہ انسانی زندگی پر پڑے ہیں، اور اس کا ایسا جزء بن گئے ہیں، جس کو کسی کیمیاوی تحلیل سے بھی الگ نہیں کیا جا سکتا، اور انھوں نے تاریخ انسانی میں انقلابی کردار ادا کیا ہے، ان میں سے میں نے دس انقلاب انگیز اثرات کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا،[1] اور اس سلسلہ میں مغربی فضلاء و مؤرخین اور ہندوستان کے متعدد منصف مصنفین و محققین کے اعترافات کو نقل کیا، پھر بتایا کہ اب امت اسلامیہ کو انسانی تمدن و معاشرہ پر اثر انداز ہونے کے لئے اپنے اندر کیا تبدیلیاں اور کیا صفات پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی، اور اس کو موجودہ تمدن و ترقیات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

کویت میں ایک اہم تقریر "عالم اسلامی کی موجودہ صورتِ حال" کے موضوع پر وہاں کی کارگزار اور موقر انجمن جمعية الإصلاح الإجتماعي کے میدان میں ہوئی،

---

[1] ملاحظہ ہو مضمون "الإسلام والحضارة الإنسانية"

www.abulhasanalinadwi.org

جو حاضرین سے بھرا ہوا تھا، یہ تقریر ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء کو ہوئی، اس میں میں نے موجودہ عالم اسلام کا واقعی اور حقیقی نقشہ پوری صفائی کے ساتھ سامنے رکھا اور اس کی موجودہ صورتِ حال، اس کی سیاسی بے وزنی، حمیت اسلامی کی کمی، خود اس کے جسم کے بعض حصوں (مسلمانوں اور عربوں) پر ٹوٹنے والے مصائب کے بارے میں اس کی بے حسی[1]، مسلم ممالک اور مسلمان حکومتوں کے شہروں کی پُر عشرت اور آلودۂ غفلت زندگی، مسلمانوں میں نقصان نہ پہونچانے کی صلاحیت کا فقدان جس سے بڑی قومیں اور حکومتیں ڈریں، جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کا فقدان جو مسلمانوں کی طاقت کا بڑا سرچشمہ تھا، اور صاحبِ اقتدار طبقہ اور اہلِ حکومت اور مسلم عوام کی وہ محاذ آرائی جس نے حاکم طبقہ کی ساری توانائیوں کو مسلم عوام کے شعلۂ ایمان کے سرد کرنے اور ان کو بے حس بنانے پر مرکوز کر دیا ہے، اور بیرونی دشمنوں سے ان کی توجہ مستقل طور پر ہٹا دی ہے، نیز اہل قلوب اور اس حقانی و ربانی طبقہ کا فقدان جس نے ہمیشہ یخ بستہ مسلم معاشرہ کے ایمان میں گرمی، دلوں میں نرمی، اور آنکھوں میں نمی پیدا کی اور اس کو دولت وعشرت کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے سے بچایا اور فکرِ آخرت کو زندہ رکھا، یہ وہ سب اسباب ہیں جن کی وجہ سے بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ "عالم اسلام فنّ عروض کی بحر کی طرح ہے کہ نام اس کا "بحر" ہے مگر پانی کا ایک قطرہ نہیں۔"

مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگرچہ اس دریا کی سطح ساکن ہے اور

---

[1] اسی زمانہ میں بیروت میں مسلمان عرب اور فلسطینی، یہودیوں اور فلانجسٹ عیسائیوں کے مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور عرب حکومتیں خاموش تھیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس پر عرصے سے ایک طرح کا جمود و تعطّل طاری ہے لیکن اس میں طوفان لانے اور اس کی تہ سے زندگی کے موتی نکالنے کے وہ قوی اسباب و ذرائع موجود ہیں جو کسی دوسری ملّت یا قوم اور ملک کے پاس نہیں، اسی میں سے بڑے سے بڑے پُر آشوب زمانہ اور مایوس کن حالات میں وہ علمائے ربّانی، اہلِ قلوب اور مجدّد و مصلح پیدا ہوتے رہے، جو۔ ع

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

کا مصداق تھے، اور میں نے اپنی کتاب "رجال الفکر والدعوۃ فی الإسلام" (تاریخ دعوت و عزیمت) اور "ربّانیۃٌ لا رھبانیۃ"[1] (اردو میں "تزکیہ و احسان یا تصوّف و سلوک") میں ان کا اور ان کے بہت سے تجدیدی و تربیتی کاموں کا تعارف کرایا ہے، جنھوں نے معاشرہ کو نئی ایمانی زندگی بخشی، میدان جہاد آراستہ کیا، اور زوال آمادہ معاشرہ میں ایک نئی روح پیدا کر دی، اب بھی اس دریا سے کسی وقت بھی وہ طوفانی موجیں اٹھ سکتی ہیں، جو دنیا کو ہلا کر رکھ دیں۔ بقول اقبال ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

یہ تقریر بہت صاف اور کھری تھی جس میں سامعین کی خوشی ناخوشی، تاثر اور عدم تاثر سے آنکھیں بند کر کے حقائق سامنے رکھ دیئے گئے تھے تاکہ اس پر

---

[1] مصنف کی عربی کتاب جس میں (اصطلاحات و رسوم کی پابندی کے بغیر) اس حقیقت کے حصول کی کوشش کا مقصود و مطلوب ہونا ثابت کیا گیا ہے، جس کو قرآن میں تزکیہ کے لفظ سے (وَيُزَكِّيهِمْ) اور حدیث و سنّت میں "احسان" کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اہلِ دانش و بینش غور کریں، اور ان غلط فہمیوں اور خوش گمانیوں کا پردہ چاک ہو، جن میں اچھے اچھے اہلِ علم، اہلِ قلم اور دین کے داعی گرفتار ہیں۔

یہ سفر حرمین شریفین پر ختم ہوا، اور وہاں سے عمرہ اور مدینہ طیبہ کی حاضری کے بعد ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو ہندوستان واپسی ہوئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

INDEX

اشاریہ

(کاروانِ زندگی حصۂ دوم)

مرتبہ

محمد غیاث الدین ندوی

www.abulhasanalinadwi.org

شخصیات

(الف)

(سیدنا حضرت) آدم علیہ السلام ۳۶۰
۳۶۲، ۳۶۳
(سیدنا حضرت) ابراہیم علیہ السلام ۱۷، ۲۰
۳۷۹
(سیدنا حضرت) ابوبکر صدیقؓ ۱۲۱، ۲۵۷
(سیدنا حضرت) ابوذر غفاریؓ ۱۵۷
(مولانا سید) ابوالاعلیٰ مودودی ۲۶۸، ۲۹۴
(شیخ) ابراہیم بن محمد ۳۰۴
(سید) ابراہیم حسنی ۲۶۸
(الحاج) ابراہیم سلیمان سیٹھ ۱۹۳، ۳۲۰
ابن بطوطہ ۳۶۳
(علامہ حافظ) ابن قیم ۱۸
ابوبکر فلیائی ۲۵۶
(مولانا سید) ابوبکر حسنی ایم۔ اے ۲۱۳
۳۶۸
(استاد) ابوبکر القادری ۲۳۴
ابوتمام (شاعر) ۳۸۳
ابوالحسن التہامی (شاعر) ۳۴۷
ابوزید سیرافی ۳۶۳
(امام) ابوطالب مکی ۳۶۲

(مولانا) ابوالعرفان خاں ندوی ۲۱۰
(مولانا) ابوالکلام آزاد ۲۲، ۱۲۹، ۲۱۹
(مولانا) ابواللیث ندوی ۹۵، ۲۲۷، ۲۲۸
(امیر) ابوالوفاء ۳۸۳
(مولانا) ابوالوفاء افغانی حیدرآبادی ۵۳
(مولوی) اجمل اصلاحی ندوی ۱۵۶
(ڈاکٹر) احمد امین ۲۷، ۴۳
(استاذ) احمد حسن الزیّات ۶۹، ۷۰
(سید) احمد الحسنی ۲۶۸
(نواب حافظ سر) احمد سعید خاں (نواب چھتاری)
۱۹۸
(حضرت سید) احمد شہید ۱۸، ۸۸، ۱۳۶
۲۶۰، ۲۶۸، ۲۷۰، ۲۷۳، ۳۱۰
(قاضی شیخ) احمد عبدالعزیز آل مبارک ۱۹۱
(مولانا سید) احمد عروج قادری ۱۹
(حضرت مولانا) احمد علی لاہوری ۲۶۷
(استاذ) احمد لطفی السید باشا ۸۲
(استاد) احمد محمد جمال ۱۴۵
(ڈاکٹر) احمد مطیع صدیقی ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۰
(سیدی) ادریس حسن ثانی ۲۳۴
(حاجی) ارشد ۵۸

www.abulhasanalinadwi.org

(مولوی محمد) اسحاق جلیس ندوی ۱۲۴، ۱۲۵، ۲۱۱، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۷۴
(سید) اسحاق حسنی ۲۶۸
(سید) اسحاق مرحوم ۲۶۸
(سید) اسد حسین ایڈوکیٹ ۵۱
(ڈاکٹر) اسرار احمد ۲۶۸
(مولانا سید) اسعد مدنی ۲۵۶
(حضرت شاہ محمد) اسماعیل شہید ۳۱۰
(الحاج) اسماعیل منصوری ۲۵۲، ۳۰۶
(حکیم الامت مولانا) اشرف علی تھانویؒ ۲۲، ۲۶۷، ۳۰۲، ۳۱۰
اشرف علی لکھنوی ۶۲
اشفاق شیخ ۵۸
(سید) اصغر حسین ایڈوکیٹ نگرامی ۵۱
(سید) اطہر حسین آئی، اے، ایس ۱۸۳
(قاضی) افضل بیابانی ۱۴۹، ۲۵۰، ۳۶۶
(جسٹس) افضل چیمہ ۲۶۶
(علامہ) اقبال ۱۰، ۱۲، ۲۸، ۳۶، ۴۱، ۴۳، ۷۴، ۷۷، ۸۸، ۹۰، ۹۴، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۲۷، ۱۵۰، ۱۵۸، ۲۵۷، ۲۶۳، ۲۹۲-۲۹۰، ۳۴۲، ۳۳۸، ۳۶۸، ۳۷۰، ۳۷۶، ۳۷۹، ۳۸۵، ۳۸۸
(مولانا) اقبال سہیل ۶۲
اقتدار علی خاں انجینیر ۱۸۳
(میر) اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی ۵۴
(نواب میر) اکبر علی خاں ۳۶۹
(پروفیسر) آل احمد سرور ۳۳۵، ۳۳۹
(امیر) امان اللہ خاں ۱۴۹
(محترمہ) امۃ اللہ تسنیم ۱۹۶
امیر مینائی ۲۵۷
(مفتی سید) امین الحسینی ۴۶، ۵۶، ۸۲، ۱۶۰
(شریمتی) اندرا گاندھی ۲۰۱-۹، ۲۱۱-۱۵، ۲۲۶-۲۹، ۳۰۵، ۳۱۵
(مولانا) انعام الحسن کاندھلوی ۱۸۴
(جسٹس) انوار الحق ۲۵۹
(نواب فضیلت جنگ مولانا) انوار اللہ خاں ۵۲
(پروفیسر) انیس احمد ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۱
(شہنشاہ) اورنگ زیب ۳۷۴
(جسٹس) آئر ۲۰۵
اے، کے، بروہی ۲۵۶، ۳۷۷

ب پ

(امام احمد بن اسماعیل) بخاریؒ ۲۳۹
(مولانا) برہان الحق جبلپوری ۱۳۸
(پروفیسر) برہان الدین ربّانی ۱۵۱
(مولانا) برہان الدین سنبھلی ۳۵۷
(جسٹس) بشیر احمد سعید ۱۴۳
(شیخ) بلعمش حضرمی ۵۸
(ڈاکٹر) بی، بی مصرا ۱۲۰

www.abulhasanalinadwi.org

(گورنر) بی۔ کے نہرو ٣٣٥، ٣٣٦

(بابو) پرشوتم داس ٹنڈن ٦١

BHAI VAID ٣٢٥، ٣٢٧

ت ٹ ث

(علامہ) تقی الدین احمد المقریزی ٢٧

(استاذ) تقی الدین الصلح ١٦٠

(ڈاکٹر شیخ) تقی الدین الہلالی ٧٦

٢٣٣، ٢٣٤، ٢٩٨

(مسٹر) ٹنکرو ٣٢١

(سلطان شہید) ٹیپو ٩٣

T. W. ADARNO ٢٨٠

(مولانا) ثناء اللہ امرتسری ٢٢

ج چ

(حضرت) جعفر طیار رض ١٦٨

(میر) جعفر علی بنگلوری ٩٤

(ڈاکٹر) جمال احمد امین آبادی ٩٥

(کرنل) جمال عبدالناصر ٧٢-٦٤، ٧٥

(ایڈوکیٹ) جمیل الدین خاں ٣٧٢

جگر مرادآبادی ٦١، ١٩٧

(جسٹس) جگ موہن لال سنہا ٢٠٣، ٢٠٤

(پنڈت) جواہر لال نہرو ١٢٩، ٣٢٤

جہیان العتیبی ٢٨٥

(پنڈت) جے پرکاش نرائن ٢٠٥، ٢٠٦

٣٢٤

JOHN WINTANLEY ٥٨

(چودھری) چرن سنگھ ٢٢٤

ح

(سیدنا حضرت) حسن رض ٢٦٢

حافظ الاسد ١٦٠

حافظ شیرازی ١٣٦، ١٥٤

(خواجہ الطاف حسین) حالی ١٦٣، ٣٦٠

(مولانا) حبیب الرحمن اعظمی ٥٣

(نواب صدر یار جنگ مولانا) حبیب الرحمن خاں شروانی ٢٢، ٣٣٦

(شہزادہ) حسن بن طلال ١٣

(ملک) حسن ثانی ٢٣٣، ٢٣٤، ٢٣٧

(شیخ) حسن حبنکہ ١٩٢

(مفتی شیخ) حسن خالد ١٥٩

(شیخ) حسن عبداللہ آل الشیخ ٣٩، ٤١، ٤٤

٢٩٥، ٣٠٤

(سید) حسن عسکری طارق ٢٩، ١٢٥-٢٥١

(شاہ) حسین ١٦٥، ٢٨٣

(حضرت مولانا سید) حسین احمد مدنی ٢٢

٣٠١، ٣١٠

(مولانا) حفظ الرحمن سیوہاروی ٣٠١

(شیخ) حسین بن راشد النعیمی ٣٨٣

حنیفہ محمد حنیف ١٢٥

(حضرت مولانا) حیدر حسن خاں ٹونکی

١٢٦

H.B. STALLARD ٥٨

www.abulhasanalinadwi.org

(خ)

(سیدنا حضرت) خالد بن ولیدؓ ۱۶۸، ۲۶۱

(ملک) خالد بن عبدالعزیز ۲۷۵، ۲۸۲

۲۹۴، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۴

خان عبدالغفار خاں ۲۱۱

خوتم جاہ مراد ۲۷۷

(سلطان) خلیفہ بن حمد آل ثانی ۲۸۹

(پروفیسر) خلیق احمد نظامی ۲۷۴، ۳۷۵

۳۷۷

(حضرت مولانا) خلیل احمد سہارنپوری

۲۲، ۳۰۲

(شیخ) خلیل بن محمد یمانی ۱۳، ۲۲

(مولوی) خلیل الرحمٰن سجاد ندوی ۲۵۵

۳۰۵

(پروفیسر) خورشید احمد ۲۳۹

(حاجی) خیرات علی (حافظ خیراتی) ۶۳

(د) (ڈ)

داؤ جی گپتا ۳۲۷

دیانند گپتا ۳۲۲

(ڈاکٹر) دی کپور ۳۲۷

دیو کانت بروا ۲۱۴

DAN ADAMS ۱۳۲، ۶۷، ۷۷، ۸۰

(DR) D. G. BROWNING ۳۷۵

(ذ)

(ڈاکٹر) ذاکر حسین خاں ۱۷۳، ۳۲۴

ذوالفقار علی بھٹو ۱۲۹، ۲۶۷، ۳۴۳

(شیخ) ذوالفقار اللہ ۳۲۰

(ر)

راجہ جی ۱۰۳

راج نرائن ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۲۶

(حضرت مولانا) رحمۃ اللہ مہاجر مکی ۲۹۶

(پروفیسر) رشید احمد صدیقی ۹۲، ۱۸۷

(پروفیسر ڈاکٹر) رشدی ۲۵۶

(قاری سید) رشید الحسن ۲۵۸

(مولوی) رضوان ۵۴

رفیق وفادجانی ۱۶۷

(مہاراجہ) رنجیت سنگھ ۲۶۰

(آیۃ اللہ) روح اللہ خمینی ۱۵۴، ۱۵۶

(مولانا) روم ۱۱، ۸۵

رنگین ۳۶۶

(ز)

(سیدنا حضرت) زید بن حارثہؓ ۱۶۸

(ڈاکٹر) زکریا بدّہی ۳۳۱

(ڈاکٹر) زین العابدین قدوائی ۶۲، ۶۳

(س)

(سیدنا حضرت) سعد بن ابی وقاصؓ ۳۸۵

(سیدنا حضرت) سلمان فارسیؓ ۱۵۷، ۳۸۵

(سید) سجاد حسین ۲۴۰، ۲۴۹

(ڈاکٹر) سالم عبداللہ ۳۸۲، ۳۸۳

(مولوی) سراج الحسن ۹۵

www.abulhasanalinadwi.org

(شیخ) سعدی ۱۴۶، ۱۵۴
(شیخ) سعدی یٰسین ۱۴۵، ۲۳۵
(امیر) سعود بن عبد العزیز ۲۷۵
(مولانا) سعید احمد اکبر آبادی ۱۹، ۱۸۴، ۳۱۲
(مولانا) سعید الرحمٰن ندوی ۵۶، ۱۶۹، ۱۹۵، ۳۶۹
(ڈاکٹر) سعید رمضان ۱۷، ۵۷
سکندر علی وجد ۳۷۴
(شیخ) سلطان بن محمد القاسمی ۳۸۱، ۳۸۳
سلیمان تاجر ۳۶۳
(مولوی سید) سلمان حسینی ندوی ۳۵۰، ۳۵۹، ۳۶۳، ۳۷۶
(علامہ سید) سلیمان ندوی ۲۲، ۵۱، ۱۷۵، ۱۸۵، ۳۳۵
(مولانا) سمیع الحق ۲۶۷
سمیع اللہ ۲۴۹
(حکیم) سنائی ۱۵۲
سنجے گاندھی ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۲۷، ۳۱۵
(پروفیسر) سوندھی ۳۲۷
(مولانا سید) سیاح الدین کاکاخیل ۲۶۶
سیدا دتھ ۲۰۵
(استاد) سید قطب ۲۷۳
سیدہ معصومہ ۱۵۴

(ش)

(پروفیسر) شاہد علی ایم اے ۱۹
شاہ الحمید ۳۶۴
شاہد علی صدیقی ۱۸۱
(علامہ) شبلی نعمانی ۱۳۹
(مولوی) شبیر ندوی سلطانپوری ۱۸۳
(میر) شرف الدین محروف روسی ۱۹۱
الشریف رضی ۳۷
(حاجی) شفیق الرحمٰن ایڈوکیٹ ۶۳
شفیع قریشی ۲۱۱، ۲۱۳
(مولوی) شمس تبریز خاں ۳۰
(شفاء الملک حکیم خواجہ) شمس الدین ۴۷
(سید) شہاب الدین ایم پی ۳۲۰
(مولانا) شہید اللہ ۳۵۸، ۳۶۲
شیخ الازہر دیکھئے عبد الحلیم محمود
شیخ الحدیث دیکھئے (حضرت مولانا) محمد زکریا
(ڈاکٹر) شے (SCHEIE) ۲۴۱، ۲۴۶، ۲۴۸-۵۱

(ص) (ض)

(سید) صابر علی ۵۳
(شیخ) صالح القزاز ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۷۶، ۲۳۳، ۲۹۶
(استاذ) صائب سلام ۱۶۰
(مولوی سید) صباح الدین عبد الرحمٰن ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۹۷، ۳۳۱، ۳۴۹

www.abulhasanalinadwi.org

(مولانا سید) صبغۃ اللہ بختیاری قاسمی ۵۳
(سید) صفوت علی خیرآبادی ۲۵۰
(سلطان) صلاح الدین ایوبی ۶۹
(جنرل) ضیاء الحق ۲۵۶، ۲۶۹
ضیاء عبداللہ ۲۵۲

ط ظ

(ڈاکٹر) طٰہٰ حسین ۷۳، ۸۲
(مولانا سید) طلحہ حسنی ایم، اے ۲۲، ۲۵
(مولانا) ظفر احمد انصاری ۲۳۹، ۲۶۶
(مولانا) ظفر اقبال ۲۶۷
(مولانا) ظفر علی خاں ۹۳

ع

(سیدنا حضرت) عمر بن الخطابؓ ۲۶، ۲۸۵
(سیدنا حضرت) علی مرتضیٰؓ ۱۵۵، ۱۵۶
(سیدنا حضرت) عمار بن یاسرؓ ۱۵۷
(سیدنا حضرت) عبداللہ بن رواحہؓ ۱۶۸
(شیخ) عامر علی عمیر ۳۷۷
(استاد) عبدالباسط بدر ۳۳۳
(مولانا) عبدالجلیل رائپوری ۲۶۹
(پروفیسر) عبدالحلیم ندوی ۲۶۸
(الاستاد الاکبر شیخ) عبدالحلیم محمود (شیخ الازہر)
۲۰، ۱۷۵، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۹۰، ۱۹۳
(مولانا) عبدالحمید ۵۳
(شیخ) عبدالحمید ابن بادیس ۳۵۲
عبدالحمید دلوائی ۱۳۷، ۱۳۸

(حضرت ڈاکٹر) عبدالحی عارفی ۲۶۷
(حضرت مولانا حکیم سید) عبدالحی حسنی ۸۷
(الحاج صوفی) عبدالرحمٰن ۲۵۲، ۳۰۶
(مولوی) عبدالرحمٰن ایم، پی ۲۴
(مولانا) عبدالرحمٰن مبارکپوری ۲۲
(ڈاکٹر) عبدالرحمٰن رافت الباشا ۳۳۱
(شیخ) عبدالرحمٰن شیبان ۳۵۲، ۳۵۵، ۳۵۶
عبدالرحمٰن کوندو ۳۴۴
(شیخ) عبدالرحمٰن الفارس ۱۹۱
(مولانا حکیم) عبدالرحیم اشرف ۲۶۶
(حضرت شاہ) عبدالرحیم رائپوری ۳۰۱
(سیدی) عبدالرحیم بن احمد علی البرعی ۳۵-۳۷
عبدالرسول سیاف ۱۵۱
عبدالرزاق رائے بریلوی ۱۸۲، ۲۱۲
۳۴۱
(استاذ) عبدالرزاق فیاض ۱۶۴
(شیخ) عبدالستار السید ۲۸۴
(ڈاکٹر) عبدالسلام انصاری ۲۵۰
(الحاج) عبدالسلام خاں ۶۲
(مولانا) عبدالسلام قدوائی ندوی ۱۹۰
۲۲۷، ۲۲۸
(حضرت مولانا) عبدالشکور فاروقی کاکوروی
۲۲
(شیخ) عبدالعزیز بن باز ۲۸۳، ۲۹۷
(سید) عبدالعزیز رفاعی ۳۴۰

www.abulhasanalinadwi.org

(مولانا) عبدالعزیز میمن ۲۶۹
(ڈاکٹر حکیم مولوی سید) عبدالعلی حسنی ۲۲، ۳۱
۶۰، ۲۷۱، ۳۵۹
(مولانا) عبدالغفار ندوی ۲۰۹
(شیخ) عبدالفتاح ابوغدّہ ۳۵۹
(حضرت سیدنا) عبدالقادر جیلانی ۱۶۳
(مولوی) عبدالقادر حیدرآبادی ۲۸
(حضرت مولانا) عبدالقادر رائپوری ۶۱، ۶۲
۲۵۳، ۲۶۹
(مولانا) عبدالکریم پارکھ ناگپوری ۳۲۰
(ڈاکٹر) عبدالکریم خطیب ۲۳۴
عبدالکریم قاسم ۱۶۳
(شیخ) عبداللہ ابراہیم الانصاری ۲۸۷
۲۸۸، ۲۹۲، ۳۳۱
(مولانا) عبیداللہ انور ۲۶۷
(استاد) عبداللہ باہبری ۱۵۹
(شیخ) عبداللہ بن جدعان ۱۱۴
(شیخ) عبداللہ بن حمید ۲۸۳
عبداللہ بھائی پٹنی ۳۶۹
(شیخ) عبداللہ بن زید المحمود ۲۸۹
(ملک) عبداللہ بن شریف حسین ۱۶۵
(ڈاکٹر) عبداللہ بن عبدالمحسن ترکی ۳۰۴
۳۰۵
(ڈاکٹر) عبداللہ چغتائی ۲۶۷
(مولوی سید) عبداللہ حسنی ندوی ۲۸۴، ۲۸۶
۲۸۷

(ڈاکٹر) عبداللہ زائد ۳۰۶
(مولوی) عبداللہ سورتی ۲۵۲
(مولانا ڈاکٹر) عبداللہ عباس ندوی ۵۸
۱۴۵، ۱۵۹، ۱۷۶، ۱۷۸، ۲۵۲، ۲۸۶
۲۹۵، ۲۹۶
(ڈاکٹر) عبداللہ العقیل ۳۰۶
(شیخ) عبداللہ العلی المحمود ۳۸۱، ۳۸۳
(ڈاکٹر) عبداللہ عمر نصیف ۳۸۳
(مولانا) عبدالماجد دریابادی ۵۱، ۱۷۵
۱۹۵، ۳۳۶
(سلطان) عبدالمجید ثانی ۲۹۰
(شیخ) عبدالمحسن بن عبّاد ۲۳۳، ۲۵۵
(ڈاکٹر شیخ) عبدالمنعم النمر ۳۰۶
(حاجی) عبدالواحد ایم، اے ۲۶۷
عبدالوحید کشمیری ۲۴۹
(مولانا حافظ) عبدالوحید ۲۶۹
(شیخ) عبدالوہاب حمودہ ۳۵۲
(شیخ) عبدالوہاب عبدالواسع ۲۸۴، ۲۸۵
(مولانا) عبیداللہ پائلی ۲۴
(مولانا) عبیداللہ سندھی ۲۲
(مولوی) عتیق الرحمٰن سنبھلی ۲۵۲
(مولانا مفتی) عتیق الرحمٰن عثمانی ۴۳، ۹۵
۱۰۷، ۲۵۶، ۳۱۲، ۳۲۰
(میر) عثمان علی خاں نظام دکن ۵۲
(مولوی) عرفان احمد خاں سہارنپوری ۲۳۹
۲۴۱، ۲۵۰

www.abulhasanalinadwi.org

(سید) عظمت اللہ قادری ۲۵۰
عظیم حسین ۷۲
(استاد) العقاد (عباس محمود) ۷۳
(علامہ) علال الفاسی ۲۳۶
(حضرت شاہ سید) علم اللہؒ ۱۸، ۴۹، ۵۱
(مولوی) علی آدم افریقی ۵۳
(حضرت) علی رضا ۱۵۴
(شیخ) علی طنطاوی ۳۶
(حضرت) عمر بن عبدالعزیزؒ ۱۲۱، ۲۶۲
(ملک) عنبر ۳۷۴

غ

(مرزا) غالب ۱۴۹، ۲۶۰، ۳۳۶
(حجۃ الاسلام امام) غزالیؒ ۱۸، ۱۵۴
(پروفیسر) غفور احمد ۲۵۹، ۲۶۱
(الحاج) غلام محمد (محمد بھائی) ۳۰۶
(سید) غلام محمد انجینیر حیدرآبادی ۲۸
(پروفیسر) غلام محمد نیازی ۱۵۱
غلام ہمدانی مصحفی ۹۱

ف

(شاہ) فاروق ۶۶
(جناب) فخرالدین علی احمد (صدر جمہوریہ ہند) ۱۷۹، ۲۱۰
(ڈاکٹر) فرحان نظامی ۳۷۵، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۰
فرشی (شاعر) ۱۵۳
فرعون مصر ۷۴
(ڈاکٹر) فصیح احمد صدیقی ۱۴۸
فصیح لکھنوی ۲۴۹
(مولوی) فضل ربی ندوی ۲۶۶
(ملک) فہد بن عبدالعزیز ۲۷۵، ۲۸۳، ۲۹۶، ۲۹۷
فیروز گاندھی ۲۰۱
(ملک) فیصل شہید ۱۸۶، ۲۱۵، ۲۷۵، ۲۹۴، ۲۹۵

ق ک

(استاد) قاسم امین ۸۲
(خواجہ) قطب الدین احمد ۴۷
کاشی رام جی ۳۲۷
(شیخ) کامل الشریف ۲۸۴
(علامہ) کرد علی ۷۳
کرشنا مینن ۱۰۳
(مولانا مفتی) کفایت اللہ دہلوی ۲۲
(مولانا) کلب عابد ۱۳۸
کلدیپ نیر ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۸
کمال اتاترک ۶۸
(ڈاکٹر) کمال فاہم ۳۱۷
کملا پتی ترپاٹھی ۲۲۸
کے. ڈی. شرما ۳۲۱

گ ل

گاندھی جی ۱۲۹، ۲۱۹، ۳۲۱

www.abulhasanalinadwi.org

(مسز) گاندھی دیکھئے اندرا گاندھی

لوئیس ایم سیبون ۲۰۷

(م)

(سیدنا ونبینا حضرت) محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ۱۴، ۴۱، ۴۷، ۵۶، ۶۶، ۶۹، ۷۶، ۸۱، ۱۱۴، ۱۲۷، ۱۳۵، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۲۷۷، ۲۹۲، ۳۰۸، ۳۳۷، ۳۴۲، ۳۵۴، ۳۶۲

(سیدنا حضرت) موسیٰ علیہ السلام ۱۶۱، ۲۷۱

(سیدنا حضرت) معاویہؓ ۲۶۲

(ڈاکٹر) مادھوری آر شاہ ۳۳۷

مالوی جی ۳۲۱

(ڈاکٹر) مامنی (MAMANY) ۲۴۶

ماہر القادری ۵۹

(حضرت) مجدد الف ثانی ۱۸۵

مجدی فوزی خطیب عراقی ۲۴۹

محسنہ قدوائی ۲۲۸

(مولوی) محمد اسحاق جلیس ندوی دیکھئے اسحاق

(ڈاکٹر) محمد اشتیاق حسین قریشی ۲۲۵، ۳۲۰، ۳۴۱

(ڈاکٹر) محمد آصف قدوائی ۲۰، ۳۵، ۳۸، ۶۲، ۶۳، ۳۱۲

محمد اعظم خان ۳۱۷

(مولانا) محمد اویس ندوی نگرامی ۲۲۳

(شیخ) محمد بشیر الابراہیمی ۳۵۲

محمد بن سعید حماد بوصیری ۳۵

(سلطان) محمد بن القاسمی ۱۶۹

محمد پاشا شرالی ۲۹

(مولانا) محمد تقی عثمانی ۲۶۷

(مولانا سید) محمد ثانی حسنی ۴۸، ۱۹۰، ۳۴۵، ۳۴۶

(سید) محمد جمیل ۲۵۹

(استاد) محمد الحافظ ۱۸۴

(مولانا) محمد الحسنی (محمد میاں) ۱۹، ۳۵، ۳۷، ۴۴، ۴۵، ۴۷، ۶۵، ۱۱۷، ۱۲۷، ۱۲۵، ۱۷۶، ۱۸۷، ۱۹۵، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۶۹، ۲۷۴-۲۷۰، ۲۸۴

(ڈاکٹر) محمد حسین الذہبی ۱۹۰، ۱۹۱

(مولانا) محمد حسین ایم اے ۵۳

(مولوی سید) محمد حمزہ حسنی ندوی ۵۳

(شیخ) محمد حنیفہ محمد ۳۶۴

(سلطان) محمد الخامس ۲۳۷

(مرزا) محمد خلیل کمرئی ۱۵۶

محمد خورشید ۲۴۰، ۲۴۹

(سردار) محمد داؤد خان ۱۵۱

(مولانا سید) محمد رابع ندوی ۳۵، ۵۲، ۱۵۹، ۱۴-۲۱۲، ۲۳۳، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۹۴، ۳۳۳، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۹، ۳۶۹، ۳۷۶، ۳۸۳

www.abulhasanalinadwi.org

محمد رضی صدیقی ۲۵۰
(حضرت مولانا) محمد زکریا سہارنپوری
۴۶، ۵۸-۵۵، ۷۱، ۸۴، ۲۲۲، ۲۳۹
۲۴۶، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۹۴، ۳۴۵،
۳۴۸، ۳۵۹
(شیخ) محمد سرور الصبان ۷۴، ۱۴۴
(حکیم) محمد سعید ۲۵۹
(مولانا) محمد سلیم مکی ۲۵۱
(مولوی) محمد سلیم ۶۲
(مولانا) محمد سورتی ۲۲
(ماسٹر) محمد سمیع صدیقی ۲۵۰
(ڈاکٹر) محمد شکری ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۲
(شیخ) محمد صالح القزاز دیکھئے صالح
(مولوی سید) محمد طاہر منصور پوری ۳۵۹
(مولانا قاری) محمد طیب ۱۳۸، ۲۵۶، ۳۰۵
۳۱۲-۱۴
(ڈاکٹر) محمد عبد الجلیل فریدی ۵۸، ۱۰۴
۱۰۵، ۱۰۶
محمد عبد اللہ القحطانی ۲۸۵
(شیخ) محمد عبد اللہ ۳۳۷، ۳۴۰، ۳۴۱
۳۴۴
(ڈاکٹر) محمد عبد المعید خاں ۲۲، ۲۳، ۲۹
(شیخ) محمد علی الحرکان ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۷
۳۳۳، ۳۵۸
(حضرت مولانا سید) محمد علی مونگیری ۱۹۱

(مولانا حافظ) محمد عمران خاں ندوی ۵۲
۵۴، ۵۸، ۷۵، ۱۸۳، ۱۹۰
(مولانا) محمد عمر پالن پوری ۲۴۷
(شیخ) محمد الغزالی ۲۳۳
(میر واعظ مولوی) محمد فاروق کشمیری ۳۴۱
(استاد) محمد الفاسی ۲۳۴، ۲۳۷
(حضرت مولانا) محمد قاسم نانوتوی ۳۱۰
۳۱۴
(حضرت سید) محمد گیسو دراز ۹۵
(شیخ) محمد محمود الصواف ۴۴، ۱۷۶
(مولوی) محمد مسلم ۱۰۵
(مولانا) محمد منظور نعمانی ۴۶، ۶۱، ۶۳
۱۱۶، ۱۳۷، ۱۷۵، ۲۵۵، ۳۰۱، ۳۱۲
(ڈاکٹر) محمد موسی توانا ۱۵۱
(ڈاکٹر) محمد ناصر ۲۹۴
(مولانا) محمد ناظم ندوی ۲۵۸
(جنرل) محمد نجیب ۶۶
(پروفیسر) محمد نصیب خاں ۵۳
(الحاج) محمد نظیم ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۱
(شیخ) محمد النمنکانی بخاری ۳۷
(الحاج) محمد نوروزی ۳۰۶
(مولانا سید) محمد واضح رشید ندوی ۳۵
۱۶۹، ۱۹۰، ۳۳۳
(سید) محمد یامین حسنی ۲۵۲
(حضرت شاہ) محمد یعقوب مجددی (بھوپالی)

www.abulhasanalinadwi.org

(مولانا) محمد یوسف کاندھلوی ۳۴۵
محمد یوسف تورولی ۳۰۶
(مولانا) محمد یوسف (امیر جماعت اسلامی)
۱۳۷، ۲۲۷، ۲۵۶، ۳۲۰
محمد یوسف خاں ۲۶۹
محمد یونس خاں ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۲۳
(الحاج) محمد یونس سلیم ۵۳
(ڈاکٹر سید) محمود ۹۲، ۹۸، ۱۰۶-۸
(مولانا مفتی) محمود ۳۱۱
محمود بٹ ۱۸۱
(شیخ الہند حضرت مولانا) محمود حسن دیوبندی
۳۰۱، ۳۱۰
(ڈاکٹر) محمود رشدان اردنی ۲۴۰
(حکیم سید) محمود علی فتحپوری ۶۱
(سلطان) محمود غزنوی ۱۵۲، ۱۵۳، ۲۹۷
(سید) محی الدین ۳۰، ۳۷۶
مختار ولد دادا ۲۱۳
(سلطان) مراد ۲۹۰
مرارجی ڈیسائی ۲۰۶
(مولانا) مرغوب الرحمٰن بجنوری ۳۱۳
(محترمہ) مریم جمیلہ ۲۶۹
(مولوی) مزمل حسین صدیقی ندوی ۲۴۹
مسرور احمد لکھنوی ۵۸، ۲۵۲
(سید) مسعود علی آزاد فتحپوری ۶۱، ۶۲
(جسٹس) مشتاق ۲۶۷
(سید) مظہر حسین ۲۴۹
(ڈاکٹر) مظہر علی خاں ۵۸
(خلیفہ) معتصم باللہ عباسی ۲۶۲
(مولانا شاہ) معین الدین احمد ندوی ۱۹
۵۱، ۵۲
(مولانا قاضی) معین اللہ ندوی ۵۶، ۵۸
۲۰۹، ۲۱۳، ۲۴۹، ۲۵۵، ۲۵۸، ۳۶۹
(نواب) معظم جاہ بہادر ۵۲، ۵۳
(حضرت) مقداد ابن الاسود ۱۵۷
مناظر احسن ۳۷۷
(مولانا سید) منت اللہ رحمانی ۱۳۷، ۱۳۸
۱۹۱، ۱۹۵، ۳۱۲، ۳۲۰
(ڈاکٹر) منیر لاہوری ۲۶۷
(پنڈت) موتی لال نہرو ۲۲۱، ۳۲۱
موسیٰ سلامہ ۸۲
(استاد) مؤمن خاں ۵۵
(ڈاکٹر) مہدی بنعبود ۲۳۴
(میر تقی) میر ۱۱۲

(ن)

(صدر) ناصر دیکھئے جمال عبدالناصر
ناظر الدین علی حیدرآبادی ۲۴۰، ۲۴۱
(مولوی) نثار الحق ندوی ۱۸، ۳۴۹
(ڈاکٹر) نجم الدین ۱۳۸
(مولوی) نذر الحفیظ ندوی ۲۷، ۲۹، ۸۷، ۱۵۳
(پنڈت) نرائن دت تیواری ۲۲۸

www.abulhasanalinadwi.org

(عبادالرحمٰن) نشاط ۲۴۹، ۲۵۰
نقی نواب ۲۶۸
(نواب سید) نورالحسن خاں ۲۵۸
(پنڈت جواہرلال) نہرو دیکھئے جواہرلال

(و)

(شیخ الاسلام حضرت شاہ) ولی اللہ دہلوی ۱۸، ۱۴۳، ۱۸۵، ۲۲۷، ۳۱۰، ۳۵۷
وحیدالدین ملک ۳۳۵، ۳۴۱
(ڈاکٹر) وحیدالزماں حیدرآبادی ۴۶
(قاری) ودودالحی ندوی ۱۸۹، ۱۹۰

(ہ)

(خلیفہ) ہارون رشید ۱۵۴، ۱۶۳، ۲۶۲
(سید) ہدایت حسین ۲۴۹
(ڈاکٹر) ہنٹر ۱۳۶
ہیم وتی نندن بہوگنا ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۹۱، ۲۱۰

(ی)

(سیدنا حضرت) یونس علیہ السلام ۴۶
(جنرل) یحییٰ خاں ۱۲۹
(حاجی) یعقوب ۲۵۲
(مسٹر) یعقوب مرزا ۲۴۰
(مولوی) یعقوب منشی ۵۹
(شیخ) یوسف الحجی ۳۰۶
(الحاج) یوسف سیٹھی ۲۹۶
(ڈاکٹر شیخ) یوسف القرضاوی ۳۰۶، ۳۵۰

کتابیات

قرآن مجید

(الف)

الاجتہاد ونشأۃ المذاہب الفقہیہ ۳۵۷
احادیث صریحۃ فی امریکا ۲۵۴
احادیث صریحۃ مع اخواننا العرب المسلمین ۲۵۴
احیاء العلوم ۱۸
الادب الاسلامی فکرتہ ومنہاجہ ۳۳۱
ارکان اربعہ ۱۶، ۱۷، ۲۰، ۲۵
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (رسالہ) ۱۱۷
اسلام اور مغرب (رسالہ) ۳۵۸، ۳۷۴، ۳۷۵
الاسلام الممتحن ۲۷۲
اسلامیات اور مغربی مستشرقین اور مسلمان مصنفین ۳۵۰
اسلامی مزاج وماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار ۳۳۴
الاسلام والحضارۃ الانسانیہ (رسالہ) ۳۸۶
الاسلام والغرب (رسالہ) ۳۷۶
اسمعی یا ایران (رسالہ) ۲۵۴
اسمعی یازہرۃ الصحراء (رسالہ) ۲۵۴
اسمعی یا سوریا (رسالہ) ۲۵۴

www.abulhasanalinadwi.org

اسمی یا مصر (رسالہ) ۲۵۴
اصلاح (رسالہ) ۳۱
الف لیلہ ولیلہ ۲۳۰
الامام الدہلوی ۳۵۹
الامام السرہندی ۳۵۹
ISLAMIC STUDIES ۳۵۰
INDIA DURING MUSLIM ROEL ۳۰

(ب)

باب رحمت ۵۰
باب کرم ۱۹۸
بارہ دن ریاست میسور میں ۹۱
بچوں کی قصص الانبیاء ۱۹۷
برہان (رسالہ) ۱۹
البعث الاسلامی (مجلہ) ۴۴، ۵۶، ۶۵، ۷۲، ۱۷۲، ۱۹۵، ۲۵۵، ۳۶۹
بین الحیایۃ والہدایۃ (رسالہ) ۲۷۵
بین الصورۃ والحقیقۃ (رسالہ) ۷۹

(پ)

پاکستان امید اور اندیشوں کے سایہ میں (رسالہ) ۲۷۱
پرانے چراغ ۶۰، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۴۸، ۹۹-۱۹۷، ۲۲۳، ۲۵۱، ۲۷۲، ۲۷۳
پراودا (اخبار) ۲۰۶
پیام انسانیت ۱۰۱، ۱۱۶
پیام مشرق ۳۷۹

PATH WAY TO MEDINA ۳۸۰

(ت) (ط)

تاریخ الادب العربی ۶۹
تاریخ دعوت وعزیمت ۱۹۹، ۳۳۰، ۳۵۹
تاریخ ندوۃ العلماء ۱۷۱، ۱۹۱
تحفۂ انسانیت ۱۲۴
تحفۂ دکن ۳۷۴
تحفۂ کشمیر ۳۴۱، ۳۴۴
تحفۂ مشرق ۱۲، ۱۳۶
تحفۃ الہند ۲۴
تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک ۳۸۸
تعلیم الاسلام ۳۱
تعمیر حیات (اخبار) ۱۲۴، ۲۵۵، ۲۷۰، ۳۱۱
تہذیب الاخلاق ۳۱
ٹائمز آف انڈیا (اخبار) ۱۳۹

(ج)

جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے (رسالہ) ۱۲۰
الجزیرہ (جریدہ) ۲۹۷
جمع الفوائد ومجمع الزوائد ۱۸
الجمہوریہ (جریدہ) ۶۶، ۶۷
جنۃ المشرق (مطلع النور المشرق) ۲۱، ۲۵

(ح) (خ)

حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان ۲۷۶

www.abulhasanalinadwi.org

الحجازیات ۳۷
حجۃ اللہ البالغہ ۱۸، ۲۳۷
حدیث پاکستان ۲۶۰
حدیث مع الغرب ۲۵۴
الحکومۃ الاسلامیہ ۱۵۶
الحیاۃ (جریدہ) ۱۶۲
حیات خلیل ۳۴۵
حیات عبدالحی ۳۱، ۴۲، ۸۷، ۱۷۱
۳۴۷
خلط مصر (کتاب المواعظ والاعتبار فی
ذکر الخطط والآثار) ۲۷
خلیج بین الاسلام والمسلمین ۱۶۹

(د) (ذ)

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک ۱۴۶
۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۶۲، ۳۶۵
دستور حیات ۲۱، ۳۵۳
دعوت (اخبار) ۴۶، ۱۰۵
الدعوۃ (جریدہ) ۲۸۴، ۲۹۳
دور الحدیث فی تکوین المناخ الاسلامی وصیانتہ
۳۴۴، ۳۵۵
دو مہینے امریکہ میں ۲۴۱، ۲۴۳
دو ہفتہ (مغرب اقصیٰ) مراکش میں ۲۳۴
۲۳۷
دین وادب ۳۳۱
دیوان حماسہ ۳۸۳

ذکر خیر ۴۹
THE FOUR PILLARS OF ISLAM ۲۰
THE JUDGEMENT STORY OF THE
EMERGENCY IN INDIA ۲۰۳
۲۰۴، ۲۰۸

(ر)

الرائد (جریدہ) ۷۲، ۱۷۳
ربانیۃ لا رہبانیۃ ۳۸۸
رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام ۳۸۸
ردۃ ولا ابا بکر لہا ۳۶۱، ۳۶۲
رضوان (رسالہ) ۴۹، ۳۴۵، ۳۴۶
روداد چمن ۴۲، ۸۵-۸۹، ۹۱، ۹۳، ۹۵

(ز)

زاد سفر ۱۹۷
زاد المعاد ۱۸، ۳۵۳
زندگی (رسالہ) ۱۹
زندہ رہنا ہے تو میر کارواں بن کر رہو ۳۱۱

(س) (ش)

سفر السعادہ ۳۵۳
سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ۳۴۵
سیرۃ ابن کثیر ۱۱۴
سیرت سید احمد شہید ۸۸، ۲۶۰، ۳۴۷
السیرۃ النبویۃ ۲۸۸
شعر العجم ۱۵۳

www.abulhasanalinadwi.org

(ص)
صحاح ۱۳
صدائے بازگشت ۶۲
صدریار جنگ ۳۳۰
الصراع بین الفکرۃ الاسلامیہ والفکرۃ الغربیہ
۳۲، ۳۵۶
صورت وحقیقت (رسالہ) ۷۹
(ط)
الطریق الی المدینۃ ۳۵، ۳۷، ۳۸
طبیب العائلہ ۳۱
(ع)
عالم عربی کا المیہ ۶۷، ۸۲، ۸۳
عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک
کیوں؟ ۶۹
عکاظ (جریدہ) ۲۸۱
العقیدۃ والعبادۃ والسلوک ۲۱، ۳۵۳
علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں ۳۳۶
۳۳۹
(ف) (ق)
الفتح للعرب المسلمین (رسالہ) ۸۲
الفرقان (رسالہ) ۶۳، ۳۱۱
قوت القلوب ۳۶۲
(ک) (گ) (ل)
کارثۃ العالم العربی واسبابہا الحقیقیہ ۹۲
کاروانِ زندگی ۹، ۱۲، ۱۵، ۳۲۸
کاروان مدینہ ۳۵، ۳۸
الکافی ۱۵۶
کلید باب رحمت ۵۰
کلیات اقبال ۹۴
کنز العمال ۳۶۲
کیف دخل العرب التاریخ (رسالہ) ۱۶۹، ۱۷۰
کیف ینظر المسلمون الی الحجاز وجزیرۃ العرب
۲۷۵، ۲۷۶
گل رعنا ۳۱
لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ ۱۳۲
(م)
ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ۳۲
۲۳۴، ۳۶۲
مالا بدمنہ ۳۵۳
مجلۃ الازہر ۶۹، ۷۰
مجلۃ العربی ۸۲
مختارات من ادب العرب ۳۲۹
مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش
۳۲، ۳۵، ۱۳۹، ۳۰۰، ۳۵۶
المسلمون (مجلہ) ۱۷
مشکوٰۃ شریف ۱۳۵
المصور (مجلہ) ۸۲
معارف (رسالہ) ۱۹
مقام انسانیت ۱۰۱، ۱۱۶
من نہر کابل الی نہر الیرموک ۱۴۶، ۱۴۷

www.abulhasanalinadwi.org

۲۸۰ MASS COMMUNICATION

(ن) (و)

نحن الآن فی المغرب (رسالہ) ۲۳۸

نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ ۳۸،۴۲

ندائے ملت (اخبار) ۶۳،۷۲،۷۷،
۸۵،۸۷،۹۱،۲۷۰

الندوہ (جریدہ) ۷۷

نزہۃ الخواطر ۲۱،۲۳،۲۴،۲۹،۳۱،
۲۳۵

نظرۃ مؤمن واع الی المدنیات ۱۷۰

نغمات الایمان بین صنعاء وعمان ۱۳

نوبھارت ٹائمز (اخبار) ۳۱۷

نور الایمان ۳۱

نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں ۲۴۶

وحی الرسالہ ۶۹

۱۳۶ OUR INDIAN MUSALMANS

WESTERN CIVILIZATION ISLAM
& MUSLIMS ۳۵

(ہ) (ی)

ہمارے حضورؐ ۱۹۷

الہند فی العہد الاسلامی ۲۷،
۳۰، ۳۱

ہندوستان اسلامی عہد میں ۲۹، ۳۰

یاد ایام (تاریخ گجرات) ۳۱

مقامات

(الف)

ابوظبی ۱۶۹،۱۷۰،۱۹۱،۳۸۱،۳۸۵

اتھینز ۱۲۳

احمد نگر ۹۶

اردن ۱۲،۱۴۵،۱۴۷،۱۶۵،۱۶۶،
۲۸۳،۲۸۴

اربد ۱۶۶

اڑیسہ ۸۵،۹۰،۹۱،۱۳۷،۱۹۱،
۱۹۵،۳۲۰

اسپین ۲۳۲

اسرائیل ۶۴،۶۶،۷۳،۱۶۱،۱۶۲،۱۷۲

اسلام آباد ۲۵۹،۲۶۴،۳۷۷

اسلام آباد ہوٹل ۲۵۹

اصفہان ۱۵۴

اعظم گڑھ ۲۲۷،۳۴۸

الأعظمیہ (مزار) ۱۶۳

افغانستان ۳۴،۱۴۵-۱۵۴،۱۵۹،
۳۵۸،۳۶۴،۳۶۷

افریقہ ۶۰،۱۸۶،۲۱۴،۲۳۲

آکسفورڈ ۳۷۷

www.abulhasanalinadwi.org

اکوڑہ خٹک ۲۶۰، ۲۶۷
الٰہ آباد ۱۱۷، ۲۰۳
امارات عربیہ ۱۷۰، ۳۸۱، ۳۸۳، ۳۸۴
امرتسر ۱۷۲
امجدیہ ہال (کلکتہ) ۱۲۲
امریکہ ۲۰، ۱۱۲، ۱۴۴، ۱۵۷، ۲۳۲، ۲۳۸
۲۳۹-۲۴۸، ۲۵۲-۵۴، ۲۷۹، ۲۸۰
۲۸۸، ۲۸۹
ام القیس ۱۲۶
امیٹھی ۲۲۷، ۳۱۵
امین آباد ۱۸۳، ۲۲۶
امین آباد پارک ۱۱۷، ۲۲۱
امین نگر ۳۴۶
آن آربر ۲۴۲
انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۸۵
۲۹۶
اندلس ۳۷۴
اندور ۱۲۳، ۱۲۴
انڈونیشیا ۲۳، ۱۴۵، ۲۸۸، ۲۹۴
آندھرا پردیش ۳۱۵
انڈیانا ۲۳۹
انڈیانا پولس ۲۴۰
انگلستان ۵۶، ۵۸، ۵۹، ۳۷۷، ۳۸۱
اوٹا ۲۴۲
اودھ ۴۷، ۶۲
اورنگ آباد ۱۹۶، ۳۷۴
اوری ۲۰۶
ایتھرو ایرپورٹ ۳۷۷
ایڈنبرا ۵۹
ایران ۴۷، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۸، ۱۵۳
۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۹، ۱۸۶، ۲۵۴
ایشیا ۲۹۰، ۳۰۹
ایمبسڈر (ہوٹل) ۱۶۳
ADAM PEAK (کوہ آدم) ۳۶۰، ۳۶۳

(ب)

بارہ بنکی ۶۱، ۹۳
باغ عامہ (حیدرآباد) ۳۷۰
بچوں کا گھر (دہلی) ۳۱۹
بالاکوٹ ۲۴۰، ۲۷۰
بالٹی مور ۲۴۱، ۲۴۷
بائی کلہ ۱۴
بترا ۱۶۸
بحر ہند ۳۶۰
بحرین ۱۸۵، ۲۸۷
برطانیہ ۶۰، ۶۶، ۲۳۹، ۲۷۴، ۲۸۱
بریج ۳۵
برمنگھم ۵۸
بستان نوروبی (باب اقتار) ۵۶، ۵۷
بصرہ ۱۶۵
بغداد ۴۳، ۱۵۲، ۱۶۲-۱۶۴، ۲۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

بلگام ۹۵، ۱۰۲
بلیک برن ۵۸
بلیومنگٹن ۳۳۹
بمبئی ۱۴، ۵۶، ۱۲۲، ۱۳۹-۱۳۷، ۱۶۸
۲۰۶، ۲۴۰، ۲۵۱، ۲۷۱، ۲۷۲، ۳۰۵
۳۱۸، ۳۳۷، ۳۵۹، ۳۶۹
بنارس ۳۱۸
بنجارہ ہل ۳۶۹
بنطوطہ ۳۶۳
بنگال ۱۳۵، ۲۰۵
بنگلہ دیش ۱۲، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۸۶
۳۶۲
بوڑیہ ۱۲۳
بوسٹن ۲۴۱
بہار ۸۵، ۹۰، ۱۱۷، ۱۲۱، ۱۳۷، ۱۹۱
۱۹۵، ۳۱۷، ۳۲۰
بھٹکل ۲۹، ۹۱
بھوپال ۴۸، ۵۲، ۵۴، ۱۲۳، ۱۸۳
۲۵۸
بھیارہ ۶۲
بھیوانی ۲۰۸
بھیونڈی ۳۱۸
بیت اللہ شریف ۲۹۰
بیت المقدس ۶۴، ۸۰
بیجاپور ۹۵، ۹۶
بیدر ۹۶
بیروت ۳۱، ۳۲، ۳۷، ۴۲، ۴۲، ۸۲، ۱۳۸
۱۵۹، ۱۶۲، ۲۵۰، ۳۵۸، ۳۶۴، ۳۶۵
۳۸۷
بیرووالا ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۳
بے نظیر بلڈنگ ۱۴

(پ)

پارک ٹاؤن (بلڈنگ) ۲۵۰
پاکستان ۷۱، ۱۰۲، ۱۱۱-۱۲۸، ۱۵۱،
۲۳۴، ۲۳۹، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۶،
۲۵۸، ۲۶۱-۶۳، ۲۶۶، ۲۷۱-۳۶۹
۲۸۷، ۲۹۰، ۲۹۶، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۲۲
۳۴۳، ۳۵۰، ۳۷۷
پانی پت ۹۵
پٹنہ ۱۲۰
پرتاب گڑھ ۱۰۴، ۳۱۲
پشاور ۲۷۰
پنجاب ۱۱۷، ۱۲۳
پونا ۱۹۶، ۳۲۷
پیرس ۳۵۶
پے کاڈلی ہوٹل (لندن) ۶۰
پیلی مزرعہ ۱۲۳

(ت) (ٹ)

تال کوٹ ۹۵
تبلیغی مرکز لکھنؤ ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۲۲۵

www.abulhasanalinadwi.org

تخت جمشید ۱۵۴
تخت طاؤس ۱۵۴
ترکمان گیٹ ۲۰۶، ۲۲۴
ترکی ۲۳، ۳۴، ۶۸، ۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۰
ترکیسر ۴۳
تکیہ کلاں (رائے بریلی) ۴، ۱۸۴، ۲۱۲، ۲۲۱
تلمسان ۳۵۴-۳۵۶
تونس ۲۳۳
تھائی لینڈ ۱۸۶
ٹورنٹو ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۹
ٹونک ۲۵۸
ٹیگور ہال (اندور) ۱۲۴

ج چ

جاپان ۱۴۵
جامع الشہداء (بغداد) ۱۶۴
جامع مسجد دہلی ۲۰۸
جامع مسجد ملک عنبر ۳۷۴
جامع مسجد نیو ٹاؤن (کراچی) ۲۵۸
جدہ ۵۸، ۲۳۲، ۲۵۵، ۲۸۱، ۲۸۴
۲۸۸، ۳۰۶
جوسی سٹی ۲۴۱
الجزائر ۱۸۵، ۲۳۳، ۳۲۸، ۳۵۲
۳۵۴، ۳۵۶
جزیرۃ العرب ۳۰، ۲۵۳، ۲۷۵، ۲۸۲
۲۸۸، ۲۹۱، ۳۸۳
جگادھری ۱۲۳
جمشید پور ۸۹، ۱۱۲، ۳۱۵
جنانگر ۱۲۳
جموں ۲۴، ۲۴۹، ۳۳۵، ۳۴۰
جونپور ۱۱۶
جنیوا ۵۷، ۵۸، ۲۵۳
چارباغ اسٹیشن (لکھنؤ) ۲۲۶
چندی گڑھ ۱۲۳
چین ۱۵۱

ح

حجاز مقدس ۳۸، ۴۶، ۵۵، ۷۴، ۷۶
۱۳۷، ۱۴۵، ۱۶۸، ۱۹۷، ۲۳۳، ۲۵۳
۲۵۵، ۲۷۵، ۲۷۸، ۲۸۴، ۳۳۳
۳۴۵، ۳۴۸
حجر ۱۶۸
حرم شریف (مکی) ۲۷۵، ۲۸۵، ۲۸۶
حرمین شریفین ۴۶، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۶
۲۹۰، ۳۰۴، ۳۸۹
الحضرۃ الکیلانیہ (مزار) ۱۶۳
حسین ساگر ۲۸
حلب ۱۶۱
حماۃ ۱۶۱
حمص ۱۶۱
حیدرآباد ۲۴، ۲۸، ۲۹، ۳۱۱، ۵۲-۵۴
۳۵۸، ۳۶۸-۷۰، ۳۷۲، ۳۷۴

www.abulhasanalinadwi.org

خ

خاتون منزل ۱۷۵
خضر آباد ۱۲۳
خلیج عربی ۱۴۴، ۱۶۸، ۱۷۰، ۲۵۴
الخلیل ۶۴

د ڈ

الدار البیضاء (CASABLANCA) ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۳۸
دبئی ۱۶۹، ۳۸۵
دجلہ ۱۶۲
دریائے اردن ۶۴
دریائے کابل ۱۴۷
دریائے یرموک ۱۴۷، ۱۶۶
درۂ خیبر ۲۳
دمشق ۳۱، ۳۷، ۸۲، ۱۱۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۳۲۹
دوحہ ۲۸۵، ۲۸۷
دھار ۱۲۳
دہلی ۴۸، ۵۶، ۷۲، ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۲۶، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۷۳، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۶، ۲۰۴، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۱۱-۱۵، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۳۴، ۲۴۹، ۲۵۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۱۹، ۳۲۷، ۳۵۴، ۳۵۹، ۳۶۸، ۳۸۱
دیپال ۱۲۳
دیوبند ۳۰۰، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۳
ڈٹرائٹ ۲۴۱، ۲۴۳
ڈھڈیاں ۶۱، ۲۶۹
ڈیوزبری ۵۹

ر ز

راجستھان ۱۱۷
راحت منزل ۱۹۹
راشٹرپتی بھون (دہلی) ۲۱۱، ۲۱۳
رانچی ۱۱۲
راوڑکیلا ۸۹، ۱۱۲، ۳۱۵
رائے بریلی ۱۵، ۱۸، ۲۴، ۴۸، ۴۹، ۵۱، ۱۲۴، ۱۸۴، ۱۹۶، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۵-۲۷، ۲۷۲، ۲۹۴، ۳۱۵، ۳۲۶
رائے پور ۶۱، ۸۴
رباط ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۸۸، ۳۵۶
رواق اطہر ۱۸۰
روس دیکھئے سویت روس
روما ۱۴۲
رومۃ الکبری ۳۷۱
روہتک ۲۰۸
ریاض ۲۰، ۱۴۰، ۱۴۱، ۲۹۴، ۲۹۶، ۲۹۷، ۳۰۴، ۳۳۳، ۳۵۹
الزاہر ۴۶
زرّین نعل ۱۵۶

www.abulhasanalinadwi.org

زکریا اسٹریٹ (کلکتہ) ۱۳۲

(س)

سالٹ لیک سٹی ۲۴۱، ۲۴۲

سان جوزے ۲۴۱

سان فرانسسکو ۲۴۱

سرگودھا ۲۶۹

سرنگاپٹن ۹۳

سرہند ۱۲۳

سری لنکا ۱۴۵، ۱۵۸، ۳۵۸-۶۰، ۳۶۲

سری نگر ۳۴۱

سعودی عرب ۲۹، ۳۴، ۷۷، ۱۴۵، ۱۵۹، ۲۱۱، ۲۵۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۹۳، ۲۹۶، ۳۰۴، ۳۱۸

سفید بارہ دری (لکھنؤ) ۶۱، ۱۲۴، ۳۲۳

سلط ۱۶۶

سلطانپور ۲۰۸، ۲۲۳

سوویت روس ۱۵۱، ۱۸۶، ۳۶۷

سہارنپور ۲۲۲

سیتاپور ۱۵، ۱۶، ۴۲

سیر ۱۵۹

سیلون ۳۵۸، ۳۶۳

سینا ۶۴، ۱۶۱

سیوان ۱۲۰

(ش) (ص)

شارع ابو نواس (بغداد) ۱۶۳، ۱۹۰

شارع منصور (مکہ) ۲۸۶

شارقہ ۱۶۹، ۳۸۱، ۳۸۲

شام ۶۸، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۶۷، ۲۵۴، ۲۸۴

شاہدرہ ۲۶۸

شاہی مسجد (لاہور) ۲۶۸

شبرا دیکھئے خندق

شرالی ۲۹

شکاگو ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۹-۵۱، ۳۶۶

شموگہ ۹۵

شنقیط ۲۱۴

شیراز ۱۵۴

شیرانوالہ دروازہ (لاہور) ۲۶۷

شیفیلڈ ۵۹

صنعاء ۱۳

صوبۂ سرحد ۳۱۱

صیداء ۱۵۹

(ط)

طائف ۴۴، ۱۴۵، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۸

طبریہ ۱۶۷

طرابلس ۱۵۹، ۲۳۲، ۲۳۳

طنجہ ۲۳۲

طوس ۱۵۴

طہران ۱۵۴، ۱۵۶

www.abulhasanalinadwi.org

(ع) (غ)

عالم اسلام - اسلامی ممالک ۹، ۱۰، ۳۳
۶۴، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۷۳ـ۷۶، ۱۷۹، ۱۸۷
۲۳۴، ۲۳۷، ۲۵۶، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۷۷
۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۸، ۲۹۴، ۳۳۴، ۳۵۰
۳۶۱، ۳۶۴، ۳۶۷، ۳۸۷
عراق ۶۸، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۶۳، ۱۷۶،
۲۸۸
عرب امارات دیکھئے امارات عربیہ
عجمان ۳۸۳
عرفات ۱۷، ۴۵، ۳۰۶
عَمّان ۱۳، ۱۶۵، ۱۶۷
عُمان ۳۷۷
عمدہ ساگر ۲۸
علی گڑھ ۹۴، ۱۲۲، ۱۳۹-۴۳، ۱۹۹
۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۳۶، ۳۸۶
عیش باغ (لکھنؤ) ۶۲، ۲۲۳
غازیپور ۱۰۶
غرناطہ ۳۷۴

(ف)

فاس ۲۳۴
فتحپور ۶۱
فرانس ۶۶، ۳۵۳
فرانکفرٹ ۳۵۴
فلاڈلفیا ۲۴۱، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۵۱
فلپائن ۲۵۶
فلسطین ۶۶، ۸۰، ۳۶۴، ۳۶۵
فندق امیہ (شام) ۱۶۲
فندق التیسیر ۵۷
فندق خضرا ۱۴۴، ۱۷۶
فیصل آباد ۲۶۰، ۲۶۸

(ق)

قاہرہ ۱۲، ۴۲، ۲۳۳، ۲۸۴، ۲۹۳
قدس ۶۴
قطر ۳۱، ۲۷۵، ۲۸۷، ۲۸۹
۳۳۱، ۳۸۲
قلعۂ جواد ۱۵۲
قلعۂ جہانگیر (لاہور) ۲۶۸
قم ۱۵۴
قونیہ ۲۰
قیصر باغ (لکھنؤ) ۱۲۴، ۳۲۳

(ک)

کابل ۱۴۶، ۱۵۱، ۱۵۲
کاکوری ۱۹
کاکینا ۸۹
کالپی ۲۰۶
کانپور ۱۹۶
کاوی ۵۹
کچہری روڈ ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۲۲۵
کراچی ۲۵، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۸-۶۰
۲۶۶، ۲۶۹، ۲۷۱، ۳۱۱، ۳۵۱

www.abulhasanalinadwi.org

کرنال ۲۰۸
کرنول ۵۲
کشمیر ۲۴۹، ۳۲۸، ۳۳۵، ۳۳۷، ۳۴۰
۳۴۱-۴۴
کلارک اودھ (ہوٹل) ۱۸۳، ۱۹۱
کلکتہ ۸۹، ۱۳۲
کناڈا ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۹
کنیڈی ایرپورٹ ۲۴۰
کوٹھی نشاط افزا ۱۲۰
کولمبو ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۳
کولمبوایرپورٹ ۳۶۰
کولمبیا ۲۴۲
کویت ۱۹، ۳۲، ۴۱، ۴۷، ۷۶، ۱۶۵
۱۶۸، ۱۹۱، ۲۵۴، ۳۰۶، ۳۸۱، ۳۸۵
۳۸۶
کیرالہ ۳۶۴
کیلی فورنیا ۲۴۱، ۲۴۲
کیمبرج ۲۴۲

(گ)

گجرات ۴۳، ۵۹، ۸۵، ۹۰، ۹۱، ۲۰۴
گڑگاؤں ۲۰۸
گلاسگو ۵۹
گلبرگہ ۹۲، ۹۵، ۹۶، ۱۰۲
گلگت ۲۸۷
گلمرگ ہوٹل (لکھنؤ) ۱۸۳، ۱۹۱
گنبد خضراء ۳۸
گنج مرادآباد ۶۳
گنگا پرشاد میموریل ہال ۱۱۶، ۱۱۷
گوالیار ۵۴
گورکھپور ۱۱۶
گولکنڈہ ۹۶
گولہ گنج ۱۷۵
گولان ۱۶۶

(ل)

لاس اینجلس ۲۴۱، ۲۴۲
لاہور ۶۱، ۶۲، ۲۳۴، ۲۵۳، ۲۶۰
۲۶۷، ۲۶۸
لائن والی مسجد شیرانوالہ ۲۶۷
لبنان ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۹-۶۱، ۳۶۵
لکھنؤ ۱۹، ۳۱، ۴۷، ۴۹-۵۱، ۶۰-۶۲
۸۹، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۴۰، ۱۵۵، ۱۵۷،
۱۹۱، ۱۴۴، ۱۷۵، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵
۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۰۸-۱۲، ۲۲۲
۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۹، ۲۳۴، ۲۴۶
۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۲، ۲۵۹، ۲۷۱، ۲۷۲
۲۹۴، ۳۰۰، ۳۱۲، ۳۲۳، ۳۲۷
۳۳۰، ۳۵۰، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۸۲
لندن ۵۷-۶۰، ۱۵۷، ۱۶۲، ۱۹۹
۲۵۱، ۲۵۲، ۳۷۷
لنکا دیکھئے سری لنکا

www.abulhasanalinadwi.org

لیبیا ۲۳۲، ۳۳۴
لیڈس ۵۹، ۶۰
لیسٹر (LEICESTER) ۳۷۷، ۳۸۱
لیک ڈسٹرکٹ ۶۰

(م)

ماڈل ٹاؤن (لاہور) ۲۶۰، ۲۶۸
مالیرکوٹلہ ۱۲۳
مانچسٹر ۵۹
مدائن صالح ۱۶۸
مدراس ۳۱، ۹۲، ۱۴۳، ۳۶۴
مدن پورہ ۱۳۸
مدھیہ پردیش ۱۱۷، ۱۲۳
مدینہ منورہ ۲۹، ۳۷، ۳۸، ۵۶، ۵۷
۷۵، ۷۶، ۲۳۴، ۲۴۶، ۲۵۰، ۲۵۱
۲۵۵، ۲۷۶، ۲۸۸، ۲۹۴، ۳۰۵، ۳۰۶
۳۳۳، ۳۴۸، ۳۸۹
مرادآباد ۲۴، ۳۰۰، ۳۱۱، ۲۲–۳۱۵
مراکش (مغرب اقصیٰ) ۷۳، ۲۱۱، ۲۳۲
۳۸–۲۳۶، ۲۵۴، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۵۶
مرکارا ۹۵
مرکز تبلیغ نظام الدین ۲۴۹
مریڈیان (ہوٹل جدہ) ۲۸۱
مسجد نبوی ۵۷، ۱۷۶، ۲۹۰
مسجد ٹیلہ والی (لکھنؤ) ۱۸۲
مسجد سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ (ابوظبی)
۳۸۵

مسجد سیدنا علی بن ابی طالبؓ (شارقہ)
۱۶۹
مسجد سیدنا عمر بن الخطابؓ (شارقہ)
۳۸۵
مسجد نور (مدینہ منورہ) ۵۶
مشرق وسطی ۱۴۴، ۱۷۲
مشہد ۱۵۴
مصر ۲۰، ۲۷، ۳۵، ۶۶–۶۴، ۷۰، ۷۲
۷۶–۷۴، ۸۱، ۸۲، ۱۵۱، ۱۶۱، ۱۷۶
۱۸۵، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۵۴، ۳۰۶، ۳۲۹
۳۳۱
مظفرنگر ۲۰۸
مقبرہ علامہ اقبال ۲۶۸
مقبرہ جہانگیر ۲۶۸
مقدیشو (صومالیہ) ۵۵
مکناس ۲۳۴
مکہ معظمہ ۴۶–۴۴، ۵۶، ۵۸، ۷۴
۷۵، ۷۷، ۱۱۴، ۱۵۹، ۱۶۸، ۲۴۷
۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۵، ۲۸۶–۲۸۳
۲۹۵، ۲۹۶، ۳۲۶، ۳۲۷
ملتان ۲۳۴
ملیح آباد ۱۹
ممالک عربیہ۔عرب (عالم عربی) ۹، ۳۵
۳۶، ۳۸، ۴۱، ۶۵، ۶۶، ۶۸، ۷۰
۷۱، ۷۳، ۷۷، ۸۱، ۸۴، ۱۶۱، ۱۶۹،

www.abulhasanalinadwi.org

۱۷۲-۷۴، ۱۷۷-۷۹، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۵۳، ۲۷۲، ۲۸۹، ۲۹۱، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۵۱، ۳۶۴، ۳۶۶، ۳۶۹، ۳۸۱

متی ۱۷، ۲۰۰، ۱۷۵

موتہ ۱۶۷، ۱۶۸

موریطانیا ۲۱۳، ۲۱۴

مونٹریال ۲۴۱

مہاراشٹر ۱۳۸، ۳۲۶، ۳۲۷

مہپت مئو ۱۹

مہندیوں ۱۴۳، ۱۴۵

مہو ۱۲۳

مئو ۱۱۶

میدک ۳۱۵

میرٹھ ۳۰۶، ۳۱۷، ۳۱۸

میرواعظ منزل کشمیر ۳۴۱

میرعالم ساگر ۲۸

میسور ۸۵، ۹۱، ۱۰۱

مین ہاٹن ۲۴۱

MIDLAND ۳۸۱

(ن) (و)

نابلس ۶۴

ناظم آباد (کراچی) ۲۶۶

ناگپور ۱۹۶، ۳۲۰

ناگدیوی اسٹریٹ (بمبئی) ۳۰۶

ندوہ ووڈمیر ۲۴۷

نصرۃ الاسلام ہال ۳۴۲

نصیرآباد ۳۴۶

نظام الدین (دہلی) ۲۲۲، ۲۴۹، ۳۰۶

نظیرآباد ۶۳

نہر سوئز ۶۶، ۶۸، ۷۰

نیپال ۱۸۶

نیوٹاؤن (کراچی) ۲۵۸، ۲۵۹

نیوجرسی ۹

نیویارک ۱۱۲، ۲۴۲-۲۴۰، ۲۴۷، ۹، ۲۵۰، ۲۵۱

نیویارک سٹی ۲۴۱

واشنگٹن ۲۰۷، ۲۴۱

ویلور ۵۳

(ہ)

ہائیڈ پارک (لندن) ۱۵۷

ہریانہ ۱۱۷، ۱۲۳

ہزارہ ۲۵۵

ہندوستان کتاب کے اکثر صفحات میں

(ی)

یرموک ۱۴۷، ۲۶۱

یمن ۳۴، ۳۵

یوپی ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۱۷، ۱۸۰، ۱۸۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۱۰، ۲۴۹، ۳۴۶، ۳۶۹

یورپ ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۴۲، ۱۴۴، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۹، ۳۷۷

www.abulhasanalinadwi.org

یوگنڈا ۱۸۵، ۱۸۶

یونان ۱۴۲، ۳۷۱

متفرقات

تعلیمی ادارے، جامعات و مدارس:

اسلام آباد یونیورسٹی ۳۷۷
اسلامیہ کالج کرنول ۵۳
اسلامیہ کالج لکھنؤ ۵۱
اسلامیہ کالج بنگلور ۹۴
آکسفورڈ یونیورسٹی ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۷۴
اوٹا یونیورسٹی (سالٹ لیک سٹی) ۲۴۲
اورنگ آباد آزاد کالج ۳۷۴
ایڈنبرا یونیورسٹی ۳۶۲
برمنگھم یونیورسٹی ۵۹
بغداد یونیورسٹی ۱۶۳
پٹنہ یونیورسٹی ۱۲۰
پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۶۰
ٹمپل یونیورسٹی ۲۵۰
جامع ازہر۔ قاہرہ ۲۰، ۶۹، ۸۷، ۱۵۱، ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۰۰
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ ۵۵، ۷۵، ۷۶، ۲۳۳، ۲۵۵، ۲۷۶، ۲۹۳، ۳۰۴، ۳۰۶، ۳۳۳
جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض ۳۰۲، ۳۰۴، ۳۳۳، ۳۵۹
جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ ۱۴۵، ۲۹۵
جامعہ باقیات الصالحات۔ ویلور ۵۳
جامعہ تعلیمات اسلامیہ فیصل آباد ۲۶۰
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۵۳
جامعۃ العین۔ امارات ۳۸۴
جامعۃ القرویین فاس ۲۳۴، ۲۳۶
جامعۃ الملک عبد العزیز جدہ ۱۴۵
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۷۳، ۱۸۳
الجامعۃ النظیمیہ سیلون ۳۵۸
جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی ۲۱۳، ۳۲۷، ۳۶۸
دارالعلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد ۵۲، ۵۳
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ۲۵۹
دارالعلوم دیوبند ۶۱، ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۵۶، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۴، ۳۱۰–۳۱۴
دارالعلوم کورنگی کراچی ۲۵۹
دارالعلوم ندوۃ العلماء ۱۹، ۵۰–۵۲، ۶۰، ۸۴، ۸۷، ۸۸، ۹۱، ۱۳۷، ۱۷۲، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۰، ۱۹۶، ۲۰۰، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۴۹، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۳۰، ۳۳۳، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۵۷، ۳۵۹، ۳۶۲، ۳۶۴

www.abulhasanalinadwi.org

دارالعلوم نیوٹاؤن کراچی ۲۵۸
الدعوۃ الاسلامیہ شارقہ ۳۸۱
دمشق یونیورسٹی ۱۱۷
ڈٹمائٹ یونیورسٹی (آن آربر) ۲۴۲
ریاض یونیورسٹی ۴۰
زرعی یونیورسٹی فیصل آباد ۲۶۰
CENTRAL-INSTITUTE OF ENG-LISH AND FOREIGN LANGUAGES.
حیدرآباد ۳۶۸
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد ۲۵۹، ۲۶۴
عثمان یونیورسٹی ۳۷۷
فیروز گاندھی ڈگری کالج رائے بریلی ۱۹۶
کابل یونیورسٹی ۱۵۱، ۱۵۲
کراچی یونیورسٹی ۲۵۹
کشمیر یونیورسٹی ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۴۱
کلیۃ البنات امارات ۳۸۴
کلیۃ الزاہرہ کولمبو ۳۶۳
کلیۃ الشریعہ کابل ۱۵۱
کلیۃ العلوم کویت ۳۸۶
کلیۃ المعلمین ریاض ۴۱
کولمبیا یونیورسٹی نیویارک ۲۴۲
کویت یونیورسٹی ۳۸۶
کیلی فورنیا یونیورسٹی (لاس اینجلس) ۲۴۲
لیڈس یونیورسٹی ۵۹، ۶۰
مدرسہ ثانویہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ۱۸۳
مدرسہ ثانویہ طیبہ ۔ مدینہ منورہ ۷۵، ۷۶
مدرسہ شاہی مرادآباد ۳۱۱
مدرسہ صولتیہ مکۂ مکرمہ ۲۵۱، ۲۹۶
مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی ۲۵۹
مدرسہ فلاح المسلمین امین نگر ۳۴۶
مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد ۳۷۴
مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور ۶۱، ۱۳۷، ۳۴۵
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔ ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۸، ۳۳۶
ویمنس یونیورسٹی ممبئی ۳۳۷
ہارورڈ یونیورسٹی کیمبرج ۲۴۲
ST CROSS COLLEGE ۳۷۵

تحریکات، جماعتیں اور سوسائٹیاں:

الاخوان المسلمون ۲۸۴
آر۔ ایس۔ ایس ۱۲۴
اسلامی جمعیۃ الطلبہ پاکستان ۲۶۰
اسلامک سنٹر جنیوا ۵۷
اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان ۲۵۹، ۲۶۳، ۲۶۶
انجمن جمعیۃ الاصلاح ندوۃ العلماء ۱۹۱
انجمن DALIT ۹۴
ایم، ایس، اے امریکہ وکناڈا ۲۳۵، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۵۱
ایم، ای، ایچ دی نظامس چیریٹیبل ٹرسٹ فنڈ
حیدرآباد ۵۲
بار ایسوسی ایشن اندور ۱۲۴
BOMCEF ۳۲۷
باسیے آندھرا ٹرانسپورٹ کمپنی ۳۰۶، ۳۶۹
بعث پارٹی شام ۱۶۰
تبلیغی جماعت ۴۹، ۵۹، ۶۰، ۸۴، ۳۵۵
بی، بی، سی لندن ۱۶۲

www.abulhasanalinadwi.org

تحریک پیام انسانیت ۹۴، ۱۰۹، ۱۱۳
۲۵-۱۲۳، ۲۶۹، ۲۷۳، ۳۰۰، ۳۱۶، ۳۲۲
۳۲۳، ۳۲۶
تحریک جہاد حضرت سید احمد شہیدؒ ۲۶۰
تحریک خلافت ۲۱۹
جماعت اسلامی ہند ۷۱، ۹۵، ۱۳۷، ۲۰۹
۲۲۷، ۲۵۶، ۲۶۸، ۳۲۰
جماعت اسلامی کشمیر ۳۴۱
جماعت تحفیظ القرآن الکریم سعودیہ عربیہ ۲۹۶
جمعیۃ الاصلاح الاجتماعی کویت ۷۶، ۳۸۶
جمعیۃ العلماء کولمبو ۳۶۳
جمعیۃ العلماء ہند ۱۹۱، ۲۵۶، ۳۰۱
جنتا پارٹی ۲۹-۲۲۷
حلف الفضول (تنظیم) ۱۱۴
دینی تعلیمی کونسل یوپی ۱۹۱
ڈاکٹر شنے آئی انسٹی ٹیوٹ ۲۴۱، ۲۴۸
رابطۃ الادب الاسلامی ندوہ ۳۳۳
رابطۃ الجامعات الاسلامیہ رباط ۲۳۲
رابطۂ عالم اسلامی مکۂ مکرمہ ۲۰، ۴۶-۴۴
۷۴، ۷۶، ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۵۹، ۱۶۸،
۱۷۵، ۱۷۶، ۱۸۴، ۱۸۵، ۲۰۹، ۲۳۳، ۲۴۹
۲۵۳، ۵۹-۲۵۵، ۲۷۶، ۲۸۵-۲۸۳، ۲۹۴
۲۹۶، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۵۸، ۳۶۴، ۳۸۲
۳۸۳
عبدالغنی محمد نور ولی کمپنی سعودیہ ۲۸۴، ۲۸۶، ۳۰۹
کانگریس (پارٹی) ۱۰۱، ۱۰۳، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۱۹، ۲۲۱
۲۲۹، ۳۱۵
اللجنۃ العلیا لفلسطین ۸۳
محمد عمر چاند بھائی اکسپور کمپنی بمبئی ۳۰۶

مسلم پرسنل لا بورڈ ۳۸-۱۳۶، ۳۱۴، ۳۲۰
مسلم لیگ ۱۰۶
مسلم مجلس مشاورت ۸۵، ۸۹، ۹۱، ۹۲، ۹۸
۹۹، ۷-۱۰۳، ۱۳۷، ۱۴۳، ۲۵۶، ۳۱۹،
۳۲۱
مسلم مجلس یوپی ۱۰۶، ۱۴۳، ۳۲۰
مسلم ویلفیر سوسائیٹی لندن ۵۸
ملتقی الفکر الاسلامی ۳۵۳
مؤتمر التعلیم سعودیہ ۲۷۶
مؤتمر الدعوۃ والدعاۃ سعودیہ ۲۷۶
نادی الوحدۃ الریاضی مکۂ معظمہ ۷۴، ۷۵
ندوۃ العلماء ۴۱، ۵۰، ۵۱، ۶۳، ۷۲، ۱۳۷
۱۷۱، ۱۷۲، ۱۸۰-۱۷۴، ۱۹۱، ۱۹۶، ۲۴۹
۲۵۵، ۳۲۸، ۳۶۹، ۳۸۲
ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کراچی ۲۵۹
یونائیٹڈ نیشنز نیویارک ۲۴۲
یونیورسل ٹرانسپورٹ کمپنی (لکھنؤ) ۱۸۱

علمی تحقیقاتی و نشریاتی ادارے اور مطابع:

ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۲۶۴
اسلام نشریات۔ قونیہ ۲۰
اسلامک سنٹر آکسفورڈ یونیورسٹی ۳۵۷، ۳۵۸
اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر ۳۷۷، ۳۸۱، ۳۷۴
اقبال انسٹی ٹیوٹ۔ کشمیر ۳۳۹
دار الشروق۔ جدہ ۲۸۸
دار الفکر۔ بیروت ۳۲
دار القلم۔ بیروت ۳۷
دار القلم۔ دمشق ۳۷

www.abulhasanalinadwi.org

دارالقلم۔ کویت ۱۹، ۳۲
دارالمصنفین اعظم گڑھ ۴۹، ۵۶، ۲۲۷
۲۹۷، ۳۲۸، ۳۴۸ـ۵۰
دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۲۹، ۳۱
فخرالدین علی احمد اکیڈمی۔ لکھنؤ ۳۱
قرآن اکیڈمی۔ لاہور ۲۶۰
لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر مصر ۲۷
مدینہ پریس۔ ننکاگو ۳۶۶
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹، ۲۱
۳۰، ۳۸، ۶۹، ۸۳، ۱۶۹، ۱۹۱، ۲۴۳
۳۳۵، ۳۴۱، ۳۵۰، ۳۸۰
مجلس نشریات اسلامی کراچی ۲۶۰، ۲۶۶
۲۷۱، ۳۱۱
مجلس علمی حیدرآباد ۳۷۲
مجلس وطنی۔ کویت ۳۸۶
مجمع البحوث الاسلامیہ۔ مصر ۱۸۵
المجمع العلمی العراقی ۱۶۳
المجمع العلمی العربی (مجمع اللغۃ العربیۃ)
دمشق ۳۱، ۳۲۹
المجمع العلمی الکردی ۱۶۳
المختار الاسلامی۔ قاہرہ ۴۲
المکتب الاسلامی۔ بیروت ۳۱
مکتبۂ اسلام۔ لکھنؤ ۵۰، ۱۹۸
مکتبۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء ۱۹۵
مکتبۂ عثمانیہ رائے بریلی ۱۲۴
مکتبۂ علمیہ۔ مدینہ منورہ ۳۷
مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
حیدرآباد ۳۷۰
مؤسسۃ أہل البیت۔ اردن ۱۲
نامی پریس۔ لکھنؤ ۴۷، ۵۰
ندوۃ المصنفین۔ دہلی ۴۳

دیگر متفرقات:

المیۂ بیروت ۱۹۸۳ء ۱۶۰، ۳۵۸، ۳۶۴
المیۂ ترکمان گیٹ دہلی اپریل ۱۹۷۶ء ۲۰۷، ۲۰۸
۲۲۴
المیۂ ۵ جون ۱۹۶۷ء۔ المیۂ فلسطین ۶۶، ۷۶
۷۸
المیۂ مرادآباد اگست ۱۹۸۰ء ۲۱۶، ۳۰۰
۳۱۵ـ۱۷، ۳۲۳
المیۂ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) دسمبر ۱۹۷۱ء ۱۲۵ـ۱۳۰
ایمرجنسی ہندوستان جون ۱۹۷۵ء جنوری ۱۹۷۷ء
۲۰۱ـ۱۰، ۲۱۲، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۳ـ۲۸، ۲۳۹
پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء ۱۹۷۵ء
۱۴۱، ۱۷۱، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۹۵، ۱۹۶، ۳۰۲
تقسیم ہند ۱۹۴۷ء ۶۱، ۱۲۳، ۱۲۹، ۳۰۱
صد سالہ جشن دارالعلوم دیوبند ۱۹۸۰ء ۳۰۰
۳۰۲
جشن سیمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۹۴۶ء ۱۷۳
فیصل ایوارڈ ۲۷۵، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۷
ہنگامۂ ۱۸۵۷ء (غدر) ۲۰۹

www.abulhasanalinadwi.org